ردا ڈائجسٹ

APRIL 2016

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام







رِدا ڈائجسٹ

چیف ایڈیٹر

صالحہ محمود

ایڈیٹرز

سعدی محمود جعفری

نمائندہ امریکہ، فراز جعفری

E-Mail. [illegible]

نمائندہ UAE، عمیر علی جعفری

Mail: [illegible]

نمائندہ لندن، شبانہ آصف خان



سلسلے وار ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

اپریل 2016ء
جلد نمبر 20 شمارہ نمبر 4
قیمت 60 روپے

www.facebook.com/rida.digest

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
720 روپے


34535726

پبلشر و ایڈیٹر صائمہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ١٢٩/ڈی بلاک ۔2۔ پی ۔ ای ۔ سی ۔ ایچ ۔ سوسائٹی، کراچی

مستقل سلسلے





لمحہ بہ لمحہ ملکی حالات کی نوعیت تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ روز نئے طریقہ کار دہشت گرد اپنارہے ہیں۔ کوئی جامع پالیسی بھی ایسی نہیں کہ ان شدت پسندوں کو روکا جائے، سانحہ کہیں بھی ہو یہ دکھ کی ایک بات ہے۔ اقبال پارک میں ایک گھناؤنی سازش کے تحت بم دھماکہ کیا گیا۔ اس میں مرنے والے ہمارے ہی بہن بھائی اور بچے تھے۔ اس میں ''را'' ملوث ہے۔ اپنے ہی بہن بھائیوں کو خون میں نہلا دیا گیا اور وہ یوں جہنم رسید ہوا کچھ گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے۔ مشتبہ افراد کے نیٹ ورک کو توڑا جائے اور اس سانحے کو سنجیدگی سے دیکھا جائے ہمارے اداروں اور ہماری حکومت کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے یہ معمولی بات نہیں کہ اس سانحے میں 72 افراد شہید ہوگئے۔ ہر بار ایسے سانحے جنم لیتے ہیں۔ ہر بار میڈیا، حکمران، ادارے سب حرکت میں آتے ہیں۔ جامہ تلاشی اردگرد ماحول کی پوزیشن بھی سنبھالی جاتی ہے لیکن ایک کے بعد پھر وہی خودکش دھماکے اور ہلاکتوں کا سلسلہ سب کچھ وقت کی گرد میں دھواں دھواں بات پھر وہیں سے شروع کہ فلاں جگہ دھماکا ہوا ہم دہشت گردی کی مذمت کرتے ہیں اگر ثبوت مل گئے ہوں تو پھر دیر کس بات کی فوری طور پر ایکشن لینا چاہیے دنیا کے دوسرے ممالک بھی ہیں آپ اپنے ہمسایہ بھارت کی مثال لے لیجیے کوئی ویزے کے بغیر ایک دن رہ کر دکھا دے۔ یہاں تو ابھی تک ہجرت کا سلسلہ جاری ہے۔ بس اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں محفوظ اور ہمارے ملک کو قائم و دائم رکھے، آمین۔ ہمسایہ ملک بھارت ہمارا دشمن ہے اور اس نے کبھی پاکستان کو تسلیم نہیں کیا۔ ''را'' کی موجودگی ایک حقیقت ہے جو دنیا کے سامنے ہے نہیں جی یہاں تو ہمارے وزیراعظم صاحب! مودی سرکار کے لیے تحفے اور تحائف بھیجتے ہیں۔ دعا کریں کہ اللہ ہم سب پر اپنا رحم و کرم اور ہمارے حکمرانوں کو اللہ ہدایت دے، آمین۔

اپریل کا شمارہ بہت خوب صورت شمارہ ہے۔ اس بار پھر شازیہ اور نائیلہ خوب صورت انداز میں اپنی تحریر لے کر آئیں ہیں۔ لازوال محبتوں کے یہ ایسے خزانے ہیں جنہیں تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ سندیسہ ضرور لکھیں۔

نوٹ: ردا میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے بارے میں میرا اصول رہا ہے کہ تحریر خواہ کیسی ہو ہم نے ردا میں اس کے حوالے سے تنقید یا ناقابل اشاعت کبھی نہیں لکھا۔ یہ میرا اور میرے رائٹر کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ لہٰذا یہی وجہ تھی کہ میں نے ردا کا کوئی ای میل ایڈریس نہیں بنایا۔ اس بات کا آپ بھی خیال رکھیں کہ غیر ضروری کسی رائٹر پر تنقید نہ کریں۔ ورنہ ہم اس رائٹر کو ردا میں بین کردیں گے۔ ہماری پالیسی کا ایک یہ بھی حصہ ہے۔ آپ تنقید کریں مگر تہذیب کے دائرے میں رہ کر۔

آپی

صالحہ محمود

ردائے نبیؐ

مومن، کافر اور منافق کا بیان

حضرتِ عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا چار باتیں ایسی ہیں کہ جس میں وہ پائی جائیں گی۔ وہ پکا منافق ہوگا اور جس میں ان میں سے کوئی ایک بات پائی جائے گی۔ اس میں نفاق کی صرف ایک ہی شق ہوگی تا آنکہ وہ اسے ترک کردے۔ وہ چار باتیں یہ ہیں جب وہ بات کرے تو جھوٹ بولے، کسی سے کوئی معاہدہ کرے تو اس کی خلاف ورزی کرے، جب وہ کسی سے کوئی وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے جب اس کا کسی سے جھگڑا ہوجائے تو وہ گالی گلوچ پر اتر آئے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا ہے۔ انصارؓ سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض رکھنا نفاق کی نشانی ہے۔

حضرت زید بن خالد جہنیؓ کا بیان ہے کہ ابھی رات کی تاریکی باقی تھی کہ آنحضرتؐ نے ہمیں مقامِ حدیبیہ میں صبح کی نماز پڑھائی اور سلام کے بعد مقتدیوں سے مخاطب ہوکر فرمایا تمہیں کچھ خبر ہے حق تعالیٰ نے کیا ارشاد فرمایا ہے؟ انہوں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ فرمایا حق تعالیٰ نے ابھی فرمایا ہے کہ میرے بندے اس حال میں صبح کرتے ہیں کہ ان میں سے بعض مجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور بعض میرا انکار کرتے ہیں۔ پس جو یہ کہتا ہے کہ ہم پر اللہ کے فضل و کرم سے بارش ہوئی وہ مجھ پر ایمان رکھتا ہے اور نجوم کا منکر ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں ستاروں کے اثرات کے نتیجے میں بارش ہوئی وہ میرا منکر اور نجوم پر ایمان رکھنے والا ہے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرتؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایمان اور کفر و شرک کے درمیان دانستہ ترکِ نماز حدِ فاصل ہے۔

حضرتِ عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا، نماز کو اس کے وقت پر ادا کرنا۔ میں نے عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا، والدین سے بہتر سلوک کرنا۔ میں نے پھر عرض کیا اس کے بعد کون سا عمل بہتر ہے؟ فرمایا، راہِ خدا میں جہاد کرنا۔

حضرت عمرو بن شرجیلؒ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہؓ نے آنحضرتؐ سے سوال کیا کہ خدا کے نزدیک کون سا گناہ بہت بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو کسی کو خدا کا شریک قرار دے۔ حالانکہ خدا ہی نے تجھے پیدا کیا ہے۔ نے عرض کیا بے شک یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ پھر اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو اس خوف سے اپنی اولاد کو ہلاک کرڈالے کہ وہ تیرے رزق میں حصہ دار ہوگی۔ میں نے پھر عرض کیا اس کے بعد کون سا گناہ بڑا ہے؟ فرمایا یہ کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ جس نے ہم سے دھوکہ کیا وہ ہم میں سے نہیں۔

حضرت علقمہؓ نے بروایت حضرت عبداللہؓ بیان

کیا ہے کہ جب ذیل کی آیت نازل ہوئی۔ (ترجمہ)
''وہ لوگ جو ایمان لائے پھر انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے ملوث نہیں کیا۔''

تو صحابہؓ پر یہ امر شاق گزرا اور انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ ہم میں سے کون ایسا ہے جو اپنے نفس پر ظلم نہیں کرتا۔ اس پر آنحضرتؐ نے فرمایا بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھتے ہو بلکہ اس بات کو اس مثال سے سمجھا جائے کہ حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی تھی اے میرے پیارے بیٹے تو خدا کا کسی دوسرے کو شریک نہ بنانا کیوں کہ شرک ظلم عظیم ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا تم میں سے کسی کے پاس شیطان آکر پوچھتا ہے کہ فلاں فلاں شے کو کس نے پیدا کیا یہاں تک کہ آخر میں یہ سوال کر بیٹھتا ہے کہ تمہارے رب کو کس نے پیدا کیا؟ جب وہ اس حد تک پہنچے تو انسان کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے اور آگے بات کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔

حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا جس نے اپنے کسی مسلمان بھائی کا حق غصب کیا اللہ اس کے لیے دوزخ لازم اور اس پر جنت حرام کردے گا۔ اس پر ایک صحابیؓ نے عرض کیا۔ یارسول اللہ اگرچہ کوئی معمولی چیز ہی غصب کی ہو؟ فرمایا اگرچہ پیلو کے درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا یارسول اللہ اگر کوئی شخص مجھ سے میرا مال چھیننا چاہے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟ فرمایا اسے اپنا مال نہ دو۔ عرض کیا اگر میرے انکار کرنے پر وہ مجھے قتل کر ڈالے، فرمایا تب تو شہید کا مرتبہ پائے گا۔ عرض کیا اگر میں اس کی بدنیتی پر اسے قتل کر ڈالوں، فرمایا وہ دوزخ میں جائے گا۔

— .... —

انہی راوی سے ایک روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا اسلام کی ابتدا کسمپرسی وغریب الوطنی میں ہوئی اور وہ اپنی ابتداء کی طرح آخر میں بھی اسی طرح بے یارومددگار رہ جائے گا۔ پس اس مناسبت کی بنا پر بے یارومددگار بیکسوں کے لیے خوش خبری اور مبارک باد کا موقع ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کسی مرد کو کسی مرد کی اور کسی عورت کو کسی عورت کی ستر کی جگہ کو نہ دیکھنا چاہیے۔ علیٰ ہذا کسی مرد کو دوسرے مرد کے ساتھ اور کسی عورت کو دوسری عورت کے ساتھ ایک چادر میں لپٹ کر نہ لیٹنا چاہیے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا۔ دو لعنتیوں سے بچتے رہو صحابہؓ نے عرض کیا یارسول اللہ وہ دو لعنتی کون کون ہیں؟ فرمایا ایک وہ ہے جو لوگوں کی گزرگاہ میں رفع حاجت کرتا ہو دوسرا وہ جو لوگوں کی سایہ دار آرام گاہ میں غلاظت ڈالتا ہو۔

حضرت جابرؓ نے روایت کی ہے کہ آنحضرتؐ نے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہے کہ تم میں سے جب کوئی دھونی لے تو تین مرتبہ دھونی لے اور جب کوئی وضو کرے تو ناک میں پانی ڈال کر ناک کو جھاڑ دے۔

حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ کے نبی نے تو آپ کو ہر شے کے طور طریقے حتیٰ کہ بیت الخلا کے آداب تک سکھا دیے ہیں۔

آپ نے فرمایا۔ بے شک آنحضرتؐ نے رفع حاجت کے وقت قبلہ رخ بیٹھنے دائیں ہاتھ سے استنجا کرنے۔ تین ڈھیلوں سے کم استنجا کرنے اور ہڈی اور گوبر سے استنجا کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ☆☆

شازیہ مصطفیٰ عمران

سلسلے وار ناول

پہلی قسط

زندگی پھول ہے محبت خوشبو

وہ کتنے آنسو بہاتی جارہی تھی ایک ماں ہی کا تو آسرا تھا اور باپ بھی کبھی کبھی آتا تھا۔ آنسو پھر نکل رہے تھے، دو دن سے یونیورسٹی بھی نہیں گئی تھی، بخار بہت تیز ہو رہا تھا۔



''بیٹا! اب کیسی طبیعت ہے؟'' زبیدہ بیگم نے اس کے سرہانے بیٹھ کے اس کے الجھے بالوں کو سمیٹا۔

''خالہ ٹائم کیا ہو رہا ہے۔'' اس نے مندی مندی آنکھیں کھولیں۔

''نو بج رہے ہیں یہ بتاؤ طبیعت بہتر ہوئی؟''

''جی پہلے سے بہتر ہے۔'' وہ اٹھنے لگی۔

''بیٹا ناشتہ بنا دیتی ہوں تم اس کے بعد دوائی لے لینا۔'' وہ اٹھنے لگیں۔

''آپ رہنے دیں میں خود بنا لوں گی۔'' رو رو کے اس کی آنکھیں موٹی ہو گئی تھیں۔

وہ آج یونیورسٹی بھی نہیں جا سکی ہر وقت امی کو یاد کرتی رہتی تھی ان کا ماضی ایسا تھا کہ وہ خود بھی کسی سے بات نہیں کرتی تھی ایک یہ رانی کی منہ بولی بہن تھی جو اس کا خیال رکھتی تھی۔

''کاش میں بھی آپ کے ساتھ چلی جاتی۔'' وہ واش روم سے نکلی تھی۔

''شہوار کدھر ہے؟''



''وہ تو یونیورسٹی چلی گئی کہہ رہی تھی آج بہت کام ہے۔'' زبیدہ خالہ نے بتایا۔

''خالہ، ابو کو کتنے دن ہو گئے ہیں وہ آئے ہی نہیں۔''

''بیٹا ایک گھر بار والے کو آنے میں مشکل ہوتی ہو گی تم دل چھوٹا نہیں کیا کرو ایک دن انشاء اللہ شکیل بھائی تمہیں اس گھر میں لے جائیں گے۔'' وہ اسے تسلی اور اطمینان دلاتی تھیں۔

نیل فر اتنی صابر اور شاکر اور کم گو تھی وہ تو کسی سے بھی کوئی شکوہ نہیں کرتی تھی اور کبھی اس نے اپنے باپ سے شکوہ نہیں کیا کہ اسے اور اس کی ماں کو عزت سے گھر کیوں نہیں لے کے گئے۔

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کے وہ اپنے اسائنمنٹ کھول کے دیکھنے لگی۔ آخری سال تھا اس لیے پڑھائی دل جمعی سے کر رہی تھی۔ شکیل احمد کی بھی خواہش تھی وہ زیادہ سے زیادہ پڑھے، وہ نیل فر سے محبت اور پیار کرتے تھے ہر ہفتے وہ باقاعدگی سے ملنے آتے تھے اور کثیر رقم بھی اس کے خرچ کے لیے دے کے جاتے تھے، اس کے ذاتی اکاؤنٹ میں بھی اس کے لیے خاصی رقم منتقل کر دیتے تھے تاکہ اسے کسی طرح کی بھی پریشانی نہیں ہو۔

رانی کے علاج پر انہوں نے کسی قسم کی کوئی کمی نہیں کی تھی مگر وہ پھر بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئی تھیں۔ رانی کی منہ بولی بہن تھی جوان کے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ ان کے شوہر نے انہیں طلاق دے دی تھی، وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ان کے گھر میں ہی رہتی تھیں۔ شکیل احمد ان کی بھی مالی مدد کرتے رہتے تھے، ان کی بیٹی کی تعلیم کا بھی خرچہ اٹھا رہے تھے۔

وہ اسائنمنٹ بنانے کے بعد کچھ دیر آرام کرنے لیٹ گئی جب تک شہوار بھی نہیں آئی تھی۔

''تمہیں میں نے صبح اتنا اٹھایا تم اٹھی ہی نہیں۔''

''بس تھکن ہو رہی تھی۔'' کسلمندی سے وہ بستر پر پڑی تھی۔

''تم سوائے رونے کے کرتی کیا ہو تھکن تو ہو گی ہی۔''

''زندگی میں رونا ہی لکھا ہو تو اور زیادہ یہ سوچ کے رونا آتا ہے۔'' وہ پر سوچ لہجے میں گویا ہوئی۔

''تم شکر ادا کرو کے تمہارے ابو تمہارا خیال تو رکھتے ہیں تمہیں پوچھنے بھی آتے ہیں میرے باپ کو دیکھو مجھے اور میری ماں کو بے دخل کر کے جانے کہاں ہوں گے، ضرور اپنی دنیا بسائی ہو گی وہ تو شکیل انکل اتنے اچھے ہیں میرا بھی تمہاری طرح خیال رکھتے ہیں۔'' شہوار کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

''تم پھر شروع ہو گئیں جاؤ کھانا کھاؤ۔ جب سے یونیورسٹی سے آئی ہو ایسے ہی بیٹھی ہو تمہیں بھوک نہیں لگ رہی؟'' نیل فر نے بات کو ہی کاٹ دیا۔

''تم نے کھانا کھا لیا؟'' وہ اپنے کپڑوں کی شکنیں ہاتھ سے نکالتی ہوئی کھڑی ہوئی۔

''آج ناشتہ ہی دیر سے کیا ہے اس لیے کھانے کی گنجائش نہیں تھی۔''

''چلو میں فریش ہو کے اپنا کھانا یہیں لے آؤں گی۔'' نیل فر نے مسکرا کے سر ہلایا۔

''اگر شہوار نہیں ہوتی تو وہ کیا کرتی اتنی پیار کرنے والی زبیدہ خالہ نہیں ہوتیں تو وہ امی کے بعد تو تنہا رہ ہی نہیں سکتی تھی۔'' نیل فر کو ایسا لگتا تھا اس کی زندگی سے دلچسپی ہی ختم ہو گئی ہے امی کے بعد جیسے کچھ بچا ہی نہیں ہے۔ امی نے آخری دنوں میں ابو سے کہا تھا۔

''شکیل احمد اپنی بیٹی ساتھ لے جانا یہ میرے بغیر مر جائے گی۔'' نیل فر کا تو رو رو کے برا حال تھا شکیل احمد نے اسے سینے سے لگایا۔

''رانی تم ایسی باتیں نہیں کرو ٹھیک ہو جاؤ گی تم۔'' وہ ہمیشہ تسلیاں ہی دیتے تھے۔ نیل فر کی آنکھیں بھر

آنسوؤں سے بھر گئیں اسے شکیل احمد نے بتایا تھا اس کے دو بھائی بھی ہیں شکیل احمد نے اسے ساتھ لے جانے کی کبھی بات ہی نہیں کی تھی۔

☆......☆

''آپ ہر وقت کہاں کھوئے رہتے ہیں۔'' ثریا نے انہیں خاموش ایک جگہ بیٹھے دیکھا۔

''کہیں نہیں۔''

''یہ ضیاء کدھر ہے؟''

''آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔'' انہوں نے بتایا۔

''میں نے کتنے سالوں سے آپ کو اکثر یوں خاموش ایک ہی جگہ بیٹھے دیکھا ہے کیا بات ہے؟'' وہ تشویش میں پڑ جاتی تھیں۔

''ارے تم تو پیچھے ہی پڑ جاتی ہو ایسی کوئی بات نہیں ہے آفس کی میٹنگز تھکا دیتی ہیں۔'' انہوں نے ہمیشہ کی طرح بات کو ٹالا ثریا تو ویسے ہی بات کے پیچھے پڑ جاتی تھیں۔

''آپ ضیاء کو ادھر بھیجیے مجھے کچھ ضروری ڈسکس کرنی ہے آج میں آفس تو جاؤں گا نہیں۔''

''خیریت!'' وہ پھر کھوجنے لگیں۔

''کہیں ضروری جانا ہے کوئی میٹنگ ہے۔'' وہ کھڑے ہو گئے۔

انہیں نیل فر کے پاس جانا تھا دو ہفتے سے گئے نہیں تھے، انہیں اندازہ تھا وہ اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔

''اگر آپ تھکے ہوئے ہیں تو ضیاء کو بھیج دیں آپ آرام کریں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ جائیے ضیاء کو بھیجیے۔'' وہ انہیں بولے اور خود بھی جانے کی تیاری کرنے لگے اتنے میں ضیاء بھی آ گیا اسے آفس سے متعلق ضروری باتیں سمجھائیں ثریا اکثر شکیل احمد کی طرف سے پریشان ہو جاتی تھیں۔ شکیل احمد تین بہن بھائی تھے خود بڑے تھے ان کے بعد زہرہ کے تین بچے تھے ایک بیٹی جو شادی شدہ اور دو بیٹے تھے۔ ان سے چھوٹے سجاد احمد تھے ان کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا سجاد احمد نیچے کے پورشن میں تھے کافی بڑا بنگلہ تھا ہر طرح کی سہولت میسر تھی۔

''ضیاء! یہ تمہارے ابو کہاں جا رہے ہیں؟''

''امی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟'' وہ ہنسنے لگا۔

''اچانک سے تمہارے ابو غائب ہو جاتے ہیں۔'' وہ بولیں۔

''آپ ابو پر شک کر رہی ہیں؟'' وہ پھر ہنسا۔

''بھائی! امی کو لگتا ہے کسی لڑکی کے چکر میں تو نہیں پڑ گئے ہیں۔'' حمزہ نے بھی مسکرا کے لقمہ دیا۔

''زیادہ الٹی سیدھی نہیں ہانکا کرو میں تو اس لیے فکر مند ہوتی ہوں ایسا لگتا ہے وہ کسی الجھن میں گھرے رہتے ہیں۔'' انہوں نے حمزہ کے دھپ لگائی ضیاء کی ہنسی نکلی تھی مگر کنٹرول کیا۔

''آپ کو نہیں پتہ امی ہمارا بزنس بہت پھیل گیا ہے۔ ابو کو اسی کی فکر رہتی ہے لوگ جیلس بھی ہوتے ہیں آپ جانتی ہیں کامیاب بزنس مین سے سب جلتے ہیں۔'' ضیاء نے وضاحت کے ساتھ انہیں سمجھایا تا کہ ان کی فکر بھی کم ہو۔

''میں نے شروع سے تمہارے ابو کو محنت ہی کرتے دیکھا ہے۔'' وہ سوچ کے گزرے دنوں کا ذکر کرنے لگیں۔

''پھر کیا مسئلہ ہے آپ ایسا کچھ غلط نہیں سوچا کریں ہمارے ابو ایک کامیاب انسان ہیں جو اپنے کام کے ساتھ اپنی فیملی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔''

''ہوں یہ تو ہے۔'' وہ ان دونوں کے ساتھ ناشتہ کر رہی تھیں۔

''حمزہ کالج چھوڑ دوں یا چلے جاؤ گے۔''

''بائیک ٹھیک ہے میری چلا جاؤں گا۔'' چائے کے جلدی جلدی سپ لیتے دونوں ہی نکل گئے تھے۔

☆......☆

''امی! یہ فہر کب سے سو رہا ہے اٹھا نہیں۔'' کنول نے ان سے پوچھا۔ زہرہ ناشتے کے برتن ملازمہ سے اٹھوا رہی تھیں۔ کنول دو دن سے رہنے آئی ہوئی تھیں ان کے دو بیٹے تھے عفان اور ریان۔

''آپ اس سے پوچھا کریں کیوں اتنی اتنی رات کو آتا ہے۔'' کنول کو اس لئے بھی غصہ آرہا تھا دو دن سے یہاں تھیں اور فہر سے ان کی ابھی تک بھی تفصیلی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

''اس کی شادی ہوگی تو ہی یہ ٹک کے بیٹھے گا۔'' زہرہ خود فہر کی طرف سے پریشان رہتی تھیں۔

''سجاد ماموں کی ثناء...... بُری تو نہیں ہے۔''

''کئی دفعہ بات کر چکی ہوں کہتا ہے مجھے ابھی کوئی شادی وادی نہیں کرنی۔''

''امی آپ اس کے کہنے میں رہیں تو یہ آپ کو ٹالتا رہے گا زبردستی کریں اس کے ساتھ۔''

''یہ آپ امی کے کان بھرنے آئی ہیں۔'' فہر گرے قمیض شلوار میں ڈائننگ ٹیبل پر آکے بیٹھا۔

''ہوگئی تمہاری صبح۔'' کنول نے قدرے برامان کے ناراضی سے کہا۔

''مصروف بندہ ہوں ظاہر ہے دیر تک سونا میرا حق بنتا ہے۔ امی پلیز ناشتہ تو لگوا دیں دو کرارے پراٹھے اور زردی والا آملیٹ۔'' اس نے عاجزی سے کہا۔

''ایسے کون سے کاموں میں رہتے ہو۔''

''ہوتے ہیں کچھ کام۔'' وہ ان کے چڑنے پر محظوظ ہو رہا تھا۔

''کچھ کام خفیہ ہوتے ہیں وہ بتائے نہیں جاتے۔'' وہ رازداری سے اس کی جانب جھکا۔

''امی! اس نے ضرور کوئی شادی کر رکھی ہے اسی لئے آپ کو منع کرتا رہتا ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ آپی کیوں الزام لگاتی ہیں۔'' وہ تو گھبرا گیا۔

زہرہ، فہر کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

''دیکھ رہی ہیں امی آپ۔''

''سب دیکھ بھی رہی ہوں اور سن بھی رہی ہوں۔'' وہ خود اس کے لئے ناشتہ بنا کے لائی تھیں۔

''تم اتنی دیر سے گھر آتے ہو میری تو جان اٹکی رہتی ہے اور تمہارے بابا الگ ناراض ہوتے ہیں۔''

''کام کی مصروفیت بڑھ گئی ہے۔'' وہ پراٹھے کا لقمہ منہ میں رکھنے لگا۔

''ایسا بھی کیا کہ گھر والے ہی تمہیں نظر نہیں آتے۔''

''سب نظر آتے ہیں۔'' وہ ہنسا۔

''اچھا آپ کیا شکوے اور شکایتیں کرتی رہیں گی آپ کے دونوں صاحبزادے کہاں ہیں۔'' وہ پوچھنے لگا۔

''اسکول کا ہوم ورک کر رہے ہیں کل تو میں چلی جاؤں گی۔''

''کل ہی تو آئی ہیں۔'' وہ پھر گویا ہوا۔

''منڈے کو ان کا اسکول ہوتا ہے، سٹرڈے اور سنڈے چھٹی تھی سوچا کے دو دن رک آؤں گی۔'' کنول اپنے لمبے چوڑے ڈیشنگ بھائی کو دیکھ رہی تھیں۔

''فہر تم نے کیا سوچا ہے۔'' وہ انجان بنا۔

''شادی کرنی ہے یا نہیں۔''

''وہ ابھی تو بالکل نہیں۔'' اس نے نفی میں سر اٹھایا۔

''آپ مجھے بتایئے ہر دفعہ آ کے آپ یہ شادی جیسی فضول خرافات کیوں نکالتی ہیں۔''

''اچھا میری شادی تم لوگوں نے کی جب فضول خرافات نہیں تھی۔'' وہ برا مان گئی۔

''آپی آپ کی شادی ضروری تھی اور بیٹیوں کو جتنی جلدی ہو رخصت کر دینا چاہیے۔'' اس نے مدبرانہ لہجے میں کہا۔ زہرہ کو ہنسی آ گئی۔

''میں امی سے کہہ رہی تھی سجاد ماموں کی ثناء کے لیے بات کر لیتے ہیں تمہارا جب موڈ ہو شادی کر لینا۔''

''آپی پلیز! مجھے معاف رکھیں میں نے کبھی ثناء کے متعلق نہیں سوچا اور ثناء میرے لیے بہنوں کی طرح ہے ویسے ہی میری ایک اکلوتی بہن ہے چاہتا ہوں اور بھی بہنیں ہوں بھائیوں کا بھرم رہتا ہے۔'' اس نے بات مذاق میں ٹالی۔

''یہ تو امی اسی طرح بکواس کرتا رہے گا۔ پتہ نہیں کیا سوچ کے بیٹھا ہے امی کا خیال نہیں آتا ان کا بھی دل چاہتا ہوگا کہ تمہارے بچے ہوں۔''

''بھائی جان آپ کا موبائل بج رہا ہے۔'' مہاد کی اوپر سے تیز آواز آئی۔

''یار لے آؤ نیچے۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کے لیا۔

''پلیز ذرا آپ خاموش ہو جائیں میری ضروری کال ہو گی۔'' وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے کھڑا ہوا کنول منہ بنا کے رہ گئی تھیں زہرہ ہنسنے لگیں۔ وہ فہر کو جانتی تھیں وہ اتنی جلدی شادی نہیں کرے گا۔ وہ موبائل پر بات کر رہا تھا اتنے میں کنول اپنے دونوں بیٹوں کو دیکھنے اسٹڈی روم میں چلی گئی تھیں۔

''امی! کیوں آپ میرے پیچھے پڑ جاتی ہیں مجھے جب شادی کرنی ہو گی آپ سے کہہ دوں گا۔'' وہ ماں کو ناراض بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ابھی ہم تمہاری بات لگا لیتے ہیں۔''

''ابھی بالکل بھی نہیں اور ثناء سے بالکل نہیں کیونکہ مجھے بردبار اور سمجھدار لڑکی چاہیے جو آپ کے ساتھ رہ سکے۔'' وہ صاف گوئی سے بولا۔ ثناء کچھ منہ پھٹ تھی اور اسے سنجیدہ بھی نہیں لگتی تھی کچھ شوخ و شنگ تھی۔ فہر کا مزاج سنجیدہ تھا۔

''ثناء بری تو نہیں ہے۔''

''میں بری کہہ بھی نہیں رہا میں نے اسے ہمیشہ چھوٹی بہن سمجھا ہے اس لیے پلیز آئندہ ثناء کا نام نہیں لیجئے گا۔'' اس نے آہستگی سے انہیں سمجھایا۔

''اچھا وہ مجھے حیدر آباد جانا ہے کل واپسی ہو گی۔''

''حیدر آباد کیوں اچانک سے۔'' زہرہ چونک گئیں۔

''وہاں فلائی اوور بن رہا ہے اسے ہی ڈسکس کرنے جانا ہے کافی لمبا پروجیکٹ ہے دعا کیجیے گا۔'' اس نے ان کے ہاتھ تھامے۔

''پیکنگ کر دوں۔''

''دو سوٹ رکھنے ہیں میں خود رکھ لوں گا آپ پریشان نہ ہوں۔'' وہ انہیں تسلی اور اطمینان دلا کے اپنے روم میں جانے لگا۔

''امی اسے تو میری ذرا پرواہ نہیں ہوتی بہن چاہے کتنے دنوں بعد آئے۔''

''آپی ایسی بات نہیں ہے آپ میرا کام جانتی ہیں پھر بھی ایسی بات کر رہی ہیں۔'' وہ انہیں منانے لگا۔

''جاؤ تم اپنے کام سے پیار کرو۔''

''لگتا ہے مجھے کچھ سوچنا پڑے گا تا کہ آپ سب کا موڈ ٹھیک رہے۔'' وہ معنی خیزی سے بولتا ہوا اوپر کی سمت بڑھ گیا۔ ریان اور عفان بھی اس کے پیچھے بھاگے تھے۔

☆......☆

''صنوبر پلیز! واپس وہی چینل لگاؤ۔'' وہ بضد تھی۔

''ماہا تمہارا دماغ خراب ہے اگر دادی جان کی نگاہ پڑ گئی تو تمہاری خیر نہیں ہے۔'' وہ اسے ڈرانے لگی۔

''دادی جان سو رہی ہیں تم مجھے دیکھنے دو۔''

''ماہا ماہا تم سدھر جاؤ۔'' صنوبر نے ریموٹ لے کے پھر چینل چینج کر دیا۔

''تم تو پاگل ہو۔'' وہ چیخی۔

''پیچھے دیکھو کون کھڑا ہے۔'' اس نے آہستگی سے اشارے سے کہا۔ دونوں ہال کمرے میں بڑی اسکرین پر اپنے اپنے پسندیدہ چینل دیکھ رہی تھیں۔

''کون ہے۔'' اس نے گردن گھمائی۔ شہزیل کھڑا ہوا کسی سے سیل پر بات کر رہا تھا۔

''شہزیل ہے تمہیں کیا پریشانی ہے دروازہ بند کر کے آتی ہوں۔''

''تم خود ہی دیکھو تمہاری وجہ سے مجھے ڈانٹ پڑتی ہے۔'' وہ تو ویسے ہی ڈرتی تھی۔

''ارے فلم کا اینڈ ہی تو دیکھ رہی ہوں اب وہ ایسا ہے تو کیا کروں۔'' اس نے ٹی وی آف کر دیا صنوبر تو چلی گئی تھی اور وہ شہزیل کو دیکھنے لگی جو بلیک پینٹ پر اسکائی بلیو شرٹ میں ملبوس ڈیسنٹ اور چارمنگ لگ رہا تھا۔

''کہاں جا رہے ہو۔''

''مارکیٹ تک جا رہا ہوں۔'' سیل اس نے پینٹ کی پاکٹ میں رکھا۔

وہ ماہا پر توجہ نہیں دیتا تھا مگر وہ پھر بھی اس کی راہ میں حائل ہوتی رہتی تھی۔

''کیا لینے؟''

''سر نے بھیجا ہے۔''

''تم ڈیڈی کو سر کیوں کہتے ہو، انکل کہتے ہوئے زبان میں درد ہوتا ہے۔'' آنکھیں نکال کے اس پر چڑھ دوڑی تھی بلیک ٹراؤزر پر لمبی شرٹ اور دوپٹے میں اسے گھبرانے اور بوکھلانے پر مجبور کر دیتی تھی، وہ بہت محتاط ہو کے اس سے بات کرتا تھا مگر لگتا تھا اسے ڈر بالکل نہیں لگتا تھا۔

''کوشش کرتا ہوں بچپن کی عادت ہے مشکل سے جائے گی۔'' وہ ہنسا اور آگے بڑھ گیا۔ ماہا بھی پیچھے پیچھے اس

کے آنے لگی شہریل اس کی باتوں سے جلنا چاہتا وہ اتنا ہی اس سے الجھتی تھی۔

''میں ساتھ چلوں۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' جھٹ منع کیا لاسٹ ٹائم بھی وہ ساتھ چلی گئی تھی دکانوں پر ادھم مچا کے رکھ دیا تھا۔

''کیوں بالکل بھی نہیں مجھے بھی کچھ لینا ہے۔''

''میں سر کے کام سے جا رہا ہوں آفس کی کچھ سیٹنگ کا کام ہے کارپینٹر کے پاس جا رہا ہوں۔'' اس نے دوسرا کام بھی بتا دیا تا کہ وہ آگے کچھ نہیں بول سکے۔

''مارکیٹ بھی تو جاؤ گے میں ابھی آئی۔'' شہریل تیزی سے نکل گیا گاڑی کی چابی بھی اندر اپنے کمرے میں ہی بھول آیا تھا وہ لینے کے لیے اندر آیا۔

''شہریل اسے بھی تم ساتھ لے جاؤ کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔'' بشریٰ نے اسے کہا۔

ماہا اپنی امی کو حمایت کے لیے ساتھ لائی تھی اسے پتہ تھا جب وہ کہیں گی تو شہریل منع ہی نہیں کر سکے گا۔

''جی اوکے۔'' اس نے صبر کا گھونٹ بھرا۔ جلدی سے وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی شہریل نے لمبا سانس بھرا تھا۔

''تم مجھ سے اتنا بھاگتے کیوں ہو؟'' گاڑی پورچ سے نکل چکی تھی اور وہ سامنے دیکھتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے آپ مارکیٹ میں بہت دیر لگاتی ہیں اور مجھے دیر لگانے سے کوفت ہوتی ہے۔''

''بعد میں بھی تو بیوی کو لے کے جایا کرو گے جب کوفت نہیں ہوگی۔'' ماہا نے اس کے سپاٹ اور بارعب چہرے کو دیکھا۔

''میں ایسی ناممکن باتوں کو سوچا نہیں کرتا۔''

''کیوں شادی نہیں کرو گے۔'' ماہا کو تو غصہ آ گیا۔

''آپ یہ بتایئے آپ کو کہاں جانا ہے۔''

''بھاڑ میں۔'' وہ سلگ کے رہ گئی۔

''اگر آپ بلاوجہ آ گئی ہیں تو میں آپ کو واپس ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' اس نے ماہا کے غصے سے پھولے چہرے کو دیکھا۔

''شہریل اللہ کرے کے تمہیں محبت ہو جائے۔''

''جی۔'' وہ تو اچھل گیا۔

''کیوں اونچا سنتے ہو۔'' وہ چیخی۔

''پتہ نہیں کیا بولتی رہتی ہیں، مجھے تو آپ کی سمجھ نہیں آتی۔'' وہ ہنس کے اس کی بات کا تمسخر اڑانے لگا۔

''زیادہ بھولے بننے کی میرے سامنے ایکٹنگ نہیں کیا کرو۔''

''اچھا آپ کو لگتا ہوگا۔'' وہ پھر مسکرا دیا ماہا کو زبردست غصہ جو آ گیا تھا اس نے بچپن سے ماہا کو نٹ کھٹ اور شرارتی دیکھا تھا اور بڑے ہونے کے بعد بھی وہ ایسی ہی تھی۔ ماہا کے ڈیڈی نصیر احمد کو شہریل کسی فٹ پاتھ پر روتا ہوا ملا تھا اور وہ اس وقت دس سال کا تھا اپنے گھر کا اتا پتہ بھی نہیں تھا نصیر احمد نے اس کے گھر والوں کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ ناکام رہے تھے شہریل کو بھی اتنا کچھ پتہ نہیں تھا۔

بس اسے اتنا یاد تھا اسکے ابو نے فورتھ کلاس میں فیل ہونے پر مارا تھا وہ نا سمجھ اس وقت وہ مار نہیں سمجھ سکا اور گھر سے نکل گیا اس کے بعد اسے یاد نہیں تھا نصیر احمد نے اس کا ہر طرح سے خیال رکھا تعلیم دلوائی اور بالکل گھر

کے بچوں کی طرح ہی سب اسے سمجھتے تھے، نصیر احمد نے اس کی تعلیم پوری ہونے کے بعد آفس میں رکھ لیا تھا وہ بہت محنت اور سمجھ داری سے ان کا ساتھ دے رہا تھا۔
ما، با کچھ اس سے زیادہ ہی فری ہوتی تھی مگر شہزیل نے اپنے اور اس کے درمیان لائن کھینچی ہوئی تھی اور نصیر احمد کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ شہزیل کو اندر ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا اس کے دو چھوٹے بہن بھائی بھی تھے، بہن رمفہ جو اس سے پانچ سال چھوٹی تھی، تین سال کی سمیرہ اور ایک سال کا امجد تھا، جانے وہ اب کیسے ہوں گے وہ انہیں کیسے پہچانے گا۔ سولہ سترہ سال گزرنے کے بعد بھی وہ سب یاد کرتا رہتا تھا۔ یہاں رحمت ولا میں اسے سب نے محبت سے رکھا تھا۔ مگر اسے اپنے خونی رشتے یاد آتے تھے۔
''کاش میں ایسا کر کے گھر سے نہیں نکلتا۔'' اکثر راتوں کو وہ سوچتا تھا اور ابو اور امی کو یاد کرتا تھا دونوں اس سے دور تھے۔



اسے جاب سے ریزائن بھی خود ہی کرنا پڑا تھا وہاں کا ماحول اسے اچھا نہیں لگا تھا اب وہ دوسری جگہ انٹرویو کے لئے جا رہی تھی۔
''امی، ابو آپ دونوں دعا کیجیے گا میرا انٹرویو کامیاب ہوا چھا ہو۔'' وہ ان دونوں سے دعا لے کے رخصت ہو رہی تھی۔
جب سے جاب سے ریزائن دیا تھا گھر کا خرچ بھی مشکل سے ہو رہا تھا ابو کا علاج بھی رک گیا تھا۔
''جاؤ بیٹا اللہ کے حوالے۔'' وہ خود کو بڑے سے دوپٹے میں سموئے سوچوں میں غلطاں جا رہی تھی اگر بروقت گاڑی کے بریک نہیں لگتے تو وہ ضرور نیچے آجاتی۔
''اے محترمہ خودکشی کرنے کے لیے میری ہی گاڑی ملی تھی۔'' وہ غصے میں تن پھن کرتا ہوا نیچے اترا۔
''ارے چڑھانے والے تو آپ تھے، آپ کا کیا تھا چڑھا دیتے آپ امیروں کا تو کچھ نہیں بگڑتا مارے تو ہم غریب جاتے ہیں۔'' وہ سامنے والے شخص پر برس پڑی تھی۔ اور وہ حیرانگی سے اس کی دماغی حالت پر شبہ کرنے لگا۔
''مس آپ ہوش میں تو ہیں۔'' شہیر نے سیدھے ہاتھ سے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔
''میں اگر بروقت بریک نہیں لگاتا تو......روڈ پر آنکھیں اور کان کھلی رکھتے ہیں۔''
''شکریہ بہت بہت۔'' وہ بری طرح چڑ گئی تھی یہ کیا چپل بھی ٹوٹ گئی۔
''مجھے نہیں لگتا آپ کے آثار ہیں کہیں ٹھیک سے جانے کے۔'' شہیر نے اس کی ٹوٹی چپل دیکھ لی تھی۔
''شٹ اپ اپنا راستہ ناپیے۔''
''میں تو راستہ ناپ لوں گا آیئے آپ کو ہاسپٹل لے چلتا ہوں لگتا ہے آپ کے دماغ میں کچھ خرابی ہے چیک کروایئے گا۔'' وہ اسے چھیڑنے ہی لگا۔
''آپ جاتے ہیں یا میں یہیں چپل آپ پر برسا دوں۔'' وہ اتنی بے زار اور پریشان تھی اسے یہ تک اندازہ نہیں تھا وہ کیا کہہ رہی ہے۔
''او کے میں چلتا ہوں مگر دھیان سے ٹریفک دیکھ لیں کتنی ہے۔'' وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا رمفہ اور زیادہ ہراساں اور روہانسی ہوگئی۔ انٹرویو کا ٹائم نکل رہا تھا، چپل بھی ٹوٹ گئی تھی اور آس پاس کوئی بھی جوڑنے والا نہیں نظر آ رہا تھا۔

زندگی میں پہلی دفعہ اتنی ذلت اٹھانی پڑ رہی تھی آگے چل کے اسے چپل جوڑنے والا نظر آ ہی گیا۔ پھر وہ انٹرویو کے لیے گئی، اتنی لمبی لائن دیکھ کر تو اور وہ مایوس ہی ہوگئی۔

''میرا انتخاب تو ناممکن لگ رہا ہے۔'' وہ افسردہ ہوگئی تھی۔

بجھے دل کے ساتھ انٹرویو دے کے نکلی تھی گھر کی مالی پوزیشن اتنی خراب تھی کے رکھے ہوئے سارے پیسے بھی ختم ہونے والے تھے۔ سمیرہ کا فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن ہونا تھا۔ اسجد کی نائن کلاس کی ایڈمیشن فیس جانی تھی، رمشہ کا سوچ سوچ کے دماغ دکھنے لگا تھا اپنے گھر کا وہی سہارا تھی، گریجویشن کے بعد سے جاب کرنے لگی گریجویشن بھی اس نے ایسے کرلیا اس وقت ابو ٹھیک تھے جب سے انہیں فالج کا اٹیک ہوا تھا وہ کسی قابل نہیں رہے تھے رمشہ کی پوری کوشش تھی کے ابو ٹھیک ہو جائیں اور اس نے تہیہ کیا ہوا تھا وہ اپنے ابو کو ٹھیک کر کے رہے گی۔

☆......☆

وہ ابھی گھر میں داخل ہی ہوا تھا، پورے صحن میں پانی پانی ہو رہا تھا تنقیدی اور ناگوار نگاہوں سے اوپر سیڑھیوں سے پانی آتے ہوئے دیکھا تھا۔

''صفائی کا ہر وقت بھوت چڑھا رہتا ہے۔'' اس کے جوتے گیلے ہوگئے۔

''امی! امی۔'' وہ چیختا ہوا اندر آیا۔

''کیا ہوگیا بیٹا خیریت تو ہے۔'' وہ شائد اندر کوئی کام کر رہی تھیں حنین کی آواز پر گھبرائی گھبرائی آئی تھیں۔

''امی اس لڑکی کو منع کیا کریں جب دیکھو صفائیاں کرتی رہتی ہے پورا صحن پانی پانی ہو رہا ہے۔'' اسے غصہ آ رہا تھا۔

''بیٹا! وہ خود صفائی کر کے جاتی ہے نیچے کی بھی۔'' وہ بتانے لگیں۔

''میں بتا رہا ہوں اگر یہی طریقے رہے تو میں انہیں بھی نکال دوں گا یہاں سے۔'' وہ ویسے اس سے تپا رہتا تھا اور پھر اسے بے روزگاری کی وجہ سے بھی چڑچڑاہٹ ہوتی رہتی تھی جب سے اس کا ایم بی اے پورا ہوا تھا وہ جاب کی تلاش میں تھا گھر کا خرچہ گھر کے کرائے سے ہوتا تھا، ان کا گھر بھی ڈبل اسٹوری تھا دو پورشن کرائے پر دیئے تھے خود گراؤنڈ فلور پر رہتے تھے وہ تو ابو نے ان کے رہنے کا ٹھکانہ کر دیا تھا ورنہ آج کے دور میں دو کمروں کا مکان لینا ہی بہت مشکل تھا، محمد عثمان صاحب کا پندرہ سال پہلے انتقال ہوگیا تھا ان دنوں حنین اسکول میں تھا، حسن اور حرا تو اس وقت بہت ہی چھوٹے تھے حنین نے امی کو اپنے دونوں بہن، بھائی کو خود ہی سنبھالا تھا پھر گھر چلانے کے لیے اوپر کے دو پورشن بھی کرائے پر دیئے۔ حنین اپنی جاب تلاش کرنے میں لگا ہوا تھا کئی جگہ اپلائی کر چکا تھا ابھی تک اسے معقول جاب نہیں مل رہی تھی۔

''بیٹا! بری بات ہے ہمیں کونسا تکلیف دے رہے ہیں الٹا میرا ہاتھ ہی بٹا کے چلی جاتی ہے۔'' انہوں نے اسے سمجھایا۔

''اچھا یہ بتاؤ ہوا کوئی کام۔''

''پتہ نہیں امی قسمت میں کیا لکھا ہے۔'' وہ برآمدے میں پڑی ڈائنگ ٹیبل کی چیئر کھسکا کے بیٹھ گیا۔

''اللہ اچھا کرنے والا ہے تھوڑی آزمائش ہے ختم ہوجائے گی۔'' انہوں نے اسے تسلی دی۔

''آنٹی آپ کا وائپر لے لوں۔'' وہ بوتل کے جن کی طرح ہی نمودار ہوئی تھی۔

حنین نے ناگواری سے منہ بنایا تھا۔ اریکہ نے اس کے بگڑے تیور دیکھ لیئے تھے۔ کاسنی کاٹن کے پرنٹڈ

کپڑوں میں وہ اپنے دراز بالوں کی چوٹی بنائے معصوم سی لگ رہی تھی۔

''سنو! آج آخری دفعہ کہہ رہا ہوں اگر روز روز تمہاری صفائی نصف ایمان نظر آئی تو میں یہاں سے روانہ کر دوں گا۔'' بے مروت اور بدلحاظ بنا بول رہا تھا۔

''آنٹی ایسا ہم نے کیا کر دیا میں تو نیچے کی بھی کر کے جاتی ہوں صفائی۔'' وہ جھٹ بولی۔

''آئندہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''جاؤ بیٹا لو وائپر تم اپنا کام کرو اس کی باتوں کو دل پر نہیں لو۔'' انہوں نے مداخلت کر کے بات کو ختم کیا۔

اریکہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا حنین ہر وقت اسے دیکھ کر انگارے ہی چبا تا رہتا تھا اسے بہت دکھ ہوتا تھا آٹھ سال سے وہ ان کے گھر کرائے پر تھے حنین کی امی ان سب سے بہت اچھے انداز میں ملتی تھیں مگر حنین کا مزاج کچھ ترش اور روکھا تھا جب کے حسن اور حرا فرینڈلی تھے اس کی ان کے ساتھ اچھی بنتی تھی۔

''انسان کو اتنا بھی غرور نہیں کرنا چاہیے، اگر ہم آپ کے گھر میں کرائے پر رہ رہے ہیں تو آپ بے عزتی کرتے رہیں گے۔'' اریکہ نے موقع دیکھ کر اسے سنانے سے گریز نہیں کیا۔

انیسہ بیگم لگتا تھا اندر تھیں وہ بیٹھا کسی نیوز پیپر کو پڑھ رہا تھا ایک دم اس کی آواز پر چونک گیا۔

''آپ کو ہر وقت مجھ پر غصہ پتہ نہیں کیوں رہتا ہے۔''

''تمہاری حرکتوں پر رہتا ہے یہ کیا آئے دن پانی بہا کے صفائیاں کرتی رہتی ہو۔'' وہ ذرا بھی شرمندہ نہیں ہو رہا تھا۔

''ہم اپنے پورشن کی صفائی کرتے ہیں اگر پانی نیچے آجاتا ہے تو ہمارا قصور نہیں آپ کے فرش کا قصور ہے اگر ڈھلان نیچے ہے تو پانی نیچے ہی آئے گا فلور ٹھیک کروا دیں یہ پانی نیچے نہیں آئے گا۔'' وہ اسے جتانے لگی۔

''اگر آپ کو پرابلم ہے تو تم لوگ یہ گھر چھوڑ دو۔'' وہ دبتا تو بالکل نہیں تھا۔

''آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے ہم یہ گھر نہیں چھوڑیں گے کر لو جو کرنا ہے۔'' وہ تن فن کرتی ہوئی اوپر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

حنین نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

''جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسی جاتی ہے۔'' وہ بڑبڑایا، وہ بھی سر کو جھٹکتا ہوا اپنے روم میں چلا گیا۔ وہ اریکہ کی ہر لمحہ بے عزتی ہی کرتا تھا۔

''سمجھتا کیا ہے خود کو ہر وقت دماغ گرم ہی رہتا ہے۔ جنگلی اجڈ۔'' وہ خوب اسے برا بھلا کہہ رہی تھی دماغ میں آگ لگی ہوئی تھی دل کر رہا تھا اوپر سے کچھ اٹھا کے اس کے سر پر دے مارے مگر اس نے اپنے غصے پر قابو پایا ہوا تھا۔

''اریکہ بیٹا روٹی پکالی ہو تو اپنے ابو کو کھانا دے دو وہ نماز پڑھنے جائیں گے۔'' امی کی آواز پر وہ سنبھل گئی۔

صبح سے گھر کی صفائی میں لگی ہوئی تھی رات کے کھانے میں بھی دیر ہو گئی تھی۔

''امی! ابھی پانچ منٹ لگیں گے میں دال میں بگھار لگا دوں۔'' وہ جلدی جلدی ہاتھ چلانے لگی۔

''آرام سے کبھی ہاتھ چلا لو تمہارے کام بھی آندھی طوفان کی طرح ہوتے ہیں۔''

''امی آپ تو ڈانتی رہتی ہیں۔''

''ڈانٹ نہیں رہی ایک بات بول رہی ہوں۔'' انہوں نے جگ میں پانی بھرا اور گلاس لے کے چلی گئی تھیں اریکہ نے جلدی جلدی روٹی بنائی اور کھانا بھی لگا دیا ابو عشاء کی نماز سے پہلے کھانا کھا لیتے تھے تا کہ پھر ہضم ہو جائے۔

اس نے ثمرہ سے برتن دھو کے کچن صاف کرنے کو کہا آج تو صفائی اور پھر حنین سے مغز ماری کی وجہ سے سر دکھ رہا تھا۔

''ذلیل انسان کو کسی کی عزت کا ذرا خیال نہیں ہوتا کھڑ دس کہیں کا۔'' بستر پر لیٹ کے بھی وہ سب اس کے ذہن سے نہیں ہٹ رہا تھا۔ جانے کیوں وہ اسے سوچتی رہتی تھی جب کے وہ اسے سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کوشش کرتی تھی اس کا سامنا نہیں ہو۔''

☆......☆

شکیل احمد دو ہفتے بعد آئے تھے۔ نیل فر ان کے سامنے بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

''بیٹا! کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیا کرو۔''

''مجھے کس چیز کی ضرورت ہوگی ہر چیز تو موجود ہوتی ہے اور چیزوں کا مجھے کرنا بھی کیا ہے۔'' لہجے میں محرومی افسردگی تھی۔

شکیل احمد پہلو بدل کے رہ گئے۔ وہ اتنی کم گو اور سادہ تھی وہ حیران ہوئے تھے ان کے خود کے گھر میں ہی بھائی کی بیٹیاں کیسے رونق لگائے رکھتی تھیں۔ کپڑوں کا فیشن کا کتنا شوق تھا اور ایک یہ ان کی بیٹی اسے کسی بات کا شوق ہی نہیں تھا۔

''کیوں لڑکیاں تو بہت سے شوق رکھتی ہیں کپڑوں جوتوں پرس کا۔'' وہ نیل فر کے چہرے کو دیکھنے لگے جو حد سے زیادہ سنجیدہ ہی ہوتا تھا۔

''وہ لڑکیاں بھی اور ہوتی ہیں مجھے جانا بھی کہاں ہوتا ہے گھر پر ہی تو ہوتی ہوں۔'' اس نے وضاحت دی۔

''تم فکر نہیں کرو میں تمہیں جلد گھر لے جاؤں گا اس کے لیے مجھے ذرا گھر کا ماحول ٹھیک کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے تمہاری خبر سن کے شاک بھی لگے۔'' وہ اس سے کہتے ہوئے نگاہ بھی چرا رہے تھے۔

''آپ سے میں کہہ بھی نہیں رہی کہ آپ مجھے گھر لے جائیں۔ میں یہاں ہی خالہ اور شہوار کے ساتھ خوش ہوں۔''

''نہیں بیٹا میں تمہیں اپنے پاس رکھوں گا بس تمہارے ابو کو کچھ وقت چاہیے۔''

''آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں میں آپ سے کہہ بھی کب رہی ہوں آپ مجھے لے کے جائیں۔'' زبیدہ خالہ ان کے لیے چائے اور لوازمات لے آئی تھیں۔ شکیل احمد خاموش ہو گئے تھے نیل فر نے ٹرے لے کے سینٹرل ٹیبل پر رکھ دی۔

''ارے آپ نے خوامخواہ تکلیف کی یہ سب نہیں کیا کریں۔''

''ارے بھیا اتنے دن بعد آئے ہو اتنا تو کر سکتے ہیں اور کون سا ہمارا خرچ ہوتا ہے آپ ہی دیتے ہو ناں۔''

''ایسی بات نہیں کریں آپ سب میرے ہیں۔ اپنوں پر خرچ کر کے جتایا نہیں جاتا۔'' وہ الٹا شرمندہ ہوئے۔

شکیل احمد نے ایک فلیٹ لے کے دیا ہوا تھا جہاں رانی کو رکھا ہوا تھا فرنشڈ فلیٹ تھا ہر سہولت تھی۔

نیل فر نے چائے بنا کے ان کے آگے رکھی زبیدہ تو چلی گئی تھیں۔

''بیٹا! آج کل ضیاء نے بزنس اور آفس سنبھالا ہوا ہے میں خاصا مصروف تھا کچھ فرصت ملی تو چلا آیا۔''

''میں نے آپ سے کچھ کہا آپ کا جب دل چاہے آجایا کریں۔'' وہ انہیں شرمندہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

''اچھا یہ پیسے رکھو تمہیں اور شہوار کو جو ضرورت ہو مارکیٹ چلی جانا گاڑی میں بھیج دوں گا ٹیکسی رکشہ میں

جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ابو! مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔" وہ پیسے لینے سے ہچکچا رہی تھی۔

"چپ کر کے رکھ لو ہوسکتا ہے شہوار کو ضرورت ہو اچھا ہے چلی جاؤ گی تو اس کی بھی شاپنگ ہو جائے گی۔" شکیل احمد نے خاصی کثیر رقم اس کی مٹھی میں دبائی۔

"ابو! رہنے دیں۔"

"چپ کرو۔" انہوں نے پیار بھری ڈانٹ پلائی۔

شکیل احمد چند گھنٹے گزار کے چلے گئے تھے اور اسے پھر بھی نیا انتظار دے گئے تھے۔

"انکل کے جانے کے بعد تم اور زیادہ اداس ہو جاتی ہو۔" شہوار نے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھا۔

"کیا کروں میں پھر۔" اس نے اس کی جانب دیکھا۔

"کبھی ہنس بھی لیا کرو۔"

"بلاوجہ ہنسنے والوں کو لوگ پاگل کہا کرتے ہیں۔" اس نے شہوار کے سر پر ہاتھ مارا۔

"تم ویسے بھی مجھے پاگل ہی لگتی ہو۔"

"اچھا!" اس نے تکیہ اٹھا کے شہوار کے سر پر دے مارا۔

دونوں کا مشترکہ کمرا تھا اور خاصا آراستہ بھی تھا خوب صورت بیڈ اور نفیس پردے پڑے تھے۔ ایک سے ایک قیمتی سامان تھا۔

"سنو شہوار! کل شاپنگ پر چلیں گے ابو گاڑی بھیج دیں گے۔"

"کل یونیورسٹی نہیں جاؤ گی؟" وہ پوچھنے لگی۔

"نہیں کل کی تم بھی یونیورسٹی کی چھٹی کر لو تو میرا تو ویسے بھی پہلے ہی موڈ نہیں ہے۔"

"نیل فر دیکھ لو تم ہی زیادہ چھٹیاں کر رہی ہو۔ لاسٹ ایئر ہے۔" وہ اسے بتانے لگی۔

"ہونے دو میرا دل نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے پھر میں بھی کر لیتی ہوں لیکن اسائنمنٹ دینا تھا۔"

"اچھا ٹھیک ہے تم چلی جانا میرا بھی اسائنمنٹ لے جانا تمہارے آنے کے بعد چلیں گے۔" وہ خود پھر بولی۔

☆......☆

اس کی واپسی حیدر آباد سے ہوگئی تھی اس نے سوچا گھر میں کنول بھی ہوگی کچھ تو گھر لے کے جائے اس لیے گاڑی اس نے شاپنگ سینٹر کے آگے روک دی۔ کنول اور امی کے لیے سوٹ لینے کا ارادہ کیا کنول کا موڈ بھی تو ٹھیک کرنا تھا۔

وہ دکانوں سے دیکھ کر گزرتا جا رہا تھا مگر اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کبھی لیڈیز شاپنگ کی بھی تو نہیں تھی۔

مسٹرڈ پینٹ پر بلیو شرٹ میں وہ ڈیسنٹ سا کھڑا اچوائس ہی کر رہا تھا۔

اسی وقت حواس باختہ نیل فر اس کے شانے سے ٹکرائی تھی۔

"کیا وحشت ہے۔" وہ مڑا تھا۔

لائٹ انگوری پرنٹڈ کپڑوں میں ملبوس وہ ہرنی جیسی آنکھوں والی جانے کسے دیکھ کے بھاگ رہی تھی۔

"سوری۔" وہ گرتے گرتے بچی تھی۔

''محترمہ ہوا کیا ہے؟'' فہر کے ہاتھ میں شاپر تھے وہ گر گئے تھے۔ وہ پہلے جھک کے اٹھائے۔
''جی کچھ نہیں۔'' وہ آگے بڑھنے لگی تھی۔
فہر نے کاندھے اچکائے وہ پھر دکان کے اندر گھس گیا۔ پانچ چھ سوٹ لیے اور دیگر مختلف شاپنگ بھی کی اور باہر آ گیا۔ دیکھا تو وہ پری پیکر گھبرائی پریشان کھڑی جانے کسے تلاش کر رہی تھی۔
''محترمہ! خیریت تو ہے آپ کی کیا چوری ہو گئی ہے۔''
''جی...... جی نہیں۔'' وہ آنکھوں میں ناگواری لا کے اسے دیکھنے لگی۔
نیل فر کسی دکان پر ڈریس دیکھنے لگی تھی۔ شہوار جانے کہاں نکل گئی تھی اور وہ اسے ہی ڈھونڈ رہی تھی۔
فہر کو جانے کیوں وہ پریشان گھبرائی ہرنی لگ رہی تھی۔ بناوٹ و تصنع سے اس کا چہرہ پاک تھا۔
''تھینک گاڈ! تم مل گئیں کہاں تھیں؟'' شہوار اسے دیکھ کر لپٹ گئی۔
فہر دو قدم پیچھے ہو گیا۔
''کہاں نکل گئی تھیں۔'' نیل فر نے غصے سے پوچھا۔
''ارے وہ میری کلاس فیلو وحینہ نظر آ گئی تھی۔ اس سے بات کرنے کے لیے رک گئی تھی۔''
''آپ کی تعریف؟'' شہوار نے ہینڈسم سے فہر کو مخاطب کر لیا جو ابھی تک وہیں تھا۔
''یہ پریشان کھڑی تھیں میں تو پوچھ رہا تھا ان سے خیریت تو ہے۔''
''ہاں اسی بہانے بات کر لیتے پھر گھر کا ایڈریس پوچھ لیتے آپ مردوں کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔'' شہوار اس پر چڑھ دوڑی۔
نیل فر نے اس کے بازو پر دباؤ ڈال کے روکا۔ ''سنیے خاتون! میں ایسا فضول آدمی نہیں ہوں جو لڑکیوں کے پیچھے بھاگوں یہ مجھ سے ٹکرائی تھیں میں سمجھا ان کے کوئی پیچھے لگ گیا ہے انسانیت کے ناطے پوچھنے لگا۔'' فہر کو ایک دم ہی غصہ آنے لگا۔
وہ شاپنگ سینٹر کی راہداری میں کھڑے تھے۔ لوگوں کی استفہامیہ اور تنقیدی نگاہوں نے تینوں کو ہی پزل کر دیا تھا۔
''اچھا یہ اس نے کہا تھا کہ کوئی پیچھے لگ گیا ہے۔''
''شہوار کیا ہو گیا ہے؟'' نیل نے اسے ٹوکا۔
''نیل فر تو نہیں جانتی ان لڑکوں کو موقع چاہیے۔''
''خاتون مجھے معاف کریں میری توبہ، بائے۔'' فہر نے اپنا سر پیٹ لیا وہ کیوں مخاطب ہوا اس بلا سے۔
''سوری!'' نیل فر نے ہی معافی مانگی۔
وہ اونہہ کر کے آگے بڑھ گیا۔ عجیب بدمزہ ہو گیا تھا۔
''لڑکیوں کی زبان کیسی قینچی کی طرح چلتی ہے۔'' وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔
''فہر صرف وہ لڑکی یہ لڑکی نہیں ہرنی جیسی آنکھوں والی۔'' اندر سے کوئی بولا۔
اس نے گاڑی کو ٹرن کیا تو وہ دونوں بھی گاڑی میں نظر آئیں۔
''یہ گاڑی اور ڈرائیور تو ماموں جان کا ہے۔'' فہر چونک گیا۔
ان دونوں کی گاڑی آگے بڑھ گئی تھی مگر اس کا دماغ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا پورے راستے وہ اس لڑکی کو

سوچتا رہا جو اس سے ٹکرائی تھی۔

''نیل فر نام کیسا انوکھا سا لگ رہا تھا۔''

''لو جی ہیرو کی واپسی ہو گئی ہے۔'' مہاد نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر ہانک لگائی۔

کنول ابھی موجود تھیں اسے دیکھ کر ناراضی دکھانے لگیں۔

''آ گیا میرا بچہ۔'' زہرہ نے تو اس کا ماتھا چوم لیا۔

فہر نے سلام دعا کے بعد کہا۔

''امی جلدی سے کھانا لگوا دیں، بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے سارے شاپرز کنول کے قدموں میں ڈال دیے۔

''یہ کیا ہے؟'' سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''دیکھ لیں آپ کے اور امی کے لیے لایا ہوں۔''

''حیرت ہے۔'' کنول شاپرز اٹھائے چیزیں نکالنے لگیں مگر یہ کیا اس میں سے تین چار بیگز سینڈل کے ڈبے اور دیگر جیولری بھی نکلی۔

''یہ سب تم امی اور میرے لیے لائے ہو۔ کنول حیران ہو رہی تھیں۔

ان سے زیادہ حیران فہر ہو رہا تھا اس کے بھی تو شاپر تھے۔

''یہ بھی تو کھولیں۔'' اس نے دوسرا بڑا شاپر اٹھایا اس میں اس کا خریدا ہوا سامان تھا۔

''یہ آپ کے اور امی کے لیے چند سوٹ ہیں۔''

''اور یہ کس کے لیے ہیں۔'' کنول کو تو اس کے پیچھے لگنے کا موقع چاہیے۔

''یار! پتا نہیں کس کا آ گیا۔'' فہر بوکھلا بھی گیا تھا مگر اسے سب سمجھ آ گیا تھا اس نے اس لڑکی کے بھی شاپرز اٹھا لیے تھے جو اس سے ٹکرائی تھی اس کے اور فہر کے شاپرز بھی گرے تھے۔

''اچھا تب ہی وہ بار بار مجھے دیکھ رہی تھی۔'' وہ سر پکڑ کے رہ گیا۔

''امی، امی دیکھیں اس نے ضرور کر رکھی ہے شادی۔''

''یار! آپی خدا کو مانیں وہاں دکان میں اور لوگ بھی تھے ہو سکتا ہے بے دھیانی میں، میں نے یہ شاپرز اٹھا لیے ہوں۔'' وہ صفائی دینے لگا۔

''ویسے بھائی وہ دیکھنے میں کیسی تھی۔'' مہاد کو بھی اسے چھیڑنے اور تنگ کرنے کا موقع مل گیا۔

''یار تم بھی شروع ہو گئے۔'' اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کرے۔ زہرہ تو ہنس رہی تھیں۔

''امی! میرا یقین کریں یہ غلطی سے آ گئے ہیں۔'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''کنول ہو سکتا ہے غلطی سے آ گئے ہوں۔''

''ارے ہاں یاد آیا ماموں جان کا ڈرائیور ان لڑکیوں کو لے کے جا رہا تھا۔ یہ سامان اس کے ذریعے ہی جا سکتا ہے۔'' فہر کے دماغ میں خیال آیا مگر اس نے ان لوگوں کے سامنے کہنے سے گریز کیا۔

''ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو۔''

''آپی یار کیا ہے ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ جلدی ہی اکتا گیا ایک تو دو ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیونگ سے وہ تھک گیا تھا یہاں تو الٹی آفتیں گلے پڑ گئی تھیں۔

کھانا کھا کے وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا تھا۔

اس پری پیکر کا خیال بار بار آرہا تھا۔"

"نیل فر۔" اندر بازگشت ہوئے جارہی تھی۔

"پورا وقت وہ نہیں بولی اور اس کے ساتھ والی کی زبان چلے جارہی تھی۔

نہا دھو کے وہ لیٹ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھ بھی لگ گئی۔

شام میں سو کے اٹھا تھا اس کی طبیعت اور مزاج فریش تھا کنول اور بچے نظر نہیں آرہے تھے۔

"امی! آپی کہاں ہیں؟"

"چلی گئی شعیب کی کال آگئی تھی۔ انہیں کہیں جانا تھا اس لیے چلی گئی۔"

"ناراض ہو کے گئی ہیں۔" بہن کی فکر بھی ہوئی تھی۔

"نہیں تو اور ہاں وہ تمہارے لائے ہوئے سوٹ لے گئی ہے اگر ناراض ہوتی تو چھوڑ کے جاتی۔" مسکرا کے بولیں۔

فہر نے ہال کمرے میں بیٹھ کے وہاں کا ٹی وی آن کر لیا تھا۔ کافی دنوں سے ٹی وی بھی نہیں دیکھا تھا۔

"میں تمہارے ابو کے لیے چائے بنا رہی ہوں۔"

"جی۔" اس نے اسکرین پر نگاہ جمائے کہا۔

فہر کا ذہن و دل تو اس پری پیکر میں الجھا ہوا تھا۔

☆......☆

"اے لڑکی کبھی ٹانگوں کو بھی آرام دے لیا کر۔" دادی جان نے اسے اوپر جاتے دیکھا۔

"دادی جان! میں تو شہریل کو بلانے جارہی تھی۔" اس نے کہا۔

"ہر وقت اسے تنگ نہیں کیا کر سنجیدہ بچہ ہے کبھی اسے بھی آرام کرنے دیا کر۔" رحمت بی بی کو اس کی بڑی فکر ہوتی تھی۔

"ہاں سنجیدہ بچہ ہے میں تو جیسے کٹ کھنی ہوں۔" وہ برا مان کے ان کے پاس ہی آکے بیٹھ گئی۔

"کتنی زبان چلتی ہے۔" وہ تاسف سے گویا ہوئیں۔

"کس کی زبان چلتی ہے؟" منیب احمد نے پوچھا۔ ماہا انہیں دیکھ کر سنبھل گئی۔

"بابا! میں تو اس شہریل کو اپنی فرینڈ کے ہاں لے جارہی تھی۔ وہ دیکھیں اوپر بھاگ لیا۔" وہ غصے سے بول رہی تھی۔

"بیٹا! ہر کام کے لیے اسے نہیں بولا کرو اتنے کاموں میں بزی رہتا ہے۔"

"سب اسی کی سائیڈ لیتے ہیں۔"

"دیکھا منیب بڑے چھوٹے کی بھی اس لڑکی کو تمیز نہیں اس سے کیسے بات کرتی ہے بڑا ہے بھائی کہہ لیا کرے۔"

"بس رہنے دیں دادی جان۔" وہ تو کلس گئی۔ شہریل کو بھائی بولے کبھی نہیں اس نے بچپن سے ہی اس کا نام لیا تھا اور اب بھائی لگانے کا سوال ہی نہیں۔

"تمہیں اگر اپنی فرینڈ کے جانا ہے تو ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ۔"

"ٹھیک ہے بابا ٹھیک ہے میں تو سوتیلی ہوں آپ کی۔" وہ بچوں کی طرح روٹھ کے چلی گئی۔

(جاری ہے)

عائشہ الیاس

مکمل ناول

پاگل عشق

تیز میوزک کی آواز کانوں کے پردے پھاڑنے کے برابر تھی، تیز میوزک کسی سرور کی طرح سب پر طاری تھا، گہرے اندھیرے میں ڈسکو لائٹیں جگ مگ کر رہی تھیں، نشے میں چور سب ناچنے میں یوں مست تھے کہ



لگتا تھا وہ کسی تقلید میں ہیں، رات کے آدھے پہر میں وہ سب دنیا و مافیہا سے بے خبر مست و مدہوش ہو چکے تھے ۔ وہ اردگرد سے بے خبر دونوں بالکل ایک کونے میں دیوار سے جیسے چمٹے ہوئے تھے ۔ وہ مکمل طور پر اس کے حصار میں تھی ۔ اس کا چہرہ صنف مخالف کے اتنے قریب تھا کہ وہ اس کی سانسوں کو محسوس کر سکتا تھا ۔ گرم سانس اور شوریدہ دھڑکنیں اس کے احساسات کا اظہار کر رہی تھیں ۔ اس نے بڑی نرمی سے اس کے نازک چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر اپنے چہرے کے قریب کر لیا تھا اس کی سحر انگیز قربت میں اس کا وجود بکھرنے لگا، اس کی سنہری آنکھوں میں اتنی تپش تھی کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا آپ مکمل طور پر اس کے حوالے کر دیا ۔ وہ مکمل طور پر اس کے اوپر جھکا ہوا تھا اور بغور اس کے چہرے کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی عکس ڈھونڈ رہا ہو، پر وہاں کوئی عکس نہیں تھا ۔ نہ کوئی شبیہہ وہ بس ایک خوب صورت مورتی معلوم ہوتی تھی جو اس کی قربت میں پگھل رہی تھی کوئی دھند تھی جسے دیکھ کر اس کی آنکھ برف سی ہو گئی تھی ۔ وہ پتھر کا سا بن گیا، اک سایہ سا دماغ کے پردے پر لہرایا تھا، اس کے پاس دنیا کے اس وقت سب رنگ موجود تھے ۔



پر اس کا وجود سیاہ بننے لگا۔ اس پر وہی مخصوص کیفیت طاری ہونے لگی تھی جس سے وہ ہر سو بھاگتا تھا، اس کا پورا وجود مختل ہو گیا۔ بے چینی اضطرابی ایک بار پھر غالب آ گئی تھی۔ دل یکدم سوختہ ہو گیا۔ ایک عجیب آہنی طاقت تھی جو پوری طرح اسے اپنے قابو میں کر چکی تھی۔ جسم اتنی ٹھنڈک میں بھی پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ دھڑکنوں کی آواز اتنی بے ہنگم تھی کہ وہ اردگرد کے شور سے غافل ہو گیا۔ اس نے برق رفتاری سے اسے خود سے الگ کیا تھا، جیسے اسے کوئی چھوت کا مرض لاحق ہو۔ اس کی روح کو کسی نے اندر تک جھنجھوڑ ڈالا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ اس کے یوں دھتکارنے پر حیرت سے دیکھا تھا جو اسے عجیب نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی سنہری آنکھیں شدت سے سرخ ہو گئیں تھیں۔ وہ ایک پل کے لیے گھبرا سی گئی۔

''شیث ......'' اس نے خوف سے لبریز لہجے میں اسے پکارا اس سے پہلے کہ وہ اس کی جانب بڑھتی وہ تیزی سے باہر نکل گیا تھا اور وہ حق دق سی اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔

☆......☆

وہ گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ ایک گہری سانس کے ساتھ اس نے اپنی بے ہنگم دھڑکنوں کو درست کرنے کی ناکام کوشش کی تھی اور پھر ہار کر اس نے آنکھیں بند کر کے سیٹ سے سر کو ٹکا دیا، تناؤ کی کیفیت اتنی شدید تھی کہ اس کے اعصاب پر مزید دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ بند آنکھوں کے پردے پر ایک عکس لہرایا تھا حزیں ملاحت زدہ آنکھیں جس کے لب جنبش کر رہے تھے، پھول کی ایک ایک پتی توڑ کر وہ اپنی جھولی میں ڈالتے ہوئے اسے ہی دیکھتے ہوئے مخاطب تھی۔

''میرے خیال میں تو ہر انسان کی زندگی میں ایک موڑ ایسا ضرور آتا ہے جس کے دو راستے نکلتے ہیں ایک صحیح اور ایک غلط اور ہمیں دونوں میں سے لازمی طور پر ایک چننا پڑتا ہے، پر اس وقت ہم ایسے حال میں ہوتے ہیں جب ہماری تمام صلاحیتیں دم توڑنے لگتی ہیں اور ہم اس قابل نہیں رہتے کہ ہم فیصلہ لے سکیں، بظاہر دیکھنے میں یہ صحیح اور غلط راستے ایک ہی جیسے لگتے ہیں پر یہی ہماری آنکھوں کا سب سے بڑا دھوکا ہوتا ہے، پھر ہمارا اصل امتحان شروع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ خدا بھی یہ فیصلہ ہم پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہمارا ایک غلط فیصلہ ہمیں سمندر کی آوارہ لہروں کی طرح لے جاتا ہوا ڈبو دیتا ہے اور اگر ہم صحیح فیصلہ لے لیں تو پھر ہمیں اپنے لیے کسی بھی چیز کے لیے تردد نہیں کرنا پڑتا، کیونکہ اس کی ہر راہ ہمیں خدا ہی دکھاتا ہے، پر زندگی کا اگر کوئی مشکل مرحلہ ہوتا ہے تو یہ راستہ چننے کے لیے ہی ہوتا ہے جس میں ناکام اور کامیاب ہماری نیتیں کرواتی ہیں۔'' وہ چپ ہو گئی اور اس کی گہری نگاہیں اسی کے چہرے پر مرکوز تھیں اور آگے سے وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

''تمہیں اتنا وقت مل جاتا ہے ایسی خشک باتیں سوچنے کا اور آج کے دور میں کون ایسی باتیں سوچتا ہے۔ یہ بزرگوں کا کام ہے انہیں سوچنے دو۔'' اس نے لاپرواہی سے اس کی جھولی میں سے پتیوں کو مٹھی میں بھر کر اٹھایا تھا اور بارش کی طرح اس پر برساتے ہوئے بولا تھا۔ آگے سے وہ پھیکا سا مسکرا دی تھی، جیسے اس نے بھی اس کی بات کو کسی خاطر میں نہ لیا تھا۔ عکس دھندلا گیا وہ بند آنکھوں کے پیچھے بھی اس عکس کے پیچھے بھاگنے لگا تھا، برف بنتے عکس سے اس پر جیسے ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی، اس کی آنکھوں کی پتلیاں بند آنکھوں میں بھی ایسی تیزی سے حرکت کرنے لگیں کہ وہ جیسے اسے ڈھونڈ لیں گی پر کوشش ناکام تھی۔ ناکامی کے سبب سینے میں جیسے دھواں اٹھنے لگا۔ کنپٹیوں سے پسینے کے قطرے بہنے لگے جب کہ منہ اور گردن عرق آلود ہو گئی، اضطرابی اتنی بڑھنے لگی کہ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول لیں، سیویم تیزی سے کلب سے باہر آ رہی تھی۔ اس کا موڈ

سخت آف ہو چکا تھا۔ آج جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا اگر اس کی جگہ کوئی اور اتنی تذلیل کرتا، تو اس نے حشر نشر کر دینا تھا اس کا۔ پر یہاں وہ تھا جس کی کنیز وہ خود بن گئی تھی اس کی دل کی سلطنت کا وہی بادشاہ بن بیٹھا تھا۔ اس کی یہ حالت اس سے مخفی نہ تھی۔ یہاں لانے کا مقصد بھی تو یہی تھا۔ کسی طرح وہ اس خول سے باہر نکل جائے، پر سب بے سود تھا۔ گاڑی کا جب اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اس کی حالت دیکھ کر اس کی ناراضی اڑن چھو ہو گئی تھی وہ فکر مندسی اس کی جانب بڑھی۔

''آر یو او کے نیٹ؟'' اس کی عرق آلود پیشانی پر اس نے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''ٹھیک ہوں میں۔'' اس نے ہاتھ پیچھے ہٹایا تھا اس کا اس نے لب بھینچ لیے تھے ضبط کرتے ہوئے۔

''اگر تم ٹھیک نہیں ہو تو ڈرائیو میں کر لیتی ہوں۔'' اسے گاڑی اسٹارٹ کرتا دیکھ کر وہ بولی۔

''نہیں میں کر لوں گا۔'' وہ سفاک سا بولا کہ وہ چپ ہو گئی۔ ایک گہری خاموشی دونوں کے بیچ اتر آئی۔ وہ چپ چاپ بیٹھ گئی اور رخ باہر ونڈو کی جانب کر لیا تھا جس ویک اینڈ کو وہ آج خوب صورت بنانا چاہتی تھی اس کا اختتام کچھ یوں ہو گیا تھا۔ اسے گھر ڈراپ کرتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ بولا تھا۔ نہ کوئی معافی نہ افسوس سپاٹ سا گاڑی کو ہوا کے زوروں پر اس کے پاس سے لے جا اڑا تھا۔ وہ غصے میں لبوں کو بھینچتی ہوئی اندر چلی گئی تھی۔



اس وقت وہ میلبورن کی کوئینز فوڈ اسٹریٹ کے ایک لوکل ایریا میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ جس جگہ وہ بیٹھا تھا وہاں روڈ کے دو اطراف میں ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ کئی ریسٹورنٹ والوں نے ریسٹورنٹ کے باہر کرسیاں اور ٹیبل لگا کر بیٹھنے کا انتظام کیا تھا۔ اس اسٹریٹ میں لوگوں کا کافی رش ہوتا تھا۔ چونکہ لنچ ٹائم تھا تو رش اور بھی زیادہ تھا۔ موسم کے خوشگوار ہونے کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم باہر کی ٹیبلز کی طرف تھا۔ وہ خود بھی باہر ہی بیٹھا تھا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہ اس نے صبح کا ناشتا کیا تھا اور نہ ہی ابھی بھوک کے کوئی آثار تھے۔ رات بھر سے جاگ رہا تھا اور اب پورا جسم درد کر رہا تھا۔ گھر اور آفس دونوں جگہ پر اس کا دم گھٹتا تھا۔ لہٰذا سب سے دور وہ یہاں آ بیٹھا۔ کافی کے سپ لیتے ہوئے اس کا دماغ کل رات والی کیفیت میں الجھا ہوا تھا۔ رات سے اب اسے خوف آنے لگا تھا۔ اس کی یہ کیفیت رات میں زیادہ عروج اختیار کرتی تھی۔ اندھیری رات کا اندھیرا اسے اپنے اندر بھسم کر لیتا تھا۔ کیا تھا اس کا علاج؟ سوال یہ ہی سب سے مشکل تھا۔ اس کی طبیعت میں دن بہ دن چڑچڑاہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اسی چڑچڑاہٹ کے سبب آج اس نے فیکٹری کے ورکرز کو بلاوجہ ذلیل کر ڈالا تھا۔ بلاوجہ ان کے کام میں نقص نکال کر ان کی جان عذاب بنا دی تھی۔ ساتھ خود کو بھی مزید پریشان کر ڈالا تھا۔ اپنی اس کیفیت میں اسے اکیلا رہنا پسند تھا اور آج اس کا ارادہ بھی یہی تھا۔ ابھی اس نے سوچا ہی تھا کہ سیویم کی کال آنا شروع ہو گئی۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی ریسیو کرنا پڑی تھی۔ ایک واحد وہ تھی جس کے اس کے اوپر بے پناہ احسانات تھے۔



''کہاں ہو تم پورا آفس چھان مارا ہے میں نے۔'' کال ریسیو ہوتے ہی چھوٹتے ہی اس نے سوال داغا، پر اس کے چہرے پر کوئی تاثر نمودار نہ ہوا۔

''کوئینز اسٹریٹ پر ہوں۔''

''وہاٹ! میرے بغیر تم کیسے چلے گئے شیث! اور میں کب سے لنچ کے لیے تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔'' وہ ایک ہی سانس میں بولی جواب میں وہ کچھ نہ بولا۔ اس وقت اس کا کوئی موڈ نہ تھا وہ اسے سن رہا تھا یہی بہت بڑی بات تھی۔
''اچھا لنچ کر لیا تم نے؟'' ہار کر بات اس نے خود ہی بڑھائی۔
''نہیں۔'' وہ مختصر بولا۔
''پھر ٹھیک ہے میں آ رہی ہوں، دونوں ساتھ لنچ کریں گے۔'' وہ پر جوش سی بولتی فون رکھ کر تیزی سے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر آفس سے باہر نکلی تھی۔ وہ جتنا سب سے بھاگنا چاہتا، اتنا ہی مجبور ہو جاتا تھا اور آخر کو کیسی مجبوری یہ زندگی اسی کی تو منتخب کردہ تھی۔ پر اب یہ بیزاریت اس کی سمجھ سے باہر تھی۔
☆......☆
گاڑی پارک کر کے وہ مڑی سامنے ہی اس کی نظر اس پر پڑ گئی تھی جو ارد گرد سے بیزار کسی سوچ میں گم تھا۔ گرے ڈریس پینٹ پر بلیک شرٹ جس پر گرے ہی کلر کا ویسٹ کوٹ پہنا ہوا بالوں کو جیل کی مدد سے پیچھے کی طرف سیٹ کیا ہوا تھا۔ اس کے بال سلکی گھنے تھے، جب وہ جیل نہیں لگاتا تھا تو چھوٹے چھوٹے بال ماتھے کی طرف ڈھلک آتے، جنہیں اکثر وہ بے تکلفی سے سنوارتی، کھڑے نقوش کسرتی جسامت بلاشبہ وہ ایک خوب صورت مرد تھا، اس کی خوب صورتی میں سب سے حسین اس کی سنہری آنکھیں تھیں جن میں بے پناہ خاموشی رقم تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکراتی ہوئی اس کے ٹیبل کی طرف بڑھی تھی۔ اس کی آمد پر اس نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی تھی چست بلیو جینز پر اس نے وائٹ کلر کی ریشمی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جس کے گلے اور آستینوں پر وائٹ ہی کلر کی فرل کا ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ سنہرے ریشمی بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائی ہوئی تھی۔ کانوں میں وائٹ ہی کلر کے موتی جتنے ٹاپس پہنے ہوئے ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔
''بہت بدتمیز ہو تم میرے بغیر تم یہاں کیسے آ سکتے ہو؟'' وہ آئی گلاسز سر پر چڑھاتے ہوئے ساتھ ہی چیئر کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی تھی مگر اس کی خاموشی ہنوز تھی اب اسے عادت سی ہو گئی تھی۔ اس کے اس انداز کی جبھی وہ برا کم ہی مناتی۔
''اچھا بتاؤ تم نے کچھ آرڈر کیا؟'' وہ مینو کارڈ پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔
''پلیز سیویم! تم نے جو منگوانا ہے، منگوالو اپنے لیے پر میرے لیے کچھ آرڈر مت کرنا۔'' اس سے پہلے وہ کچھ آرڈر کرتی اپنے لیے اس نے صاف انکار کر دیا۔ سیویم نے اسے بغور دیکھا تھا جس کے چہرے پر تھکن اور لہجے میں چڑچڑاہٹ واضح تھی۔ وہ چند ثانیے اسے تکتی رہی پھر سر جھٹک دیا بنا کسی خیال کے۔
''کھانا تو تمہیں ضرور کھانا پڑے گا، میں تمہاری پسند کی گرل فش آرڈر کر رہی ہوں۔'' وہ لہجے میں مسکراہٹ سموئے ضدی انداز میں بولی۔ جب کہ اس کے چہرے پر مزید بیزاریت طاری ہو گئی۔ آخر کو اس نے فش منگوا لی اس کی پلیٹ میں زبردستی ڈال بھی دی لیکن پھر بھی وہ دو چار لقموں سے زیادہ نہ لے سکا۔
''کیا ہو گیا ہے شیث! تمہیں ٹھیک سے کھاؤ۔'' وہ اسے دیکھ کر فکر مندسی بولی۔
''میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا مجھ سے نہیں کھایا جائے گا۔'' اس نے پانی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔
''اس طرح تم بیمار پڑ جاؤ گے۔'' اس کی بات پر وہ بے دردی سے مسکرایا تھا۔
''بڑا ڈھیٹ ہوں نہیں پڑوں گا بیمار۔''

''ہمیشہ فضول بولنا۔''وہ منہ بنا کر بولی۔

''اور تم بھی جلدی کرو۔ ویسے بھی لنچ کا وقت ختم ہونے والا ہے اور آفس پہنچنا ہے اب۔''وہ اب کسی کو بھی خاطر میں لائے بغیر بولا۔

''نہیں تم آفس نہیں جاؤ گے میں نے پاپا سے بات کرلی ہے۔''اس نے اب نیا آرڈر جاری کیا۔

''کیا مطلب؟''وہ حیران ہوا۔

''مطلب یہ کہ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ سو تم آفس نہیں جاؤ گے آج۔''وہ پرسکون سی بولی۔

''میں نے تمہیں کہا ناں میں ٹھیک ہوں۔''وہ اکتا کر بولا۔

''جی نہیں کوئی ٹھیک نہیں ہو اس لیے میں نے ڈیسائیڈ کیا ہے، تمہارا موڈ فریش کرنے کے لیے آج ہم صرف گھومیں پھریں گے۔''پرجوش سی اس نے اپنے خیال بیان کیے اور کوفت سے اس کا مزید برا حال ہو گیا۔

''پلیز! میرا کوئی موڈ نہیں ہے کہیں بھی جانے کا۔''اس نے فوراً دوٹوک کہا۔

''شیٹ پلیز! ہر بار تم اپنی من مانی کرتے ہو، جبھی اس حال میں ہو مجھے کچھ معلوم نہیں، جہاں میں لے جاؤں گی وہاں جانا پڑے گا یہ میرا فائنل فیصلہ ہے۔''وہ بھی دوٹوک بولی تھی جب کہ وہ پتھر کا سا بنا بیٹھا رہا۔

''چلو اب اٹھو بھی۔''وہ بل پے کر کے آئی اسے جوں کا توں بیٹھا دیکھ کر پرزور سی بولی۔ وہ ہار کر اٹھ گیا۔

''کہاں جانا ہے؟''ڈرائیو کے دوران اس نے پوچھا تھا۔

''یار ریسور۔''اس کے جواب پر اس نے اسے دیکھا تھا۔ جو اسے ہی دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا اس نے جان بوجھ کر وہ جگہ ڈیسائیڈ کی تھی۔ وہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی بے شک اور وہ سوچتی تھی وہ اسے وہاں لے جا کر شاید اسے ہر چیز سے آزادی دلا دے گی۔ اس کی سوچ پر وہ پھیکا سا ہنس دیا۔ سب بے کار تھا لاحاصل اس کیفیت سے آزادی پانا ناممکن تھا۔ وہ اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔ محبت کا وہ اپنا سفر طے کر چکی تھی جہاں سے اس کا پیچھے ہٹنا بھی ناممکن تھا۔ حالانکہ اسے کبھی مثبت جواب نہ ملا تھا۔ سارا سفر خاموشی کی نذر ہوا تھا۔ گاڑی پارک کر کے وہ دونوں کوئینز برج کی طرف بڑھے تھے۔ کوئینز برج کے ساتھ یار اریسور کا بہتا پانی ایک خوب صورت منظر تھا۔ دریا کے دائیں طرف برج تھا جس کے ساتھ ہی تھوڑی اونچی سی جگہ پر گھاس کی تہہ بچھی ہوئی تھی، جہاں اکثر و بیشتر لوگ بیٹھ کر دریا کے خوب صورت مناظر کو اپنے اندر تک اتار لیتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لگے گھنے ہرے بھرے درخت ماحول کو تروتازہ کر دیتے تھے وہاں تفریح کے لیے بہت کچھ تھا۔ لوگ دریا میں بوڈنگ کرتے آرام کے لیے بینچوں کا انتظام تھا۔ ساتھ ہی قریب بنے ریسٹورنٹ میں کھانے پینے کا انتظام لوگوں کو اپنی جانب کھینچتا چونکہ آج ورکنگ ڈے تھا اس لیے لوگوں کا ہونا نہ ہونے کے برابر تھا اور اس وقت تھا بھی لنچ کا وقت اس لیے لوگوں کا ہجوم ریسٹورنٹس کی طرف تھا۔ وہ یہاں آکر واقعی بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ یہاں کی خاموشی اسے اندر تک پرسکون کر دیتی تھی۔ بہتے دریا کی ٹھنڈی مترنم آواز، درختوں پر پرندوں کی چہچہاہٹ بے پناہ خاموشی میں موسیقی کا کام کرتی تھیں۔ وہ کبھی بھی تنہائی پسند نہ تھا۔ لوگوں کے ہجوم قہقہے رنگارنگ محفلیں سب اس کے شوق رہے تھے۔ پر اب پہلے جیسا کچھ بھی نہ رہا تھا۔ وہ ظاہر اور باطن یکسر طور پر بدل گیا تھا یا نہ جانے زندگی بدل گئی تھی۔ پر زندگی بھی نہیں بدلتی بس لوگ اور ان کے اعمال سب بدل دیتے ہیں۔ وہ کہیں دور جا کر سب

سے چھپ جانا چاہتا تھا۔ تنہائیوں کو اپنا ساتھی بھی اس نے خود ہی بنالیا تھا۔ بڑا عجیب ہوتا ہے تب جب آپ چاہتے کچھ ہوں اور کرتے کچھ ہوں، شاید تکلیف وہ بھی ہوتا ہے بلکہ بہت زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے اس کا اندازہ تب زیادہ محسوس ہوا تھا جب وہ خود اس دوراہے سے گزر رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے مجھے یہ جگہ کچھ خاص پسند نہیں ہے۔ پر اگر مجھے تمہارے ساتھ یوں چلنا پڑے پھر تو ہر روز میں یہاں آؤں۔'' وہ اس کے کندھے سے سر ٹکائے اور دائیں بازو میں اپنا ہاتھ ڈالے اس کے ساتھ جڑی چل رہی تھی۔ لہجہ اس کا جذب سے بھرپور محبت میں ڈوبا ہوا تھا۔ بلاشبہ وہ اس سے بے پناہ محبت کرتی تھی اور اس کی محبت میں اس کے لیے خلوص، سچائی، ایمانداری ہر رنگ موجود تھا۔ وہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ حالانکہ اس کی پیدائش مغرب میں ہوئی تھی۔ پلی بڑھی بھی یہیں پر اس معاملے میں وہ مغرب کی تقلید میں نہیں چلی تھی۔ اس نے اسے پہلا اور آخری ہی سمجھا تھا اس حقیقت کا اندازہ شیث کو تھا جبھی آج وہ باآسانی یہاں تھا۔ پر بیچ میں آج بھی ایک دیوار حائل تھی۔ وہ یہاں تھا اس کے ساتھ کو اپنایا پر اس کی محبت کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ وہ چاہتا تھا وہ اسے پورے دل سے قبول کرلے پر نہ جانے کیا ایک آہنی طاقت اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھی اور پھر وہی بات آجاتی۔

''جو چاہتا وہ کر نہ پاتا۔'' اس کے لیے اذیت کا سب سے بڑا مرحلہ تھا یہ۔

''شیث!'' اس کی گہری خاموشی پر اس نے اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پکارا جواب میں اس نے ہولے سے ''ہوں'' کہنے پر ہی اکتفا کیا۔ وہ اس سے الگ ہوکر اس کے سامنے آٹھہری وہ بھی تھم گیا۔

''مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔'' اس کے لہجے میں سنجیدگی عود آئی۔

''بولو۔'' وہ بغور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''پہلے تم وعدہ کرو میری ہر بات کا جواب دو گے۔ کسی بھی بات کو گھماؤ گے نہیں۔'' وہ اس کی عادت سے واقف تھی جبھی وارن کردیا۔

''ایسی بھی کیا بات ہے؟'' وہ گھنے سایہ دار درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

''نہیں بس تم پہلے وعدہ کرو۔'' وہ بضد تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے وعدہ۔'' اسے معلوم تھا ہار کر اس کی بات ماننا ہوگی، پہلے وہ کچھ دیر خاموش رہی شیث کی نگاہ اس کے پرسوچ چہرے پر تھی اسے اندازہ تھا وہ کیا بات کرے گی جو وہ اس کے ساتھ کر رہا تھا اس کے بعد اس کا ایسا سوچنا ممکن تھا۔

''تمہیں میلبورن آئے ہوئے ڈیڑھ سال ہوچکا ہے۔ جب تم آئے تھے تب کے اور اب کے شیث میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم یہاں اپنی مرضی سے بخوشی آئے تھے تو پھر تمہیں اب کیا ہوگیا ہے؟ کوئی مسئلہ ہے تو مجھ سے شیئر کرو۔'' وہ متانت سے بولی۔ اس کے سوال پر اب کیا جواب دیتا۔ یہ اس سے بڑا سوال تھا۔ اس کی نگاہیں دریا کے بہتے پانی پر منجمند ہوگئیں۔

''تمہارے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ کیونکہ جو بات میں خود نہیں جانتا تو تمہیں کیا جواب دوں۔'' اس کا لہجہ برف کی طرح منجمند تھا اور چہرہ ہر تاثر سے پاک۔

''کل رات جو تمہاری کیفیت تھی، اس سے صاف پتا چلتا ہے تم ذہنی دباؤ کا شکار ہو، میری مانو تو تمہیں کسی اچھے سے سائیکاٹرسٹ سے کنسلٹنٹ کرنا چاہیے دیکھنا تم بالکل ٹھیک ہوجاؤ گے۔''

''تمہیں لگتا ہے میں ذہنی مریض بن گیا ہوں۔'' وہ اس کی بات پر شرمندہ سی ہو گئی۔

''میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔'' اس نے فوراً صفائی دی۔

''نہیں میں شاید واقعی ذہنی مریض بن گیا ہوں۔'' اپنی ہی بات کی اس نے تائید کی تھی۔ وہ دو قدم آگے بڑھی اور نرمی سے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

''تم بیمار نہیں ہو، تم نے اپنے گرد آسودگی کا دائرہ خود ہی تنگ کر لیا ہے اور اس سے آزادی تمہیں خود ہی حاصل کرنا ہوگی۔ شیث! میں نے تم سے سچی محبت کی ہے اور میں تمہیں ایسے تکلیف میں جلتا نہیں دیکھ سکتی تم جانتے ہو ناں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کچھ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی تھی اور اس کی سوچ کہیں اور ہی پرواز کر رہی تھی۔ پھر وہ کچھ نہ بولا۔ خاموشی پھر طاری ہو گئی۔ وہ بولتی جاتی اور وہ چپ چاپ سنتا رہا، زندگی کی خوشبوئیں نا پید ہو گئی تھیں۔ اس کی ناؤ ایسے گرداب میں جا پھنسی جس کا نکلنا اب ناممکن تھا خشک یخ بستہ ہواؤں نے اسے کسی پت جھڑ کے شجر کی طرح خشک بنا دیا تھا۔ جن حوصلوں کو تلاشتا تھا وہ...... وہ تو کب کے گنوا چکا تھا۔ وہ کسی ربوٹ کی طرح اس کے ساتھ گھومتا رہا۔ یوریکا اسکائے ڈیک کی بلند و بالا عمارت میں وہ یوں کھڑا تھا جیسے اس کا وجود بیچ خلا میں لٹک گیا ہو۔ جب کہ وہ شیشوں کے پار میلبورن سٹی کی جگمگاہٹوں کو اپنے اندر اتار رہی تھی۔

''شیث! دیکھو کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔'' وہ شیشے پر ہاتھ دھرے اپنے قدموں تلے شہر کی جگمگاہٹوں کو خیرہ ہوتی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی جواب میں وہ صرف پھیکا سا مسکرایا تھا۔ وہ بھی زبردستی اسے قطعی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی ان نظاروں سے وحشت اتر رہی تھی تو اس بات سے کہ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ راتیں اسے اب راس نہیں آتی تھیں۔ شب ریجور اسے خوابیدہ ہی کیے رکھتیں، بس ایک خواہش تھی کہ جو رات آنکھوں میں کٹتی ہے، زندگی بھی کچھ ایسی ہی مختصر ہو جائے اور اس کی زندگی اس رات میں ہی کٹ ہی جائے۔



ویک اینڈ پر سیویم نے اسے ڈنر پرانوائیٹ کیا ہوا تھا۔ شاید وہ کبھی نہ آتا اگر زاہد بیگ کا وہ ڈراوانہ دیتی ایسے پتا تھا وہ ان کی اتنی عزت کرتا ہے کہ کبھی انکار نہیں کرے گا۔ وہ ڈنر کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ جب کہ وہ زاہد بیگ کے ساتھ بیٹھا بزنس پر ہی ڈسکیشن کر رہا تھا۔

''سر! میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ ابھی پارٹنر شپ کو اوائیڈ ہی کریں۔'' اس نے متانت سے کہا۔ مسٹر بیگ نے سگار کا دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے اس کی بات پر غور کیا تھا۔

''ہوں...... میں بھی یہی سوچ رہا تھا، اس وقت مارکیٹ کا آرڈر پورا کرنا مشکل ہے۔ ایسے میں پارٹنر شپ رسک ہے۔'' وہ پرسوچ سے بولے تھے۔ مسٹر بیگ کی پیدائش آسٹریلیا کی ہی تھی ان کے والد نے میلبورن میں ہی ایک چھوٹی سی لیدر فیکٹری کی بنیاد رکھی تھی، جسے ترقی کی بلندی پر انہوں نے پہنچایا اور آج ان کی انتھک محنت کی وجہ سے مارکیٹ میں ان کی لیدر کی مانگ میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''جی سر! جہاں یہ فیکٹری کو مزید بلندی پر پہنچانے کا باعث بن سکتی ہے وہیں رسک کی صورت میں نقصان بھی ہو سکتا ہے۔''

''اسی لیے میں نے تو مسٹر جارج کو صاف منع کر دیا تھا، پر ان کا اصرار ہے، میں سڈنی آ کر ایک

باران کی آؤٹ لیٹ کا وزٹ کروں۔'' مسٹر جارج کے بارے میں وہ سن کر ٹھٹک گیا تھا۔
''سر! جہاں تک میں جانتا ہوں ان کے بارے میں مارکیٹ میں ان کی ریپوٹیشن کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ کام کے حوالے سے۔'' اس کی بات پر وہ کچھ چونکے تھے۔
''تمہیں کس نے بتایا؟''
''سر! مسٹر بارتھو یک ان کے بزنس پارٹنر رہ چکے ہیں۔ چھ ماہ پہلے سڈنی میں ہی میری ان سے ایک بزنس میٹنگ میں ملاقات ہوئی تھی۔ تب انہوں نے مسٹر جارج کی پارٹنر شپ کے ساتھ جو نقصان اٹھایا تھا اس کے بارے میں سرسری ساذکر کیا تھا۔'' وہ ان کی فیکٹری میں منیجر کی حیثیت پر تھا۔ انہیں اس پر پورا اعتماد تھا۔ سیویم کی وجہ سے وہ اپنے ہر کام کے سلسلے میں اس کی رائے کو لازمی اہمیت دیتے تھے۔ وہ ایک ذہین انسان تھے۔ انہوں نے سیویم کی آنکھوں میں اس کے لیے پسندیدگی دیکھی تھی اور درحقیقت وہ خود بھی یہی خواہش رکھتے تھے۔ انہیں اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے ایسے ہی ایماندار اور ذہین انسان کی خواہش تھی۔ وہ اسے اہمیت دیتے اب بھی اس کی بات پر انہوں نے سنجیدگی سے یقین کیا تھا۔
''ایسا ہے تو پھر میں کبھی بھی اس پارٹنر شپ کے بارے میں نہیں سوچوں گا۔'' انہوں نے اپنے فیصلے پر حتمی مہر لگائی، ان کی بات سے وہ خوش ہوا تھا کہ وہ اس پر اس حد تک اعتبار کرتے ہیں سیویم ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی اس کی سماعتوں تک یہ ساری باتیں پہنچ گئی تھیں۔
''اوہو پاپا! آپ کیا بزنس کی باتیں گھر میں لے کر بیٹھ گئے ہیں۔'' وہ ان کے پاس ہی صوفے کی ہتھی پر بیٹھتے ہی گویا ہوئی، اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
''بھئی اب میں اور کیا باتیں کر سکتا ہوں۔''
''کچھ بھی کریں، بس یہ ٹاپک بند کریں۔'' وہ ان کے گرد باز و حمائل کرتے ہوئے بولی۔
''اچھا آپ ان باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ ڈنر کی کیا صورت حال ہے نو بج چکے ہیں۔'' انہوں نے اس کی توجہ گھڑی کی سمت کروائی، وہ وقت کے بے حد پابند تھے اٹھنے جاگنے، کھانے پینے ہر چیز میں ڈسپلن ہوتا۔
''ڈنر بالکل ریڈی ہے بس لگانا باقی ہے۔''
''تو پھر جلدی لگائیے۔'' ان کے کہنے پر وہ اٹھ کھڑی ہوئی کھانا لگ گیا تھا۔ وہ شیث کو مخاطب کرتے ڈائننگ ہال کی جانب بڑھے تھے وہ بھی ان کی تقلید میں کھڑا ہو گیا تھا۔ ڈنر کافی خوشگوار ماحول میں کھایا گیا تھا۔ کھانے کے دوران بھی اس کی نگاہیں شیث کی طرف اٹھ رہی تھیں جو ہمیشہ کی طرح سپاٹ چہرہ لیے چپ چاپ کھا رہا تھا۔ اس کی خاموشی دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی چہرے پر چھائی آسودگی اس کے ہر تاثر کو چھپا دیتی تھی۔ اس کا تاریکیوں میں ڈوبا چہرہ مزید تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ آج پھر گہری سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ جانے انجانے طور پر ہی سہی پر کچھ غلط ہو جانے کا احساس جاگ رہا تھا۔ وہ بے ضمیر نہیں تھی۔ نہ ہی بے حس اس کا نا آسودہ چہرہ اسے بھی اندر تک مرجھا دیتا تھا۔ ڈنر کا اختتام ہوا اس کے بعد گرین ٹی کے ساتھ ان تینوں کی ہلکی پھلکی گپ شپ چلتی رہی۔ تقریباً گیارہ بجے تک اس نے واپسی کی راہ لی۔ وہ اسے باہر تک چھوڑنے آئی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
''تھینکس۔''
''کس بات کے لیے۔''

''ڈنر کے لیے۔''

''او پلیز! اس فارمیلٹی کی کیا ضرورت ہے۔'' اسے اچھا نہ لگا۔

''یہ فارمیلٹی نہیں ہے اچھا لگا تو کہہ رہا ہوں۔'' وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا جواباً وہ پھیکا سا مسکرادی۔ حالانکہ اس نے صاف محسوس کیا تھا وہ ان کے بیچ میں ہو کر بھی نہیں تھا۔

''اچھا سنو! پرسوں تیار رہنا، جیکسن اور لیزا کی شادی میں جانا ہے ہمیں اس نے تمہارا انویٹیشن کارڈ مجھے ہی دے دیا تھا۔'' اچانک یاد آنے پر وہ بولی۔

''میرا بالکل موڈ نہیں ہے پلیز۔'' بے زار کن لہجے میں وہ بولا۔

''موڈ تو تمہیں لازی بنانا پڑے گا جیکسن میرے بچپن کا دوست ہے، شیٹ! میری خاطر تمہیں چلنا ہو گا۔'' وہ بضد ہوئی۔

''اچھا دیکھیں گے۔'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے جیسے جان چھڑائی۔

''جی نہیں کچھ دیکھنا دکھانا نہیں ہے تم بس آؤ گے۔'' اس نے تنبیہ کیا، آگے سے اس نے سر جھٹک کر گاڑی کو ریورس کرتے ہوئے روڈ پر ڈالا اور اڑاتا ہوا لے گیا۔

☆......☆

جس وقت وہ چرچ میں داخل ہوا تھا، کافی مہمان آچکے تھے۔ تقریب بھی شروع ہو چکی تھی۔ سیویم کی نگاہیں اسی کی منتظر تھیں۔ بلیک ڈنر سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر نظر کے آئی گلاسز لگائے بالوں کو نفاست سے جیل کی مدد سے پیچھے کی جانب سیٹ کیا ہوا تھا۔ وہ کافی ہینڈسم اور فریش لگ رہا تھا۔ وہ اس کی جانب بڑھی تھی۔ اپنی پیچ کلر کی نیٹ کی گھیر دار فراک کو سنبھالتی ہوئی چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ اس کی جانب بڑھی تھی ہلکے سے میک اپ میں اس کا قدرتی حسن جگمگا رہا تھا۔ بالوں کو اس نے ڈھیلا سا جوڑا بنا کر اس میں پیچ کلر کا سائیڈ پر مصنوعی پھول لگایا ہوا تھا۔ ہلکی سی جیولری نے اس کی تیاری کو مکمل کر دیا تھا۔

''کیسی لگ رہی ہوں؟'' وہ خوش مزاجی سے اس کے روبرو کھڑی بولی۔

''اچھی لگ رہی ہو۔'' جب کہ اس کا لہجہ سرسری تھا۔

''چلو آؤ بیٹھتے ہیں تقریب تقریباً شروع ہو گئی ہے۔'' وہ بے تکلفی سے اس کے بازو میں اپنے ہاتھ حمائل کرتے ہوئے بولی۔

''دونوں ساتھ کتنے اچھے لگ رہے ہیں ناں۔'' وہ پرشوق نگاہوں سے جیکسن اور لیزا کو دیکھ کر بولی۔

''ہوں۔'' وہ مختصر بولا۔

شادی کی رسومات شروع ہو گئی تھیں، اس کی نگاہیں بھی ان دونوں پر تھیں، خوشی کی الوہی چمک ان کے چہروں پر نمایاں تھی۔ جیکسن لیزا کو رنگ پہنا رہا تھا۔ اس کی نگاہ ان کے ہاتھوں پر جم سی گئی تھی اور ایک منظر تھا جو دماغ کے پردے پر لہرایا تھا اس کی زندگی کا خوب صورت ترین لمحہ جو اس کے دماغ پر نقش تھا۔ برقی قمقموں سے سجی محفل خوش نما چہرے، گونجتے قہقہے گویا اس محفل کو خوب صورت رنگوں سے سجا دیا گیا تھا۔

گلابی شیفون کی کام دار فراک کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ اور سر پر سلیقے سے دوپٹا سجائے نفیس میک اپ اور لائٹ سی جیولری میں وہ کسی دلہن سے کم نہ لگ رہی تھی۔ خوشی کے اترے رنگ نے اسے روپ سے نہلا دیا تھا۔ جب اسے اس کے پہلو میں لا کر بٹھایا گیا تو اس کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ نے جیسے اس کے دل

کو منتقل کر دیا ہو، اس نے اس پر ایک بھرپور نگاہ ڈالنا جیسے اپنے اوپر فرض سمجھا ساتھ ہی ایک دلفریب سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ اس کی پرشوق نگاہوں کی تپش کو وہ بخوبی محسوس کر رہی تھی۔

''بس کریں ماموں! آپ کو تو لوگوں سے بھی شرم نہیں آرہی۔'' زارا نے اس کے کان میں شرارتی لہجے میں سرگوشی کی تھی جو نمل کی سماعتوں سے بھی ٹکرائی تو بے اختیار اس کے لبوں پر مسکراہٹ ابھری تھی۔ جب کہ وہ پورے ڈھیٹ پنے سے زارا کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

''کیا کروں تمہاری سہیلی لگ ہی اتنی خوب صورت رہی ہے۔'' آگے سے اس کا منہ ہی کھلا رہ گیا اس قدر بے باکی پر۔

''ماموں! بھانجی ہوں میں آپ کی کچھ تو شرم کریں بولتے ہوئے۔''

''ہاں تو میں نے ایسی بھی کیا بے ہودہ بات کر دی۔'' وہ بے دریغ بولا۔ نمل کی سماعتوں تک بہ آسانی ان کی گفتگو پہنچ رہی تھی۔

''توبہ ہے آپ تو بالکل بے شرم ہو گئے ہیں۔'' اس نے شرارت سے اسے چھیڑا آگے سے وہ ہنس دیا۔ منگنی کی رسم شروع ہو گئی۔ نگہت اپنی ساڑھی کا پلو سنبھالتی فرحت کے ساتھ اسٹیج کی طرف بڑھیں، زارا فوراً سیدھی ہو بیٹھی رسم شروع ہوتے ہی کیمرہ مین نے بھی فوراً کیمرہ سنبھالا اور خوب صورت مناظر کو کھینچتا چلا گیا۔ رسم خیر اسلوبی سے انجام پائی۔ ہر ایک چہرے پر خوشی کی طمانیت تھی۔ آج دونوں کی ایک نئے خوب صورت رشتے کی شروعات ہو گئی تھیں۔ رسم کے ختم ہوتے ہی کھانے کا دور چلا۔ نگہت اور فرحت دونوں ہی خیر اسلوبی سے مہمانوں کو نمٹانے میں مصروف تھیں۔ آج ان کی دوستی کے رشتے کو ایک مضبوط مہر لگ گئی تھی۔ دونوں کے لبوں پر ایک مسکراہٹ سج گئی تھی۔

زارا، نمل کو لیے اوپر ٹیرس کی طرف بڑھی تھی۔

''زارا! کیا بات ہے کیوں لے کر جا رہی ہو اوپر؟''

''تم بس چلو ناں کیا کیوں کے سوال کا کیا مطلب۔'' وہ سختی سے بولی۔ آگے سے وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ ٹیرس کا دروازہ کھول کر وہ اندر کی طرف بڑھیں جہاں سامنے شیث اسی کا منتظر تھا اسے صرف ایک لمحہ لگا ساری صورت حال جاننے میں اس نے گھور کر زارا کو دیکھا تھا جو آگے سے ڈھیٹ بنی مسکرا رہی تھی۔

''لیں بھئی ماموں! لے آئی آپ کی امانت کو۔''

''زارا!'' اس نے دانت چبا کر بولا۔

''سوری ڈیئر! پر ماموں کی التجا کو میں رد نہ کر سکی۔'' معافی مانگتے ہوئے شرارت سے اس نے کان پکڑ لیے۔

وہ اب کیا بولتی سارے راستے اب مسدود تھے۔

''اور ہاں ماموں آپ کو پرامس یاد ہے ناں مجھے میری پسند کی نیو برینڈ گھڑی چاہیے۔'' وہ وارن کرنا نہ بھولی تھی۔

''ہاں میری ماں یاد ہے اب جاؤ بھی۔''

''جا رہی ہوں آپ میں تو بالکل صبر نہیں ہے۔'' وہ منہ چڑاتی چلی گئی تھی اور وہ حیرت سے ماموں بھانجی کی سودے بازی سن رہی تھی۔ ساتھ ہی شیث کو گھورا۔

''کیا! ایسا بھی کیا غلط کر دیا میں نے۔'' وہ خجالت سے بولا۔ آگے سے وہ دھیما سا مسکرا دی۔ وہ قدم بڑھا کر اس کے روبرو آن کھڑا ہوا اور گہری سنہری آنکھوں نے اس کا طواف کیا اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ حزیں آنکھیں جھک گئی تھیں اور دھڑکنوں نے یکدم جیسے شور مچایا اس نے اس کے نرم گداز ہاتھ کو تھاما۔ اس کی مخروطی انگلی میں ایک نازک انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ اس نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔

''تم خوش ہو؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''منگنی کے بعد یہ سوال پوچھ رہے ہو۔'' اس نے لاجواب کر دیا اسے آگے سے وہ ہنس دیا۔

''بس ویسے ہی دل کی تسلی کے لیے پوچھ لیا ورنہ مجھے معلوم ہے تم خوش ہو گی۔ آخر اتنے خوب صورت انسان کا ساتھ مل گیا۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''اف...... اتنی خوش فہمی۔'' وہ اس پر نظر جما کر بولی۔

''نہیں۔ یہ قطعی خوش فہمی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔'' وہ سنجیدہ سا منہ بنائے بولا۔

''توبہ ہے اپنی خوش فہمی دور کر لو، کوئی خاص خوشی نہیں ہے مجھے۔'' اس نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا آگے سے اس نے دفعتاً اسے اپنی جانب کھینچا۔

''شیث! کیا ہو گیا چھوڑو مجھے۔'' وہ اس کے تنگ حصار میں مچل سی گئی۔

''اور اگر نہ چھوڑوں تو۔'' اس کا لہجہ گھمبیر ہو گیا اور اس کی حالت غیر ہو گئی۔

''پلیز شیث!'' وہ التجائیہ بولی۔

''ابھی تو میں نے تمہیں جی بھر کر بھی نہیں دیکھا۔'' اس کی نگاہ اس پر جم سی گئی۔

''بہت چھچھورے لگ رہے ہو ایسی باتیں کرتے ہوئے۔'' وہ چبا کر بولی جس پر اس کا قہقہہ گونجا تھا۔

''اچھا اب ایسی بھی کیا چھچھوری بات کر دی منگیتر ہو میری کہہ سکتا ہوں ایسا۔''

''اچھا بس تم چھوڑو مجھے جانا ہے۔'' وہ بیزار سی ہو گئی۔

''ٹھیک ہے جاؤ پر ایک بات غور سے سن لو، آج کے بعد یہ چھوڑنے کا لفظ مت استعمال کرنا، عمر بھر اپنانے کا وعدہ کیا ہے چھوڑنے کا نہیں۔'' وہ متانت سے بولا۔ وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ زندگی میں اس نے ایک اصول تو بنا لیا تھا کہ انسان پر اعتبار کم از کم اس کے اصولوں میں شامل نہیں تھا لیکن آج نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اعتبار کر بیٹھی تھی۔ اس کی چمکتی روشن پراعتماد آنکھیں اس کے ذہن میں نقش تھیں، کسی سے کیا وعدہ بہت آسانی سے توڑ دیا تھا اور جب وعدے توڑے جائیں تو ملال کا کیا فائدہ، جب کوئی تعلق نہ رہا تو پھر ملال کیسا، وہ پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتا تھا اس منزل کو تلاشتا تھا جس کے نشان وہ خود ہی مٹا آیا تھا۔ اس کا ضمیر بے چین تھا۔ اس کی روح ضمیر سے جڑ گئی تھی۔ وہ اس کے جسم میں بے چینی سے یوں پھڑپھڑا رہی تھی جیسے بند پنجرے میں کسی اڑتے پنچھی کو قید کر دیا ہو۔ اس کے سینے میں دھواں سا اٹھنے لگا ذہن میں نقش مسکراتے چہرے خوشنما قہقہے اس کے گرد جیسے طواف کر رہے تھے جو یکدم بند ہو گئے اور سامنے آسودہ چہرے اور نم آنکھیں آٹھہریں تھیں وہ ان کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔ ایک گہری دھند میں سب چھپتے چلے گئے۔ اس کے اندر نا آسودگی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ اضطرابی اس پر ایسی طاری ہونے لگی کہ اس کا چہرہ عرق آلود ہو گیا اسے لگا شاید وہ اب سب کے بیچ بیٹھ نہ پائے گا اور صرف دو لمحے لگے تھے وہ جھٹکے سے اٹھا اور باہر کی جانب بڑھ گیا۔ سیویم چونکی تھی وہ فوراً اس کے پیچھے لپکی جب تک وہ باہر پہنچی وہ گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔ آج وہ

پریشانی سے اس کی جانب لپکی نہیں تھی، بس چپ چاپ اسے دیکھتی رہ گئی، اس کی نظر سیویم پر پڑی تو وہ رک سا گیا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی گاڑی کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''شیث......!'' اس کی آنکھیں ہر تاثر سے پاک ہو گئیں تھیں۔ اسے اپنی آواز خود بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

''سوری!'' وہ سپاٹ سا بولا تھا۔ اس کی سرخ آنکھوں کی تپش اس کے اندر کا حال بیان کر رہی تھیں۔ وہ کچھ نہ بولی مزید وہ وہاں ٹھہرا نہیں جب کہ وہ وہاں جم سی گئی۔ کیا وہ اب تک سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ یعنی اس کی محبت خاک تھی، جسے گرم ہوائیں اڑاتی چلی جا رہی تھیں۔ وہ صرف ایک خواب تھا جسے وہ حقیقت بنانے پر تلی ہوئی تھی۔ آج اس کے دل نے ایک الارم بجا دیا تھا۔ آنے والے پل کیا کچھ دکھانے والے ہیں اسے اندازہ ہو رہا تھا۔ اسے لگا شاید وہ اب کھڑی نہ رہ پائے گی۔ اس کے قدم سست ہوتے جا رہے تھے اور جس کے پیچھے وہ بھاگ رہی تھی وہ اس سے دور نکل چکا تھا۔

☆......☆

اس نے ٹھنڈے پانی کی بوتل کو فریج میں سے تیزی سے نکال کر سارے پانی کو ایک ہی سانس میں حلق کے اندر انڈیل دیا تھا۔ اندر لگی آگ سلگتی رہی۔ جسے وہ ٹھنڈا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ پانی کی خالی بوتل کو بے دردی سے زمین پر پھینکا تھا۔ اس کے اعصاب شل ہونے لگے تھے کنپٹیاں مسلسل سلگ رہی تھیں کنپٹیوں پر ابھرتی رگیں اس کے اندر اٹھتے طوفان کا پیش خیمہ تھیں۔ وہ کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ الماری سے سلیپنگ سوٹ نکالنے کے بعد وہ شاور لینے چلا گیا تھا۔ شاور لے کر وہ سیدھا بستر پر آ گرا تھا۔ تکیے کے اندر منہ چھپا کر اس نے آنکھیں موندھ لیں اور پھر ایک ناکام کوشش کی تھی۔ ذہنی اذیت سے چھٹکارے کے لیے بند آنکھوں کے پیچھے ہمیشہ اس کا عکس جھلملاتا تھا کبھی ہنستا ہوا کبھی سنجیدہ سا تو کبھی نم آنکھوں میں ناآسودگی چھائی ہوتی، وہ ہر روپ میں اس کے ذہن پر نقش تھی اس کی جھنجھلاہٹ میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کا دل چاہا وہ سب توڑ پھوڑ دے۔ چیخے چلائے پر کسی طور اپنے اندر کی اضطرابی کو نوچ کر پھینک دے۔ وہ کب تک یہ ماتم گری کرتا ہر رات ماتم کرتے ہوئے ہی تو گزرتی تھی۔ یہ ماتم گری اس نے خود ہی تو تجویز کی تھی پھر ملال کیسا، ایسا کوئی جرح نہیں تھا جو اس کے زخموں کا علاج ہی کر دیتا یہ سب اسی کے منتخب کردہ تھے پر اب سرد ہواؤں کا زور بڑھ رہا تھا۔ اس کی خواہشوں کے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ لڑکھڑانے لگے تھے۔ تاروں کا غبار بکھرنے لگا تھا۔ ہر چیز کانچ کی طرح ٹوٹ کر چکنا چور ہوتی چلی جا رہی تھی۔ کچھ تو ایسا تھا جس کی وجہ سے سب بکھرتا چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچوں کے اژدھام میں غرق تھا۔ جب کمرے میں گونجتی فون بیل پر اس کا مشتعل ذہن جیسے ہوش میں آیا تھا۔ تکیے سے سر اٹھا کر اس نے بیزاریت سے فون کی طرف دیکھا تھا جو مسلسل بجے جا رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اٹھا لیا۔

''ہیلو!'' وہ سرد سا بولا۔ جب کہ دوسری جانب مکمل خاموشی ہو گئی۔

''ہیلو!'' کوئی جواب نہ پا کر وہ پھر بولا تھا۔ پر ہنوز خاموشی تھی۔ وہ کچھ ٹھٹکا تھا دیارِ غیر میں بیٹھے کسی بہت اپنے کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔

''آپا! آپ ہیں ناں۔'' اس نے یقین سے پوچھا جب کہ دوسری جانب کسی کے سسکنے کی آواز آئی تھی۔

''شیث!'' ان کے پکارنے پر وہ ہوش میں آ گیا تھا۔ اس کے اندر خوشی کی ایسی لہر دوڑی کہ یوں لگا جیسے

گھٹن زدہ سانسوں کو آزادی مل گئی ہو۔

''کیسی ہیں آپا آپ؟'' ان کی آواز سن کر وہ جیسے دوبارہ جی اٹھا تھا۔ لہجہ خود بخود خوشگوار ہو گیا تھا جب کہ وہ چپ سی ہو گئیں۔

''زندہ ہوں اور جی رہی ہوں۔'' تھکن سے چور لہجے نے اس کے منہ پر طمانچہ مارا تھا، جیسے وہ چپ سا ہو گیا اور پھر کچھ دیر کے لیے دونوں ہی جانب خاموشی چھا گئی جیسے دونوں ہی اپنے اپنے طور پر گفتگو کے لیے لفظ تلاش کر رہے ہوں۔

''سوچا تھا تم سے کبھی بات نہیں کروں گی پر تمہیں اپنے بیٹے کی طرح پالا ہے پیار کیا ہے شاید جبھی یہ ماں چاہ کر بھی تمہیں بھول نہ پائی۔'' جہاں ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہیں اس کی خوابیدہ آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔ یہ سچ تھا اگر انہوں نے اسے ماں بن کر پالا تھا۔ تو وہ بھی انہیں اپنی ماں ہی سمجھتا تھا۔ پھر بھلا ان کی ممتا سے بھرا لمس بھول سکتا تھا۔

''آپا!'' اس نے بڑی تکلیف سے انہیں پکارا تھا۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا پر یوں لگتا تھا زبان گنگ ہو گئی ہو۔

''آپا! میں تو آپ سے معافی مانگنے کے قابل بھی نہ رہا۔'' وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح بولا اس کی بات پر وہ چپ سی ہو گئیں۔

''چھوڑو اس بات کو تم بتاؤ تم ٹھیک ہو۔'' اس موضوع سے انہوں نے پہلو تہی کرنا ہی مناسب سمجھا اور خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں آگے سے وہ تو جیسے سوچ میں پڑ گیا تھا کس حال کی خبر سنائے۔

''میں ٹھیک ہوں آپا! آپ سنائیں بھائی جان اور زارا کیسے ہیں۔'' وہ بھی خود کو کمپوز کرتے ہوئے بولا تھا۔

''سب ٹھیک ہیں زارا کی بات پکی کر دی ہے میں نے، دو ماہ بعد شادی ہے اس کی۔'' زارا کی اس خبر نے جہاں اسے خوش کیا تھا وہیں نہ چاہتے ہوئے بھی دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ اس کی زندگی کا اتنا خوشی بھرا لمحہ تھا اور وہ ان سب سے دور تھا بے حد دور۔

''بہت مبارک ہو آپا۔'' وہ پرخلوص سا بولا۔

''خیر مبارک۔''

''یقیناً شادی میں آنے کا تو نہیں کہیں گی۔'' نہ جانے کس امید کے تحت اس نے کہا اسے لگا شاید وہ کبھی اس کی بات پر اتفاق نہیں کریں گی۔

''میں کوشش کروں گی پر تمہارے لیے میں زارا کے آگے حق کھو چکی ہوں شیث۔'' انہوں نے دوٹوک کہا۔ ان کی بات پر وہ کرب سے مسکرایا تھا۔

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، میں واقعی اس رویے کا حق دار ہوں۔'' اس نے صاف گوئی سے اتفاق کیا تھا۔

''جانے دو اب یہ سوچ کر خود کو تکلیف دینے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ابھی وہ غصے میں ہے۔ پر وہ بھی زیادہ عرصہ تم سے ناراض نہیں رہے گی۔'' اپنے طور پر انہوں نے تسلی دی تھی۔ پر وہ کوئی بچہ نہ تھا جو بہل جاتا، کچھ دیر ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد فون بند کر کے وہ واپس اوندھا منہ ہو کر لیٹ گیا جہاں اتنے وقت بعد

اسے خوشی ملی تھی وہیں وہ ایک گہری پستی میں چلا گیا تھا اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے مکان کو توڑنا پھر اس کے ملبے کو دیکھنا چپ چاپ اور پھر اس ہی ملبے سے دوبارہ مکان تعمیر کرنا کیسا ہوتا ہے؟ اسے آج محسوس ہو رہا تھا اسے ساحل کا کنارہ تو مل گیا تھا۔ پر لہریں ان کے نیچے سے ریت کھینچتی ہوئی لے جا رہی تھیں۔ اس کا وجود اتنا بے ڈول ہو گیا تھا کہ صرف اب ایک لہر کا گزر ہونا تھا اور اس کا سارا وجود بہہ جانا تھا۔

☆......☆

اگلے دن آفس میں شیث کے روم کے پاس سے گزرتے ہوئے بے ساختہ وہ اس کے روم میں داخل ہوئی تھی۔ سامنے ہی وہ بیٹھا لیپ ٹاپ پر کام کرنے میں منہمک تھا۔ اس کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''مجھے تو لگا تھا شاید تم اب آؤ گے ہی نہیں۔'' وہ اس کے ٹیبل کی جانب بڑھی چیئر کو کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بڑے عام سے لہجے میں بولی۔

''کیوں ایسا کیوں لگا تمہیں؟'' وہ دوبارہ کام کی طرف متوجہ ہو گیا بول وہ ایسے رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو، وہ اسے دیکھ کر رہ گئی عجیب انسان تھا، کبھی ایسا ہو جاتا کہ وہ سب میں موجود ہی نہ ہو اور کبھی اتنا مطمئن نظر آتا اس کے بدلتے رنگوں سے وہ جیسے خود بھی عاجز آ گئی تھی۔

''شیث! تم کیوں اتنے عجیب ہو۔'' وہ تیکھے چتون کر کے بولی۔ اس کی بات پر وہ پھیکا سا مسکرا دیا تھا جیسے اپنی ذات پر اس نے ہنسی اڑائی تھی۔

''تم اگر یہاں خوش نہیں ہو تو بتا سکتے ہو مجھے۔'' وہ صاف بولی۔

''ایسا کیوں لگا تمہیں؟'' اس نے اچٹتی ہوئی نگاہ اٹھائی۔

''تمہارا رویہ مجھے سب باور کروا رہا ہے۔''

''غلط فہمی ہے تمہاری۔''

''میں کسی بھی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں بس تم حقیقت سے نظریں چرا رہے ہو۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ دھیما پڑ گیا تھا اس کی آنکھیں اس کے کمزور سے لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں اور یہ سب کم از کم اس سے تو مخفی نہ رہ سکا۔ وہ بہت خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''جس مٹی کی تم پیداوار ہو تمہاری روح آج بھی وہیں کہیں بھٹکتی ہے شیث۔'' وہ بہت گہرائی سے بولی تھی اور وہ اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔ بہت سی باتیں بنا کہے ہی سمجھ آ جاتی ہیں۔ دونوں کے بیچ اتنا تو رشتہ تھا کہ وہ ایک دوسرے کے احساسات سے واقف تھے۔

''چلتی ہوں تم اپنا کام کرو۔'' ایک سرد خاموشی چھا جانے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور وہ چپ چاپ اسے جاتا بے تاثر آنکھوں سے تکتا رہا۔ یوں لگتا تھا زندگی کو سرد ہواؤں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا جیسے برفاب شبوں کی مانند گزرتی زندگی ہر ایک لمحے ہر ایک وجود کو برفاب کرتی چلی جا رہی تھی۔ خاموشی اور سرد مہری کا طوفان نہ جانے کب ٹلنا تھا، اس بات کا پیش خیمہ کوئی نہیں کر پا رہا تھا۔

☆......☆

چہچہاتی صبح کا آغاز ہو گیا۔ ادھر سے ادھر سرگرداں پرندے دانہ پانی کے لیے پھدکتے پھر رہے تھے جو صبح ہونے کا پیغام دے رہے تھے۔ وہ معمول کے مطابق اپنے کام کے لیے روانہ ہو گیا۔ دن چڑھتے ہی وہ خود کو دنیا کے کاموں میں مصروف کر لیتا تھا اور رات کسی اداوس کی طرح اس پر طاری ہو جاتی اس کا وجود ذہنی کرب

کے بھوت پریت کے قبضے میں چلا جاتا تھا۔ جس کا اثر روشنی کے طلوع ہونے پر کم ہو جاتا تھا مگر زائل نہ ہوتا، وہ مسلسل تکلیف میں تھا اس تکلیف سے اکیلے دوچار ہو کر وہ جیسے خود ہی کو سزا دے رہا تھا۔ بے چینی کے سلاخوں والے جالے نے اسے اپنے اندر قید کر لیا تھا، اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ اس کی خوابیدہ سرخ آنکھیں راتوں کے رت جگوں کی داستان سناتی تھیں۔ بہرحال پھر بھی روز خود کو سمجھاتا۔ سیویم کے لیے خود کو تیار کرتا تھا۔ جیسا بھی تھا اب وہی اس کا حال تھی۔ آج اس کی برتھ ڈے تھی شیٹ نے اسے ڈنر کے لیے انوائیٹ کیا تھا۔ اس کے احساسات اس کی کیفیت کیا تھی اس نے سب کو ایک طرف رکھا اور جو تعلق بنایا تھا اسے نبھانا تھا۔ انٹرکونٹینل ریسٹورنٹ سیویم کو یہاں کا کھانا کافی پسند تھا۔ اس نے اسے وہیں انوائیٹ کیا، خوشگوار ماحول میں کھانا کھاتے ہوئے بھی وہ دونوں چپ تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بس یہی کام انجام دینے آئے ہوں کھانے کے دوران وہ اس کی سنہری آنکھوں میں جھانکتی رہی تھی، جہاں ہمیشہ کی طرح گہری خاموشی کا راج تھا، اس کے رویے سے اس کے اندر بھی ایک سرد کیفیت اتر گئی تھی۔ اب لگتا تھا مسکراہٹ نے اس کے لبوں سے بھی منہ موڑ لیا تھا۔ وہ جو اس کے خاموش رہنے کے باوجود مسکراتی رہتی تھی۔ بولتی رہتی اب جیسے اس کا بھی دل اچاٹ ہو گیا تھا اسی ماحول میں ڈنر کا اختتام ہوا تھا۔

''جیکسن اور لیزا نے بیچ پارٹی پر سب کو نوائیٹ کیا ہے۔ سوچا تمہیں بتا دوں اب تمہاری مرضی تم آؤ یا نہ آؤ۔'' گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے اطلاع دی تھی۔ بنا کسی اصرار کے۔

''کب ہے؟'' اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''پرسوں۔'' اس نے نگاہیں کھڑکی سے باہر جمالی تھیں۔ وہ مخاطب اس سے تھی مگر بیگانگی کے ساتھ دل میں انجانی خواہش تھی شاید وہ اس کے روٹھے رویے کو محسوس کر کے ریکوئسٹ کرے، پر یہ اس کی سوچ تھی وہ پتھر کا ہی بنا رہا۔

''ٹھیک ہے آجاؤں گا۔'' وہ بھی عام سے لہجے میں بولا۔ اس کے انداز پر وہ مزید اندر سے سرد ہوتی چلی گئی۔



گریٹ اوشین کے صاف وشفاف سیاہ روڈ پر ان کی گاڑیاں گامزن تھیں۔ روڈ کے دائیں طرف خوب صورت سبزے سے زمین مزین تھی اور بائیں طرف ٹھاٹھیں مارتے نیلے سمندر نے خوب صورتی کے ساتھ ساتھ ماحول کو بھی تروتازہ کیا ہوا تھا۔ صبح کا وقت تھا ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی، چمکتی نرم گرم دھوپ نے موسم کو خوشگوار کر دیا تھا۔ وہاں کی تروتازہ آب وہوا نے انہیں بھی تروتازہ کر دیا تھا، گاڑیاں پارک کر کے سب اپنا اپنا ضروری سامان لیے سمندر کی جانب بڑھے تھے۔ جب کہ وہ چمکیلی ریت پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس کا کوئی موڈ نہیں تھا پانی میں جانے کا، وہ وہیں بیٹھا طائرانہ نگاہ اردگرد پر ڈال رہا تھا۔ سمندر کے وسط اور کناروں پر چٹان جیسے پتھر سینہ تان کر کھڑے تھے جو پتھر کناروں پر تھے ان پر اوپر جانے کا راستہ بنایا ہوا تھا جہاں لوگ بڑے شوق سے کھڑے گہرے سمندر کے نظاروں کو اپنی آنکھوں میں اتار رہے تھے۔ سیویم نے اسے کئی بار پکارا تھا پانی میں آنے کے لیے پر اس نے اشارے سے منع کر دیا تھا۔ سمندر کو دیکھتے ہی اس کے دماغ میں خواب کا منظر گردش کرنے لگا تھا۔ خواب تھا یا حقیقت وہ اس کے سحر سے نکل نہیں پایا تھا۔ اب سمندر کو دیکھ کر ویسی ہی وحشت اندر اترنے لگی تھی۔ شوریدہ اونچی لہریں اسے کسی دیو کی مانند لگ رہی تھیں جو اپنے اندر کسی

کو بھی بھسم کرنے کی طاقت رکھتی تھیں۔ نہ جانے وہ کون لوگ ہیں جو اس کے پاس آکر اپنے غموں کو اس میں بہا دیتے ہیں بھلا وہ کیسے کسی کا دوست ہوسکتا ہے۔ اسے لگا اس سے زیادہ تو کوئی بھی بے وفا نہیں وہ انسان کے نیچے سے ریت کو یوں کھینچتا ہے کہ اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔ جاندار وجود کا دوست بنتا ہے تو بے جان وجود کو کناروں پر کیوں پھینک جاتا ہے۔ پھر کہاں کا غمگسار تو کیسا دوست، وہ وہاں بیٹھا عجیب ہی سوچوں میں الجھ بیٹھا تھا۔ بے معنی خیالات شاید اس کی کیفیت کا ہی نتیجہ تھے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ قدم اٹھاتا یونہی ادھر اُدھر ٹہلنے نکل گیا تھا، اونچے نیچے پتھروں کو کراس کر کے وہ ایک سبزے والی جگہ پر چلنے لگا جہاں ہرے بھرے درخت قطاروں سے لگے ہوئے تھے۔ ساتھ وقفے وقفے سے مختلف ریسٹورنٹ کلب بنے ہوئے تھے۔ صبح کا وقت تھا اس لیے لوگوں کا رش نہیں تھا مگر لنچ تک کافی رش ہوجاتا تھا اور شام میں اس سے زیادہ وہ کتنی ہی دیر خالی الذہن ادھر ادھر ٹہلتا رہا تھا۔ آخر تھک ہار کر وہ جب ٹہلنے سے بھی بیزار ہوگیا تو وہ ایک ہٹ کی جانب بڑھ گیا۔ جو ایک پبلک پیلس تھا۔ پتھر کی سیڑھیاں چڑھ کر ایک برج کراس کرنا پڑتا، پھر ہٹ تک پہنچا جاتا، وہ آہستہ قدموں کے ساتھ چلتا چلتا ہٹ تک پہنچ گیا گول دائرے کی شکل میں بنا ہٹ جس کے اطراف میں کھلی روشن کھڑکیاں بنی ہوئی تھیں سمندری ہواؤں کے گزر سے وہاں آکر لوگ بہت محظوظ ہوتے تھے۔ کھڑکی کے پاس کھڑے ہوکر نیلے سمندر کا خوب صورت صاف نظارا نظر آتا وہ ایک بہت ہی سادے طرز کا ہٹ تھا، لوگوں کا ہجوم بھی نہ ہونے کے برابر تھا، وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے ٹیک لگائے یونہی کھڑا رہا اونچی نیچی لہروں کو دیکھتے ہوئے نہ جانے کتنا ہی وقت گزر گیا۔ یہاں تک کہ اسے سیویم کی آمد کی خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ ڈھونڈتی ڈھونڈتی یہاں تک پہنچی تھی اور جب آئی تو اسے بے حس و حرکت کھڑا دیکھا، چند پل وہ اسے دیکھتی رہی پھر آکر اس کے پاس ٹھہر گئی۔

''بہت ہی بے مروت انسان ہو۔'' اس کے دھیمے سے لہجے پر اس نے گردن گھما کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ نارنجی رنگ کی پلین سلیولیس لانگ فراک میں اس کی دودھیا رنگت کھل رہی تھی لیکن وہ ہنوز خاموش رہا۔

''ویسے کافی خوب صورت جگہ ہے ناں۔'' وہ بھی دیوار سے ٹیک لگا کر بولی۔

''ہوں۔'' وہ مختصر بولا اور وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا رویہ کوئی انوکھی بات نہیں تھا جو ایسا تھا لیکن محبت تو کرلی تھی اور اب دکھ بھی اٹھانا پڑ رہا تھا۔ پر سمجھ سے باہر یہ بات تھی کہ نہ جانے اس محبت کی جنگ کا کب اختتام ہونا تھا اس کے جذبات سرد پڑ گئے تھے۔ دکھ اس بات کا تھا کہ وہ عبادت سر لوح دل کسی بھی ربط سے آشنا نہیں تھا۔ اس کے چاروں گرد وحشت نے اپنا دائرہ تنگ کردیا تھا، دہکتے جذبات منجمد ہوگئے تھے۔ بے کار کی مشقتیں بے کار کی مسافتیں بے کار کا ہجر تھا۔ ایسے میں وصل کی تمنا اس سے بھی زیادہ بے کار خواہش تھی۔ اس نے نمکین ہوتی آنکھوں کو بھینچ لیا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ سوچوں کے اژدھام میں مقید رہی تھی۔ یہاں تک کہ کھڑے کھڑے اس کے پاؤں شل ہونے لگے تھے ہار کر وہ پلٹ آئی۔ بڑا مشکل سفر تھا اور اس نے جتنا طویل ہونا تھا، اتنا ہی مزید مشکل ہوجانا تھا۔ کوئی بہت بڑی غلطی تھی جو سرزد ہوگئی تھی۔ جس کی تباہیوں کے آثار نمودار ہونا شروع ہوگئے تھے۔ وہ چلتی چلی گئی سمندر کی لہروں میں جیسے اس کا وجود بہتا چلا گیا۔ ایک بڑی لہر کے زد میں اس کا وجود آگیا تھا۔ دوست اگر اسے نہ دیکھتے تو شاید واقعی اس نے بہہ جانا تھا۔ جب وہ لوٹا تھا تب اس کے گرد جمگھٹا دیکھ کر ٹھٹکا تھا۔ تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اس تک پہنچا تھا وہ پور پور بھیگی ہوئی تھی اس کے لب برف کی طرح سرد پڑ گئے تھے۔

''سیویم!'' اسے دیکھ کر نگر خود بخود اس کے لبوں پر آ گئی تھی۔ اس نے سرخ بھیگی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا تھا جن میں اشکوں کا جہاں آباد تھا اس نے ہاتھ کے اشارے سے بھی روکنے کا کہہ دیا تھا اور وہ جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔

''جاؤ شیث! پلیز یہاں سے چلے جاؤ۔'' ہمیشہ اس کی محبت میں ہنستا لہجہ خود بخود سرد ہو گیا تھا، آج اور اسے لگا آج وہ واقعی ڈوب گیا ہے۔

☆......☆

وہ پورے ایک ہفتے بعد آفس آیا تھا اور اس پورے ایک ہفتے تک دونوں نے ہی ایک دوسرے سے رابطہ نہ کیا تھا۔ اس کے آفس آتے ہی سیویم نے اسے اپنے روم میں بلایا تھا۔ روم کا دروازہ کھولتے ہی سامنے ہی اس کی نظر اس پر پڑی تھی جو گلاس ونڈو کے پار بھاگتے دوڑتے مناظر پر خالی ذہن نظر جمائے ہوئے تھی۔ اس کی آہٹ پر وہ پلٹی تھی۔ شیث کی نگاہ اس کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی ہمیشہ کھلکھلاتا چہرہ پژمردہ ہو گیا تھا۔ آج اپنے ساتھ اس نے ایک اور زندگی برباد کر دی تھی۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ سب کچھ یوں ہو جانا تھا تو شاید وہ یہاں کبھی آتا ہی نا۔ لمحے بھر کو وہ دونوں ساکت ہو گئے تھے۔ ایک کی آنکھوں میں پشیمانی تھی تو دوسرے کے دکھ اپنے اپنے احساسات میں گرفتار وہ دونوں میلوں دور جا چکے تھے۔ اس نے ٹیبل کی جانب قدم بڑھائے تھے۔ اس پر سے وائٹ لفافہ اٹھا کر اس کی جانب بڑھایا تھا۔

''تمہارا ریزائن لیٹر۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا جسے اس نے بنا کچھ پوچھے تھام لیا تھا۔ کچھ دیر وہ اسے دیکھتی رہی گہری خاموشی اس کی آنکھوں میں آ ٹھہری تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا وہ اس پر ترس کھائے جو بربادی کا سامان سمیٹے ہوئے تھا۔ یا خود پر اسے سب کچھ دے کر بھی خالی تھی۔

''تم جا سکتے ہو۔'' ایک گہری خاموشی کے بعد اس نے حکم دیا تھا۔ وہ جس کا وجود کسی روبوٹ کی طرح ہو گیا تھا اس کے حکم کی تعمیل کرتا ہوا پلٹ گیا تھا۔ جب تعلق ہی نہ تھا تو وہ کیا کہتا اس کے جاتے ہی اس کے اندر ٹھہرا ہوا طوفان آنسوؤں کی صورت میں رخساروں سے بہہ گیا تھا۔ وہ تھک گئی تھی اس کے مردہ وجود کو گھسیٹتے گھسیٹتے اسے معلوم تھا اس نے کبھی بھی خود سے کوئی فیصلہ نہیں لینا تھا۔ درد کی بھٹی میں خود کو یونہی جلاتے رہنا تھا۔ اس لیے کسی ایک کو فیصلہ لینا تھا جو مشکل تھا مگر کسی ایک کی زندگی کے لیے بہتر ہونا تھا اب نہ جانے نقصان کس کا کتنا ہوا تھا۔ اس کو تولنے کے لیے کوئی ترازو نہ تھا۔

☆......☆

بلیک پینٹ شرٹ کے اوپر اس نے اسکن لانگ کورٹ پہنا ہوا تھا۔ ساتھ ہی بلیک اور اسکین امتزج کے مفلر کو گلے پر اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا۔ شدید ٹھنڈ سے بچنے کے لیے اس نے مکمل تیاری کی ہوئی تھی۔ بلیک ہائی ہیل کی کوٹ شوز پہنے وہ بھاری قدموں کے ساتھ اس کی جانب بڑھی تھی جو اس کے انتظار میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس کے سامنے آ ٹھہری ہوئی۔ آنکھوں پر گہرے براؤن رنگ کے گلاس چڑھا کر اس نے آنکھوں کی نمی اور تاثرات کو چھپا لیا تھا۔ وہ دونوں آج آخری بار مل رہے تھے۔ اس وعدے کے ساتھ کہ اب کبھی ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئیں گے۔ یہ شرط بھی سیویم نے ہی رکھی تھی۔ دونوں کے بیچ ایک ایسی خاموشی آ ٹھہری جو منتظر تھی کہ بات کی ابتداء کون کرے گا۔ اسے تو کبھی نہیں کرنی تھی پشیمانیوں کے سوا کچھ نہ تھا اس کے پاس۔

''فلائٹ کب کی ہے؟'' اپنے سرسری لہجے میں پوچھا۔
''ایک گھنٹے بعد۔'' جب کہ اس کا لہجہ خاموش تھا۔
''یقیناً میلبورن تو اب کبھی نہیں آؤ گے۔'' وہ پھیکا سا مسکرا کر بولی تھی ایک طنز کے ساتھ۔
''ایسا کیوں سوچا تم نے؟''
''میں نے سوچا نہیں ہے مجھے معلوم ہے اور شاید یہی سچ ہے۔'' وہ بے دردی سے بولی تھی۔ پھر وہ کچھ نہ بولا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پر وہ روئی نہ مضبوطی کا ایک خول تھا جو خود پر چڑھا لیا تھا۔
''شیث! مجھے نہیں معلوم کہ ہم دوبارہ کبھی ملیں گے کہ نہیں۔ پر سچ پوچھو تو میری دعا ہے ہم ایک دوسرے کے سامنے کبھی نہ آئیں، تم میں شاید حوصلہ ہو پر مجھ میں حوصلہ نہیں ہے کہ اپنی محبت کو کسی اور کے ساتھ دیکھوں۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا اور وہ چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔
''جانتے ہو جب بھی تمہیں اجاڑ دیکھتی تھی تو بڑا رشک آتا تھا اس پر کچھ تو تھا اس میں ایسا کہ تم زندہ نہ رہے۔ جس ماحول میں، میں پلی بڑھی ہوں وہاں کسی کو چھوڑ کر دوسرے کو اپنا لینا بڑی عام بات ہے۔ مشینی انداز میں زندگی گزارتے لوگوں کے جذبات بھی جیسے مشین بن گئے ہیں اس لیے کبھی یہ گمان ہی نہ ہوا دل مشین نہیں ہے کہ جب خراب ہوگیا تو ریپئر کروا کر دوبارہ سے نئے جذبات منتقل کرلو۔ مجھے آج یقین آگیا ہے اس کا دل اتنا تو صاف اور معصوم ہوگا جس نے اتنے دور ہونے کے باوجود تمہیں بے چین کر رکھا ہے۔''
وہ متانت سے بولتی اسے حیران کر گئی تھی ایسی حقیقت جس سے وہ منہ چھپاتا پھرتا تھا اور وہ کھلا اظہار کر رہی تھی۔ بڑا مشکل ہوتا ہے اپنی محبت پر کسی اور کی محبت کو سبقت دینا پر اس نے اعتراف کیا تھا جواب میں اس کے پاس کوئی لفظ نہ تھا۔ پشیمانی ہی اس کا جواب تھی۔
''میں تم سے کوئی شکوہ شکایت نہیں کروں گی، اس کا ملال ہی کیا جو میرا تھا ہی نہیں۔'' اس نے بڑی صاف گوئی سے کہا تھا اور لہجہ خود بخود نم ہوگیا۔
''آئم سوری۔'' اس کی نگاہ اس کے آسودہ چہرے پر جمی ہوئی تھی اور اسے لگا وہ مزید پستی میں چلا گیا ہو۔ معافی کے یہ الفاظ بے اختیار اس کے منہ سے نکلے تھے۔ کیونکہ خود کو تو وہ اس قابل بھی نہیں سمجھ رہا تھا۔
''او پلیز۔'' اس نے فوراً ٹوک دیا تھا۔
''چلتی ہوں اپنا خیال رکھنا۔'' اس سے مزید ٹھہرنا مشکل ہوگیا تھا۔ وہ جاتے ہوئے بے اختیار اس کے گلے سے لگی تھی۔ چند موتی ٹھہرے ہوئے تھے جو رخساروں سے بہہ گئے تھے جنہیں وہ اس سے چھپاتی تیزی سے الگ ہوئی تھی اور اپنی مخصوص مسکراہٹ اسے دیتی ہوئی واپس پلٹ گئی تھی۔ سانسوں میں اترتی اس کی خوشبو نے اسے اندر تک جھنجھوڑ دیا تھا۔ وہ خاموش سا اسے جاتا دیکھتا رہا تھا۔

☆......☆

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے اپنے گلاس اتار پھینکے تھے اور خود پر باندھے ضبط توڑ دیے تھے اب تنہائیوں کے دشت میں چلنا تھا ریت کی دھوپ نے اس کے وجود کو جھلسا دیا تھا، سیل درد اس کے رگ و پے میں اترنے لگا تھا، اتنا آسان نہ تھا جتنا اس نے سمجھ لیا تھا، اماوس کی رات اس کی زندگی میں بھی اتر آئی تھی، جسے زندگی سمجھ رہی تھی وہ تو بس محبت کا گماں تھا۔

☆......☆

جہاز کی کھڑکی سے باہر اس کی نگاہیں چھوٹی ڈبیوں کی صورت اختیار کرتی دنیا پر جم سی گئی تھیں۔ ایک نئی پرواز آج پھر اڑنے جا رہا تھا وہ نجانے اب کامیابی نے مقدر بننا تھا یا ناکامی نے وہ کتنی ہی دیر تو پچھلے گزرے ماہ و سال کا سیاق و سباق ہی کرتا رہا تھا۔ زندگی میں کیا پانا تھا اور کیا پایا اور کیا پا کر کیا کچھ کھو دیا تھا۔ سوالوں کی الجھی گتھیوں نے اسے بھی الجھا دیا تھا۔ انسان بڑا عجیب ہوتا ہے۔ انسان بے لگام مادی خواہشوں کے پیچھے بھاگتا ہے کامیاب ہوتا ہے تو فخر سے خود کو سراہتا ہے اور جب ناکامی مقدر بن جائے تو سب مورد الزام قسمت کو ٹھہراتا ہے۔ تو کیا اس نے بھی اس بات کی تیاری کر لی تھی۔ اپنی ناکامیوں کے الزام قسمت کی جھولی میں ڈالنے تھے۔ ضمیر نے اسے جھنجوڑا تھا اور خود کو جھٹکے سے اس نے نفی کی تھی۔ وہ تسلیم کرتا تھا کہ وہ کسی کے صاف دل سے وہ کھیل گیا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ اس نے کبھی محبت کی ہی نہ تھی۔ محبت تو بلکہ کی ہی اس سے تھی لیکن محبت اس کی مادی خواہشوں کے آگے دب سی گئی تھی۔ سیویم نے اسے دیکھا نہ تھا پر اس نے اس کے لیے رائے بہت ٹھوس دی تھی اس کا دل صاف تھا معصوم تھا پاک تھا۔ مادی چیزوں سے پاک تھی وہ نہیں جانتا تھا اس کی زندگی کے کیا قصے تھے۔ پر اتنا جانتا تھا خوشی اور مسکراہٹیں اس کی دوست نہ بنتی تھیں، کبھی غلطی سے مسکرا دینے والی یوں لگتا تھا کوئی بڑا احسان کرتی ہو وہ اپنے آپ کو راز میں رکھتی تھی۔ اس کی ذات اتنی ہی راز تھی جیسے سمندر میں چھپا خزانہ، ہاں شاید وہ اس راز کو جان لیتا تو اس مقام پر آج کھڑا ابھی نہ ہوتا اور اس کا وجود بھی ایک مرد کی محبت کے آگے ڈھیر ہو گیا تھا۔ پھر وہ کیسے برباد نہ ہوتا دلوں سے کھیلنا اتنا آسان ہوتا تو شاید محبت کی کبھی تاریخ نہ لکھی جاتی، محبت کبھی اپنا وجود نہ بنا پاتی، اس نے تھکے ہوئے مسافر کی طرح بیک سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندھ لی تھیں۔

☆......☆

جس وقت وہ نگہت کے گھر پہنچا گھر میں سے ڈھولک اور تالیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ پل بھر میں سمجھ گیا تھا یقیناً یہ زارا کی شادی کے ہنگامے تھے۔ دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ یعنی آپا نے اسے نہیں بلایا تھا۔ وہ بلاتیں بھی کیسے زارا کی ضد کے آگے اسے لگا زمین نے اس کے قدم جکڑ لیے ہوں۔ سب کا سامنا کرنا اتنا آسان بھی نہ تھا، جوں جوں اس کے قدم اندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ہر ایک کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اسے کسی چیز کا اتنا خوف نہ تھا۔ جتنا خوف اس بات کا تھا کہ وہ اگر وہاں ہوئی تو وہ کیسے آنکھ ملا پائے گا وہ الجھے ہوئے احساسات میں گھرا اندر داخل ہو گیا تھا۔ ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے سب کو بغور دیکھا تھا مگر وہ نہیں تھی وہاں، اس کی آمد پر کئی گردنیں اس کی جانب اٹھی تھیں اور پھر سب ساکت ہو گیا جیسے تالیوں اور ڈھول کی آواز سے گونجتا گھر یکدم سناٹے میں تبدیل ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں مہمان رخصت ہو گئے اور وہ مجرم بنا گھر کے تین افراد کے بیچ میں بیٹھا تھا۔

''یہ کس منہ کے ساتھ آئے ہیں اور کیا لینے آئیں ہیں اب۔'' زارا نفرت سے بولی تھی اپنے ماں باپ سے۔

''زارا! آپ چپ رہیے۔'' امجد صاحب نے بیٹی کو تنبیہ کیا۔

''پاپا......!'' وہ حیرت سے بولی تھی۔

''میں نے کہا ناں۔'' اب کے وہ سختی سے بولے اور وہ نفرت سے سر جھٹک گئی۔ نگہت کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ وہ شفیق کی طرف متوجہ ہوئے۔

''دیکھو شیث! یہ تمہاری بہن کا گھر ہے میں تمہیں کبھی بھی یہاں آنے سے نہیں روکوں گا مگر ایک بات اچھی طرح سمجھ لو، میں اب مزید کوئی بدمزگی نہیں چاہوں گا۔'' امجد صاحب نے دوٹوک کہا وہ کافی صلح جو انسان تھے۔ انہوں نے سختی سے کہا تھا مگر اپنی عادت کے خلاف وہ اسے دوٹوک کہہ کر اٹھ گئے تھے۔ زارا بھی نہ رکی۔ وہ سر جھکائے بیٹھا رہا خود کو اس رویے کا وہ حق دار سمجھتا تھا پر بہن تو ماں جائی تھی۔ اسے یوں بکھرا ہوا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھا تھا۔

''شیث! کیوں آئے ہو وا پس تمہارے لیے اب کچھ بھی نہیں بچا جس کے لیے آئے ہو، وہ تو اب یہاں ہے بھی نہیں۔'' وہ نم آنکھوں سے اسے بغور دیکھ رہی تھیں جس کے چہرے پر خاموشی تھی۔ وہ چپ رہا وہ اسے دیکھتی رہیں۔ پھر اس نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

''میں صرف اس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔'' اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور لہجہ ٹھوس مگر انہوں نے بہت کچھ اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ سنہری چمکتی آنکھیں سرد پڑ چکی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر چپ سی ہو گئیں۔

☆......☆

''نہ جانے کہاں سے آپ میں اتنی ہمت آ گئی۔'' وہ رات کے پہر لان میں کھڑا تھا جب عقب سے زارا کی تیز آواز ابھری، وہ پلٹا تھا اس کی نگاہ زارا کے اداس چہرے پر پڑی تھی۔ وہ بظاہر جتنی بھی کٹھور بن جاتی پر شیث میں اس کی جان تھی اس نے بہت اس کے لاڈ اٹھائے تھے۔ محبت کے معاملے میں جب وہ شدت پسند تھی تو ناراضی بھی اتنی ہی شدت سے کی تھی۔

''آپ کو کیا لگتا ہے ماموں! کیا غلطیوں کا مداوا اتنا آسان ہوتا ہے کہ معافی مانگو اور سب پہلے جیسا ہو جائے ہو سکتا ہے کہ کفارے تکلیف پر کچھ مرہم کا کام کر دیں مگر میں سمجھتی ہوں طوفان کے گزرنے کے بعد اس کے اثرات ضرور رہ جاتے ہیں۔'' وہ ہر لفظ چبا کر ادا کر رہی تھی اور وہ چپ چاپ اسے سن رہا تھا۔

''کتنی عجیب بات ہے ماموں! آپ کو ہمیشہ ہر چیز مکمل اچھی لگتی تھی، نمل کے ساتھ تعلق بھی اس لیے توڑا کہ شاید وہ آپ کی نظر کے ترازو میں مکمل نہ تھی۔ ظاہر ہے ایک غریب عام سی لڑکی آپ کو کیا دے سکتی تھی۔ پر کل جب آپ اس سے ملیں گے تو غور ضرور کیجیے گا کہ اب وہ مکمل ہے یا نہیں۔'' اس کا طنز میں ڈوبا لہجہ بالکل سچ تھا مگر ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ اس نے کبھی بھی سیویم اور نمل کا مقابلہ نہیں کیا تھا، سیویم دوست تھی اور نمل محبت اگر وہ میلبورن گیا تھا تو صرف اپنے لیے اپنے آپ کو مکمل بنانے کے لیے دولت، عزت، تعلیم وہ خود کو ہر طرح سے مکمل دیکھنا چاہتا تھا، خود کو مکمل کرتے کرتے اس نے اتنا ادھورا رہ جانا تھا اس کا تصور نہیں کیا تھا اس نے۔

''ماموں! کیا کھیلا ہے آپ نے زندگی سے، بہت کچھ پانے کے چکر میں سب کچھ گنواتے ہی چلے گئے۔'' اب کے اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں اور ایک کھوکھلی ہنسی کے ساتھ وہ بولی تھی۔ یہ نمی اس کے دیئے ہوئے دکھ کی نہ تھی بلکہ اسے یوں اجاڑ دیکھ کر دکھ خود بخود اس کے اندر اتر گیا تھا۔ وہ اندر کی طرف پلٹ گئی اور وہ خاموش اسے جاتا دیکھ کر رہ گیا تھا۔

☆......☆

وہ نگہت کے ساتھ گاؤں بھٹ شاہ روانہ ہوا تھا۔ وہ اب یہاں نہیں رہتی تھی۔ کیوں؟ یہ جاننے کی کم از کم اس میں جرأت نہ تھی۔ دوران سفر آپا نے خود ہی اسے بتا دیا تھا فرحت کی جس سے شادی ہوئی تھی انہوں

نے خاندانی مسائل کی وجہ سے اپنے شہر میں ہی رکھا تھا۔ کچھ ہی عرصہ قبل وہ نمل اور فرحت کو لے گئے تھے۔ آپا اسے کافی تفصیلات بتاتی رہی تھیں۔ پر اس کا دماغ ایک ہی نقطے پر اٹک گیا تھا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا نمل باپ کی شفقت سے محروم تھی۔ وہ زندہ تھے یا نہیں اس بات کو اس نے کبھی جاننا چاہا ہی نہیں، اس کی پرورش نانا، نانی اور ماں کے سائے تلے ہوئی تھی اس کے باپ کا تعلق کہاں سے تھا۔ کون تھا؟ نہ اس نے جاننا چاہا اور نہ اس نے بتایا پر اب اچانک یہ انکشاف حیرت زدہ تھا۔ اس کی محبت صرف لفظوں تک تھی۔ کسی نے اسے جھنجوڑا تھا۔ اس کی زندگی کے کیا مصائب تھے کبھی اس نے جاننا ہی نہ چاہا وہ سوچتا سوچتا مزید پستی میں چلا گیا تھا۔

پر پیچ سفر کا اختتام قریب تھا۔ بھٹ شاہ کے گاؤں کی حدود میں جب داخل ہوئے تھے شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔

''شیث! شاہ جی کے مزار پر رو کنا فاتحہ پڑھ کر جائیں گے۔'' ان کے کہنے پر شیث نے اثبات میں گردن ہلائی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ لوگ مزار کے سامنے تھے۔ نیلے روغنی ٹائیلز سے بنا مزار ڈھلتی شام کے وقت روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ اس نے گاڑی سے نکلتے ہوئے مزار پر طائرانہ نگاہ ڈالی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مزار پر آیا تھا وہ اس مشہور ہستی کے بارے میں پڑھ اور سن چکا تھا اور آج حقیقی طور وہ اس پاک ہستی کے در پر تھا۔ وہ لوگ اندر کی جانب بڑھ گئے تھے۔ لوگوں کے ہجوم کو کراس کرتے ہوئے وہ لوگ پہنچے تھے۔ وہ فاتحہ پڑھنے کے بعد باہر آ گیا تھا۔ جب کہ نگہت ابھی دعا مانگ رہی تھیں۔ شام کے ملگجے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ مزار کے کشادہ صحن میں لوگوں کا ہجوم جمع تھا۔ شاہ کا کلام سننے کے لیے تین عمر رسیدہ آدمی جو سیاہ چوغے میں ملبوس، رنگ برنگی موتیوں کی مالا پہنے فقیری حلیے میں تھے سر اور داڑھی کے بال بڑھے ہونے کی وجہ سے وہ کوئی ملنگ معلوم ہوتے تھے۔ وہ ان سب پر بغور نظر ڈالتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا اور ایک گھنے درخت سے ٹیک لگا کر نگہت کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں ان تین ملنگوں کی آواز ہوا میں رقص کرنے لگی تھی۔ وہ ایک ہی آواز میں پڑھتے کوئی سحر پھونک رہے تھے۔ اس کی بھی توجہ ان کی جانب خود بخود مبذول ہو گئی تھی۔ کلام کی تاثیر تھی کہ ماحول میں ایک روحانیت سی اتر رہی تھی۔ لوگ مدہوش ہو گئے تھے۔ ہوا میں رقص کرتی ان کی آواز خوب صورت کلام کے ساتھ پرسوز معلوم ہوتی تھی۔

وہی ایک شایانِ جود و سخا ہے
ہر اک آدمی اس کے در کا گدا ہے

وہ شاہ کا کلام پڑھ رہے تھے۔ وہ سنتے ہی سمجھ گیا تھا اس نے اس کا ترجمہ پڑھا ہوا تھا پر ایسا لگ رہا تھا وہ پہلی بار سن رہا ہو نہ جانے ان کے پڑھنے کا ہنر اتنا کمال کا تھا کہ وہ خود بھی اس ماحول میں گم ہو گیا تھا۔

وہ کلام کے ہر لفظ کو بغور سن اور سمجھ رہا تھا۔ ہر ایک لفظ حقیقت میں ڈوبا تھا۔ وہ روحانیت سے واقف نہ تھا۔ خدا اور بندے کی محبت کا تعلق کیا ہے، اس نے کبھی اس بات پر غور نہ کیا تھا مگر یہاں کھڑے وہ اس حقیقت کو آج محسوس کر رہا تھا۔ شاید اس جگہ کی مٹی بھی اس بزرگ کی محبت کی گواہی دے رہی تھی کہ یہاں کی ہواؤں میں بھی ایک سکون سا محسوس ہوتا تھا۔

کلام ایک پل کے لیے تھم سا گیا تھا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اسے آئینہ دکھا دیا ہو، جس میں اس کا چہرہ سیاہ نظر آ رہا تھا۔ ہاں وہ پشیمان تھا بے چین تھا، مضطرب تھا، اس نے خود سے سب اعتراف بھی کر لیے تھے اور

جس کے پاس آج وہ جا رہا تھا اپنی اسی ندامت کے تحت پر ان سب میں وہ ایک ہستی سے غافل تھا اس نے ایک مرتبہ بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا جس نے اسے پیدا کیا اس کی قسمت لکھی اس نے آزمائش میں ڈالا، اس کے گناہ پر اس کے دل کو مضطرب کر دیا تھا کیوں کس لیے وہ کیا سمجھانا چاہ رہا تھا۔

وہ بھٹکتا رہا تھا۔ یہاں تک کہ تھک گیا پھر بھی اس کے آگے سجدہ کیا وہ تو ہر چیز کو پرفیکٹ دیکھنا پسند کرتا تھا، اس بات سے غافل ہر چیز نامکمل ہے خدا کے علاوہ کیا وہ صرف اس بات کی وجہ سے پکڑ میں آ گیا تھا؟ ضمیر نے جھنجھوڑ کر اس سے پوچھا وہ پسینے سے شرابور ہو گیا تھا۔ سوچوں کا اژدھام تھا یا خدا کا خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت سے انجان تھا۔ دماغ کی ایک گرہ کھلی تھی اور وہ چند لمحے میں سمجھ گیا تھا۔ ماضی کا ایک ایک منظر آنکھوں کے آگے لہرا رہا تھا۔ وہ جو ڈیڑھ سال سے خوار ہو رہا تھا۔ سب کچھ پا کر بھی وہ مضطرب تھا۔ اس کی وجہ شب و روز ڈھونڈتا تھا اور آج صرف چند لمحے لگے تھے۔

وہ سمجھتا رہا تھا اسے بددعا ہے اس بات سے بے خبر ایک بددعا تو خود اس نے اپنے لیے تیار کر لی تھی اس کی سوچ اسی کے لیے بددعا بن گئی تھی، اپنی بربادی کا سامان وہ خود اپنے ہاتھوں سے جمع کرتا رہا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں تھیں مضطرب سی پشیمان سی ایک غفلت بھری زندگی گزارتا آیا تھا وہ، اب تک یہ سوچ کر اس کے اعصاب منجمد ہو گئے تھے۔ وہ بے بہرہ تھا صرف بے بہرہ۔

''چلو شیث۔'' نگہت کے پکارنے پر وہ چونکا تھا سوچیں یکدم معدوم ہو گئی تھیں مگر اس کا وجود پتھر کا سا ہو گیا تھا۔ اسے لگا شاید اب اس کے قدم بھی اٹھ نہ پائیں گے۔



ایک بڑی حویلی کے آگے اس نے گاڑی روکی تھی۔ نگہت یہاں آتی جاتی رہتی تھیں انہیں یہ راستہ اچھی طرح ازبر تھا۔ نگہت نے اسے گاڑی سے اترنے کا کہا تھا اور وہ بھی کسی روبوٹ کی طرح ان کے پیچھے چل دیا تھا۔ لوہے کے بڑے سے آہنی گیٹ کے باہر دو گارڈز اسلحے سے لیس کھڑے تھے۔ نگہت کو پہچاننا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ انہوں نے سلام کر کے ان کے لیے گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ گھر کے بیرونی احاطے میں داخل ہوئے جو وسیع ترین تراشیدہ گھاس پر مشتمل تھا۔ بڑے بڑے آم، ناریل، برگد اور مختلف قسم کے پیڑ ہوا کے زوروں پر جھوم رہے تھے۔ دائیں جانب سفید ماربل کا آبشار بنا ہوا تھا جس کا تیز بہتا پانی خاموشی میں رقص پیدا کر رہا تھا۔ دیواروں سے لپٹی بوگن ویلیا کی بیلوں نے دیوار کو چھپا دیا تھا۔ بائیں جانب بیٹھنے کے لیے لکڑی کی کرسیاں اور ٹیبل رکھے ہوئے تھے جس کے اطراف میں خوب صورت پودوں کو تراش خراش سے سجایا ہوا تھا۔ گھر کے احاطے کو لان کی شکل دے دی تھی۔ احاطے کے وسط میں لال اینٹوں سے راستہ بنایا ہوا تھا جو گھر کے اندرونی دروازے کی طرف جاتا تھا۔ لان کے بعد پورچ کا حصہ شروع ہو جاتا تھا چکنے ماربل پر قطار سے چمچماتی گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں، اس نے کسی بھی چیز کو بغور نہیں دیکھا تھا۔ وہ واقعی کسی روبوٹ کی طرح چل رہا تھا۔ اس کا دماغ کسی اور ہی کشمکش میں گرفتار تھا۔ وہ لوگ جب اندر داخل ہوئے تو پورا ہال لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کی سج دھج پھولوں اور برقی قمقموں سے سجاوٹ وہاں کسی تقریب کا پتا دے رہی تھی۔ فرحت کی نظر معاً ان پر پڑی وہ فوراً ان کی جانب بڑھی تھیں مسکراتے ہوئے انہوں نے جھٹ نگہت کو گلے لگا لیا تھا نگہت بھی دل سے مسکرائیں تھیں فرحت کی نگاہ شیث پر پڑی تھی اسے دیکھ کر وہ کھل اٹھی تھیں۔

''تم نے بتایا نہیں شیث آیا ہوا ہے۔'' انہوں نے اس کے سر پر پیار دیا تھا پر مخاطب نگہت سے تھیں۔ اسے ایک جھٹکا لگا تھا۔ فرحت کے اس رویے کی کم از کم وہ امید رکھ کر نہیں آیا تھا۔ نگہت بس جواباً مسکرا دی تھیں۔

''اچھا چلو اندر بیٹھتے ہیں یہاں بہت رش ہے۔'' وہ انہیں ڈرائنگ روم کی طرف لے کر بڑھ گئی تھیں۔ کچھ ہی دیر میں ملازم نے انہیں ٹھنڈا مشروب پیش کیا۔

''اصل میں آج میری جٹھانی کے بڑے بیٹے کی مہندی ہے، سب ابھی لڑکی والوں کی طرف جا رہے ہیں۔ اس لیے افراتفری کا عالم ہے۔'' انہوں نے وضاحت دی۔ شیث الجھی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کئی سوال اسے الجھا گئے تھے۔ ان کا محبت بھرا انداز اسے چونکا رہا تھا۔ کیا وہ انجان تھیں حقیقت سے یا اپنا اندر چھپا رہی تھیں۔ پر وہ کس مشکل سے ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ وہی جانتا تھا۔

''تم کب واپس آئے ہو شیث؟'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

''جی پچھلے ہفتے۔'' وہ بڑی مشکل سے بولا۔

''ویسے تو نگہت سے میں تمہاری خیریت پوچھتی رہتی تھی پر جب تک آنکھوں سے نہ دیکھو کہاں تسلی ملتی ہے۔'' وہ اپنے مخصوص محبت بھرے انداز سے بول رہی تھیں اور ان کے اس انداز پر وہ شرمندگی سے زمین میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔

''بی بی! صاحب بلا رہے ہیں۔'' ملازمہ اندر آئی تھی اور بڑی عجلت میں فرحت کو پیغام دے کر گئی تھی۔

''میں ابھی آتی ہوں۔'' وہ باہر کی جانب بڑھ گئیں۔

''آپا! کیا آپ نے انہیں سب بتا دیا تھا۔'' وہ نگہت کی طرف متوجہ ہوا تھا اور وہ ایک پل کو اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

''تمہیں معلوم ہے وہ دل کی مریضہ ہیں اور نمل کے لیے بے حد حساس، ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے تھے اور تمہارے لیے بھی بہتر ہوگا اسے اس خوش فہمی میں رہنے دو۔'' ان کا لہجہ خود بخود سرد ہو گیا تھا اور آگے وہ مزید کچھ نہ بول پایا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ ڈھلتی سیاہ رات کے اندھیرے میں وہ اپنا آشیانہ تلاش کرتا رہا ہو اور جب دھوپ ملی تو سائبان ہی کھو دیا۔ وہ زندگی کو خواب کی طرح گزارتا رہا اور جب آنکھ کھل ہی گئی تو وہ آشیاں سے بھی محروم ہو گیا تھا اسے لگا جیسے اس پر کنکروں کی بارش ہو رہی ہو۔ اس سے وہاں بیٹھنا اب مشکل ہو رہا تھا۔ اتنے میں فرحت اندر داخل ہوئی تھیں۔

''نگہت! تم لوگ فریش ہو جاؤ، میں کھانا لگوا دیتی ہوں۔''

''ارے نہیں بالکل بھوک نہیں ہے۔ تم اس تکلف میں مت پڑو۔'' انہوں نے صاف کہا۔

''کیسی باتیں کر رہی ہو اتنے لمبے سفر سے آئی ہو۔ شیث کو بھی بھوک لگی ہوگی۔''

''نہیں آنٹی پلیز! آپا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولا تھا ساتھ ہی ایک فون کال کا بہانا کر کے وہ نکل گیا۔ اندر اس کا سانس گھٹنے لگا تھا۔ اسے اپنا آپ انتہائی چھوٹا لگ رہا تھا۔ وہ اپنے عمل سے بے خبر رہتا تو شاید اتنی تکلیف نہ ہوتی مگر اب تو عمل کسی آئینے کی طرح اس کا اصل بتا چکا تھا۔ وہ ہال سے گزرتا، باہر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ہال مکمل طور پر خالی ہو چکا تھا۔ سب ہی لوگ مہندی لے کر روانہ ہو گئے تھے۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹے کا راج قائم ہو گیا تھا۔ اس نے ابھی دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ملازم کی پکار

پرتھم سا گیا تھا۔

''صاحب!'' اس کی آواز پر وہ پلٹا۔

''بی بی کہہ رہی ہیں آپ آرام کر لیجیے آپ کا کمرہ تیار کروا دیا ہے، آئیے میں دکھا دوں۔'' وہ ادب سے بولا۔ وہ بے بس سا ہو گیا۔

''آئیے صاحب!'' ملازم نے اسے ہنوز کھڑا دیکھ کر کہا۔

ہار کر وہ ملازم کے پیچھے چل دیا۔ ہر اٹھتے قدم پر اس کا دل بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بہت ہمت کر کے آ تو گیا تھا مگر اب لگ رہا تھا وہ شاید سب ہمتیں گنوا چکا ہے۔

شاید وہ کبھی اتنا نادم نہ ہوتا اگر اسے یہ احساس نہ ہوتا کہ جن کی زندگیوں کے ساتھ اس نے کھیلا ہے وہ کوئی عام سے نہیں تھے۔ ان کی سادگی اس کے لیے سب سے بڑی سزا بن گئی تھی۔ ہال کے دائیں جانب کے آخری سرے پر سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں جو اوپری منزل کی جانب جاتی تھیں۔ ملازم اسے اسی طرف لے کر بڑھا تھا بلاشبہ وہ ایک خوب صورت حویلی تھی۔ جس کی سجاوٹ سے دولت کی ریل پیل کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اوپر کے حصے میں وہ داخل ہوا اور ایک نگاہ اطراف میں ڈالی جہاں وہ کھڑا تھا وہ بڑا سا ہال تھا۔ ہال کی چھت پر کانچ کا بنا فینسی فانوس لٹکا دودھیا روشنیاں بکھیر رہا تھا۔ ہال کے دائیں اور بائیں جانب قطار سے چار پانچ کمرے بنے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ہلکے اسکن پینٹ پر خوب صورت پینٹنگز اور تصویریں آویزاں تھیں اور ہال کے وسط میں سٹنگ ایریا بنایا ہوا تھا۔ ہر چیز خوب صورتی اور نفاست سے سجائی گئی تھی۔ ملازم اسے اس کا کمرہ دکھا کر چلا گیا تھا۔ وہ ہال پر نظر ڈالتا ہوا زارا کی بات سوچ رہا تھا۔ اس کے طنز کا مطلب وہ اب سمجھ گیا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت تھی اس نے نمل سے محبت بنا کسی حرص کے کی تھی، جب وہ مال و دولت کی حیثیت میں کم تھی، تب بھی اور آج بھی وہ اس کے لیے ایک ہی جذبہ رکھتا تھا، اس نے اسے کسی کے لیے نہیں چھوڑا تھا بلکہ اپنی خواہشوں کی عوض وہ بھٹکا تھا اور بھٹکے ہوئے مسافر کو کس مشکل سے منزل ملتی ہے اس کا اسے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب بے اختیار اس کی نظر ہال کے آخری سرے پر پڑی تھی۔ وہ سیٹنگ روم تھا جس کے دروازے پر کرسٹل کی لڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ جس کی اوٹ میں اسے کسی شناسا کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ بے آواز قدموں سے آہستہ آہستہ اس جانب بڑھا ہر قدم پر اس کی دھڑکن کی رفتار تیز ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے وجود سے اٹھتی خوشبو کو تو وہ کسی بھی ہجوم میں بھی پہچان سکتا تھا۔ تو اب کیسے فراموش کر دیتا، وہ چوکھٹ پر آ کھڑا ہوا تھا اور زمین نے جیسے اس کے قدم جکڑ لیے تھے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے لگا تھا۔ وہ اسے کیسے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی سلگتی آنکھوں میں ایک سمندر کی طرح ہر لحظہ اترتی تھی جس کی یاد مٹانے کے لیے جام اٹھا کر وہ میخانوں کا رخ کرتا تھا۔ پر یادوں کی پیاس تب بھی نہ بجھتی تھی۔ اس کی حزین نم آنکھیں اس کی ذات میں خم ڈالتی ہر پل ابرتانے رکھتی تھیں۔ اپنے سلگتے جذبات کو بجھانے کے لیے اپنے مکان کو پانی میں رکھ دیا تھا پر بجھنے کے بجائے سب ڈوب گیا تھا۔ ہر گزرتا لمحہ اس کے دماغ کے پردے پر لہرا رہا تھا اس کی اذیتیں اس کی بے چینیاں، بے تابیاں بے حساب تھیں، وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح بکھر گیا تھا۔ ہجر کی پیاس بجھانے کے لیے وہ اس کے ایک دید کے قطرے کے لیے بھی ترستا رہا تھا، پر آج دید کا یہ لمحہ بھی کم لگتا تھا۔ وہ اسے یک ٹک دیکھتا رہا جس کی آنکھیں بند تھیں اور لب ہلتے تھے اور سر بارگاہ الٰہی کے آگے جھکا ہوا تھا اس کے چہرے پر الوہی چمک تھی۔ اس کا محور

عبادت میں گم تھا۔ وہ ارد گرد سے بالکل غافل تھی جب کہ وہ گزرتے وقت سے بے نیاز کھڑا تھا۔ نہ جانے انسان کیوں ٹھوکر کھا کر ہی سنبھلتا ہے، اس کے دل نے گلہ کیا تھا۔ وہ آج جتنی قیمتی لگ رہی تھی آج سے پہلے اس کی ویسی قدر و قیمت نہ تھی۔ وہ اگر اسے پانے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا تو اسے کھونے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا تھا انسان کسی ڈوری کی طرح ایک دوسرے سے بندھ جاتا ہے۔ اس کے احساسات جذبات کسی ایسے انسان سے بندھ جانا جس سے کوئی رشتہ نہ ہو یہ قدرت کا ایک کرشمہ ہی ہے۔

اس نے دعا مانگنے کے بعد منہ پر ہاتھ پھیر کر جائے نماز لپیٹ دیا تھا پر نگاہیں باہر کھڑے وجود پر نہیں ڈالی تھیں۔ حالانکہ اس کی آمد کو اس نے محسوس کر لیا تھا۔ اس کے وجود میں جنبش نہ ہوئی۔

''تم اندر آسکتے ہو شیث۔'' وہ اس کی جانب بنا پلٹے بے حد عام سے لہجے میں بولی۔ اس کی آواز پر وہ ہوش میں آ گیا تھا جیسے...... لیکن قدم اندر کی جانب نہ بڑھ سکے۔ یوں لگتا تھا قدموں پر کوئی پہاڑ آ گرا ہو اس کے ہنوز کھڑے رہنے پر وہ پلٹی تھی۔ ایک طویل ماہ و سال کے بعد وہ روبرو کھڑے تھے اس کی آنکھوں میں وہ دکھ نہ پایا تھا جب کہ وہ گم صم سی اسے دیکھ رہی تھی اس کا دل ہر احساس سے عاری تھا مگر اس کی چوکھٹ پر یوں اسے اجاڑ دیکھ کر دل میں ایک ہوک سی اٹھی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس سے اس نے بے پناہ محبت تو کر لی تھی مگر نفرت نہ کر سکی تھی۔ اسے کوئی بد دعا نہ دی تھی۔ کوئی آنسو نہ بہایا تھا مگر پھر بھی وہ اجاڑ کھڑا تھا۔ زیست کی طویل راتوں میں کوئی پہر ایسا نہ گزرا تھا جب اس کے خیال کا جھماکا نہ ہوا ہو مگر پھر بھی وہ جذبات کی تعمیر اینٹوں سے کرتی رہی تا آنکہ دل کبھی بھی اسے دیکھ کر ملال میں نہ دھڑکے۔ وہ اپنے احساسات پر قابو پانے میں کامیاب تو ہو گئی تھی مگر اسے یوں دیکھ کر بے چین ضرور ہوئی تھی۔

''جب یہاں تک آ گئے ہو تو یوں گم صم کھڑے رہنے سے وقت تھم نہیں جائے گا۔'' اس کے سپاٹ لہجے پر چونک کر اس نے دیکھا تھا جو اسے بے آب و رنگ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے چہرے سے کچھ بھی بھانپ نہ پایا تھا اس کا چہرہ ہر تاثر سے پاک تھا۔

''بیٹھو۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے صوفے کی جانب اشارہ کیا تھا اور وہ بھاری قدموں کے ساتھ اندر بڑھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چپ نے اس کے گرد احاطہ کیا ہوا تھا۔ وہ بھی خاموش سی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے اوپر اس کی نگاہوں کی تپش محسوس ہو رہی تھی مگر اس نے نگاہ اٹھائی نہیں تھی وہ ایسے چپ تھا جیسے لفظوں کو ترتیب دے رہا ہو اسے نہیں سمجھ آ رہا تھا کیا کہے کیسے کہے اسے نہیں لگتا تھا کوئی لفظ بھی ایسے ہوں گے جو اس کے عمل کا مداوا کر سکیں۔ کتنا ہی وقت ان کا خاموشی کی نظر میں گزر گیا تھا۔ زندگی کی حقیقتوں سے یوں واقف ہونا تھا اور ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنا تھا، یہ عمل اتنا تکلیف دہ ہونا تھا اس کا گمان بھی کبھی نہ کیا وہ بھٹکتے بھٹکتے تاریک راتوں کی سیاہی میں آشیانے تک پہنچ گیا تھا حالانکہ اسے یقین نہیں تھا پر کوئی غیر معمولی طاقت تھی جو اسے یہاں تک لے آئی تھی۔ زیست کی چوکھٹ تو پار کر لی تھی مگر تلافی کا مرحلہ مشکل تھا۔

اس کی آنکھوں کی تپش نے اس کی خاموشی کو توڑ دیا تھا اس کے لبوں میں جنبش پیدا ہوئی تھی۔ سلگتی آنکھوں میں ملاحت تھی جس میں گزرے ماہ و سال کی داستان رقم تھی۔ وہ بولتا رہا اور وہ سنتی رہی چپ چاپ یہاں تک کہ وہ تھک گیا۔ معافی کا چھوٹا سا لفظ جو کسی بھی تکلیف کا مداوا نہیں کر سکتا تھا لیکن پھر بھی اس نے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ فیصلہ بھی اسی کے سپرد کر دیا تھا۔ لمبی مسافت کے بعد دونوں کے بیچ خاموشی پھر آ ٹھہری تھی۔ وہ منتظر تھا اس کے بولنے کا اس نے ہر بات بغور سنی تھی وہ حیران نہ ہوئی تھی یہ تو

اسے تب ہی معلوم ہو گیا تھا۔ جس دن وہ چلا گیا تھا۔ اس کے چہرے پر نا کوئی دکھ تھا نہ ہی چنبھا لیکن آنکھوں میں سناٹا ضرور تھا سب کچھ ختم ہو جانے کا۔

''میں نے تمہیں معاف اسی دن کر دیا تھا جس دن تم چلے گئے تھے۔'' وہ بہت ٹھہرے اور خاموش لہجے میں بولی تھی اور اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا تھا جہاں گہرا سناٹا تھا۔

''تم مجھے اتنی آسانی سے کیسے معاف کر سکتی ہو۔'' اس کے لہجے میں خود کے لیے بے رحمی تھی جب کہ وہ اس کی بات پر پھیکا سا مسکرائی تھی۔

''جب خواہشات ہی مر جائیں تو درد نہیں ہوتا اور جب درد ہی نہ ہو تو معاف کرنا مشکل نہیں ہوتا۔'' اس کا لہجہ برف کی طرح منجمد تھا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گیا تھا کسی کو زندہ رکھ کر مردہ کر دینا کیسا ہوتا ہے اسے دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس کا دل چاہا خود کو تہس نہس کر لے، اپنا وجود کسی دلدل میں دھنستا ہوا محسوس ہو رہا تھا اگر وہ کسی کے مسکرانے کی وجہ بنا تھا تو آنسوؤں کی وجہ بھی وہی تھا۔

''میں شاید ماضی کا کسی بھی طرح مداوا نہیں کر سکتا اگر مجھے سکون حاصل نہیں ہوتا تو یہ کچھ غلط نہیں ہے۔ میں واقعی حق دار ہوں اس چیز کا۔'' وہ ہار گیا تھا۔ اسے لگا اب وہ واقعی سانس نہیں لے پائے گا اس نے خدا کو بھی ناراض کیا تھا اور اس کے بندے کو بھی اسے اپنے تمام راستے مسدود نظر آ رہے تھے۔ وہ اس کے چہرے کو پڑھ رہی تھی اسے لگا اگر وہ اب نہ بولی تو اس نے سچ مچ تہس نہس ہو جانا تھا۔ وہ دکھ اور کرب میں تھا ندامت کے ساتھ اور وہ واحد بچی تھی جو ندامت کے خول کو مٹا سکتی تھی۔

''کیسے سوچ لیا تم نے ایسا تمہاری ندامت ہی تمہارا مداوا ہے۔'' اس کے جواب پر وہ درد سے مسکرایا تھا۔

''لفظوں میں کہنا شاید آسان ہے پر جب نگاہ تمہارے چہرے کی طرف اٹھتی ہے تو مجھے اپنے آپ سے مزید نفرت ہونے لگتی ہے۔'' وہ ایک درد سے بولا۔ اس کی بات پر کچھ آنسو قطرے کی طرح دل پر گرے تھے۔ وہ اس کی ایسی ہی شدت زدہ محبت کے آگے ڈھیر ہوئی تھی اور اسی شدت سے بکھری بھی اور آج وہی شدت اس کے خود کے لیے تھی اپنے آپ سے نفرت کی تفسیر اس کی آنکھوں میں نمایاں تھی۔ اس کی اس شدتوں نے اسے برباد کیا تھا۔ بے شک وہ نادم تھا مگر شدتوں کا مقام آج بھی وہی تھا۔

''انسان مٹی ہے اور اس کا گمان خوشبو جس میں وہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ خواب خواہشیں آرزوئیں پنپتا رہتا ہے اس بات سے بے خبر خوشبو جتنی تیزی سے مدھر ہو کر سانسوں میں اترتی ہے اتنی ہی تیزی سے وہ اپنا قیام بھی مٹا دیتی ہے۔ پھر انسان متوحش سا اس کو تھامنا چاہتا ہے۔ اس بات سے بے خبر وہ خوشبوں کے گماں کی صورت جس کا نہ تن ہے نہ من، وہ تو بس پھیلتی ہے مدہوش کرتی ہے اور روپوش ہو جاتی ہے پھر وہ تا عمر اسی کا پاپگل بن جاتا ہے۔ تم اپنے ہی بنائے گماں کے ساتھ خود کو خاکستر کرتے جا رہے ہو۔'' اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

''جسے تم میرا گمان کہہ رہی ہو وہ حقیقت ہے۔''

''صرف تمہاری سوچ تک اور سوچ کا کوئی وجود کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔''

''تمہارے لیے کہنا آسان ہو گا پر میرے لیے مشکل ہے کیونکہ عمل سے میں گزرا ہوں خود سے بچھائے گئے کانٹوں کا درد بھی میں نے سہا ہے۔'' وہ اپنی ندامت کے خول سے کسی طور نکلنے کو تیار نہ تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہی اس کی بے چینی تشنگی نے اسے بہت کچھ یاد دلا دیا تھا۔ ماضی کا وہ حصہ جو تلخ تھا اور اسی کی طرح مضطرب

تھا۔

''نہیں لگتا مشکل جب اس بات کا یقین آ جائے کہ جن محبتوں کے لیے ہم تڑپتے ہیں وہ صرف ایک گمان ہیں اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ میں نے اپنی زندگی باپ کی شفقت سے محروم گزاری ہے۔ بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک اس کی نے میری ذات کو چھلنی کیا پہلے میں مضطرب سی اپنے باپ کی محبت کے لیے تڑپتی تھی پھر رفتہ رفتہ اس سے نفرت کرنے لگی جوں جوں ان کی کمی محسوس ہوتی یہ سوچ کر نفرت ہوتی کہ وہ زندہ ہونے کے باوجود ہمارا سائبان نہیں ہیں پھر ایک وقت آیا مجھے ان سے اتنی نفرت ہوگئی کہ میں ان کا مرا ہوا چہرہ تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی لیکن پھر ایک مقام ایسا آتا ہے، جب آپ کی سوچ کا وہ پردہ اٹھتا ہے جو آپ کو احساس دلاتا ہے آپ کتنے ہی تنہا ہوں رسوا ہوں پر ایک ذات آپ کو ہمیشہ تھامے رکھتی ہے۔ آپ کسی بھی حال میں ہوں وہ آپ کا ساتھ نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ اللہ ہے مگر جب اسے محسوس کیا جائے تو آپ کی تمام محبتوں پر صرف اس کی محبت غالب ہو جاتی ہے۔ پھر کوئی تشنگی کوئی اضطراب نہیں رہتا۔ جن کے پیچھے ہم بھاگتے ہیں وہ صرف خاک لگتے ہیں جب میں نے اس حقیقت کو سمجھا تھا تب اگر میرے دل میں اپنے باپ کے لیے محبت پیدا نہ ہوئی تھی تو نفرت بھی نہ ہوئی کیونکہ جب اس سے ہم محبت کرتے ہیں تو ہر اس عمل سے بھی باز رہتے ہیں جو اسے پسند نہ ہو۔'' وہ ایک ایک لفظ کو موتیوں کے دانے کی طرح ادا کر رہی تھی ایسا نہ تھا کہ وہ کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا۔ اس کی ذات کا ایسا پہلو جو اس نے کبھی بھی نہ ظاہر کیا تھا اور آج وہ اسے کس جانب لے جانا چاہ رہی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا مگر خود کو وہ اس قابل سمجھتا ہی کہاں تھا۔

''تم خوش نصیب ہو کہ تم بے عیب ہو خدا کے آگے جب تم سر جھکاتی ہوگی تو کم از کم گناہوں کا بوجھ محسوس نہیں ہوتا ہوگا۔ میں کس منہ سے اس کے آگے سر جھکاؤں میرا عمل اس قابل ہی نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں جو شرمساری تھی اب کی بار وہ حیران ہوئی تھی اس نے بڑے لوگوں کو غفلت کی زندگی گزارتے دیکھا تھا۔ اس نے غلطی کی تھی یہ حقیقت تھی مگر اتنی ندامت یہ اس کی اصلاح نہیں تھی تو کیا تھا۔

''تم نے کیسے سوچ لیا میں بے عیب ہوں، بے عیب صرف خدا کی ذات ہے اور جس ذات کے آگے تم سر جھکانے سے جھجکتے ہو ناں اگر اسے تم سے محبت نہ ہوتی تو شاید تم کبھی اتنے مضطرب اتنے نادم نہ ہوتے تمہارے اور میرے بیچ میں کیا ہوا اسے بھول جاؤ وہ ہماری ایک آزمائش تھی جس طرح میں نے اسے اپنی زندگی کی گرد سمجھ کر جھاڑ دیا ہے تم بھی خود کو ان الجھنوں میں مت الجھاؤ کیونکہ میں نے تمہیں واقعی دل سے معاف کر دیا تھا۔'' اس کی بات اس کے دل میں اترتی چلی گئی تھی۔ وہ ایسی تھی یہ وہ جانتا تھا لیکن کیوں تھی یہ جاننے کی کبھی دلچسپی نہ ہوئی لیکن آج اس نے بھی خود کو کھولا تھا۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور ہوتا کم از کم ایسا رویہ اختیار نہ کرتا لیکن اس کا سکون، صبر اطمینان آنکھوں میں لحہ بہ لحہ اترتا تھا اور شاید ٹھیک بھی تھا۔ دنیا کی محبت وہ دل میں پال لیتی تو آج اتنے سکون میں نہ ہوتی اور وہ جس کے بارے میں اس نے ابھی ابھی کہا تھا خدا اس سے محبت کرتا ہے وہ سچ میں حیران ہوا تھا کیوں کہ آج سے پہلے اس نے ایسا سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ عبادت گزار نہیں تھا وہ کوئی غفیر نہیں تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ اس نے خدا کو دل سے یاد کیا ہو۔ وہ تو لوگوں کو عبادت کرتے دیکھتا تو یہی خیال کوندتا وہ اپنی ضرورتوں کے لیے اسے یاد کرتے ہیں شاید اور اسے تو کبھی کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی ہی نہ تھی۔ سب کچھ بن مانگے ملا تھا۔ پھر بھی وہ کہہ رہی تھی خدا اس سے محبت کرتا ہے آزمائش کے ذریعے اپنے قریب بلا رہا ہے۔ اسے نہیں یاد پڑ رہا تھا اس نے کون سی ایسی نیکی کی جو وہ آج

یہاں تھا۔ پچھلے گزرے لمحے جیسے تشریح کرتے چلے جارہے تھے۔ وہ اس کی جھولی میں قیمتی موتی ڈالتا رہا اور وہ خاک چھانتا رہا۔ سب کچھ آنکھوں کے سامنے تھا لیکن پھر بھی کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس نے ٹھیک کہا تھا ایک مقام ایسا آتا ہے جب سب سمجھ آنے لگتا ہے۔ وہ اس مقام تک پہنچ ہی گیا تھا اور آج لگتا تھا جیسے تشنگی کی پیاس بجھ گئی ہو لمحہ لمحہ دہکتی آگ پر اوس پڑ کر ٹھنڈی ہوگئی ہو۔ یوں لگتا تھا اندر ایک طوفان کے بعد گہری خاموشی چھا گئی ہو، گراہیں کھل گئی تھیں جن گتھیوں کو وہ سلجھاتے سلجھاتے تھک گیا تھا وہ یوں سلجھی تھیں ساتھ ہی سوچ کا وہ پردہ بھی وا ہوا تھا جہاں اس کا گمان بھی نہ تھا۔ زندگی کیا تھی اور وہ کیا گزارتا آیا تھا آج جیسے سمجھ آگئی تھی۔ ایک طویل خاموشی کے بعد وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی جاتے ہوئے اس پر ایک نظر ڈالی تھی جو کسی گہری سوچ میں گم تھا اس کے چہرے کا ٹھہراؤ اس بات کا پتا دے رہا تھا کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ گیا ہے۔ الجھنوں کے گرداب سے نکلتی وہ دروازے کی جانب بڑھی تھی تب اس کی آواز پر چوکھٹ نے جیسے قدم پکڑ لیے تھے اس کے۔

''ٹھیک کہا تم نے جو کچھ ہمارے بیچ ہوا وہ ایک آزمائش تھی۔'' وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا نگاہیں اس کی پشت پر جمی تھیں ایک گہری سوچ کے ساتھ۔ ''تم خوش نصیب ہو کہ زندگی میں کچھ سمجھنے کے لیے بھٹکنا نہیں پڑا۔ آج ہم دونوں ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں۔ بس فرق اتنا ہے ہمارے راستوں کی گزر الگ تھی۔ ان سب میں پھر بھی ایک چیز عجیب ہے آخر ہم آج پھر کیوں ایک ہی مقام پر آکھڑے ہوئے۔ مجھ میں ہمت نہ تھی پلٹنے کی مگر پھر بھی تمہارے سامنے آکھڑا ہوا۔ کیوں اور کس لیے؟ خدا نے ہمیں ایک دوسرے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟'' وہ ہر لفظ ٹھہر کر ادا کررہا تھا اور اس کی دھڑکن تھم سی گئی تھی اس کے خاموش ہونے پر اس نے بے اختیار گردن گھمائی تھی اور اس کی نظر اس کی پرسوچ سنہری آنکھوں پر ٹھہر گئی تھی جو بغور اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

''تمہیں یاد ہے ناتم نے کہا تھا زندگی کے اچھے اور برے راستے میں سے کسی ایک کا انتخاب ہم خود کرتے ہیں اور اگر صحیح راستہ چن لیں تو پھر کسی بھی چیز کے لیے تردد ہمیں خود نہیں کرنا پڑتا کیونکہ اس کی ہر راہ ہمیں خدا ہی دکھاتا ہے تو پھر آج ہم اپنے اپنے راستے چن کر واپس ایک دوسرے کے روبرو کیوں آکھڑے ہوئے ہیں۔'' وہ خاموش ہوگیا اور سوچ کا پہلو اس کی طرف اچھالا تھا۔ وہ خاموش صرف اسے دیکھتی رہی تھی وہ ہر بات کو بغور سوچتی اور پرکھتی تھی مگر یہاں وہ غافل ہوگئی تھی جس روپ میں وہ آج کھڑا تھا اس کی کیا وجہ تھی۔



نکاح کی تقریب اختتام پذیر ہوگئی تھی۔ مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی گہما گہمی والے ماحول میں ایک دم سناٹے چھا گئے تھے۔ گو کے نکاح بہت سادگی سے ہوا تھا لیکن مہمانوں کی وجہ سے ماحول میں گہما گہمی چھائی ہوئی تھی۔ رات گہری ہونا شروع ہوگئی تھی ہواؤں میں خنکی کا احساس بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ گلاس ونڈو کے پٹ سے ٹیک لگائے سیاہ آسمان پر نظر جمائے ہوئے تھی۔ آسمان پر چمکتے ستارے روشنیوں کی بہاریں بکھیر رہے تھے۔ گھر کے لان سے اٹھتی رات کی رانی کی خوشبو ہوا کو مسحور کرگئی تھی ساتھ ہی پودوں میں چھپے جھینگروں کی آوازوں نے شور برپا کیا ہوا تھا۔ زندگی گمان کی صورت اور انسان اس کی حقیقت اور گمان کا ملاپ یوں تھا جیسے سمندر میں ڈوبتا سورج، جو ڈوبتا تو ہے پر اس حقیقت کے ساتھ کہ اسے کہیں اور ابھرنا ہے۔ زندگیوں میں اجالے بکھیرنے کے لیے۔ یہ اس کی زندگی کا اجلا پن تو تھا جس کا ساتھ خدا نے اسے عطا کیا تھا۔ آج وہ...... وہ تھا جسے خدا نے اس کے قابل بنایا تھا نہ کہ اس وقت دیا جب وہ زندگی کے اندھیروں میں گم تھا۔ اس

نے تو ملال اس وقت بھی نہ کیا تھا جب وہ گیا اور شاید یہی صبر تھا جس سے اس کی زندگی خوشیوں کی قیمتی موتیوں کی مالا میں پروگئی تھی۔ شیث کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا اور وہ اپنے خیالوں میں اتنی محو تھی کہ اس کی آہٹ کو بھی محسوس نہ کر سکی۔ وہ قدموں کی آہستہ چاپ کے ساتھ اس پر نظر ڈالتے ہوئے بڑھا، سفید رنگ کے شرارے میں جس پر سچے موتیوں اور نگوں کا نفیس کام ہوا تھا اس کے وجود پر چاندنیاں بکھیر رہا تھا۔ وہ اس کی ہوگئی تھی۔ وہ اب تک بے یقین تھا۔ زیست کی تلخ راتوں کے بعد وصل کی رات نصیب ہوگئی تھی۔ وہ اس کے قریب آ کھڑا ہوا تھا اور گہری نگاہیں اس پر مرکوز کردی تھیں۔ اس کی نگاہوں کی تپش تھی کہ اس نے چونک کر دیکھا تھا۔ اس کی سنہری آنکھوں میں محبت کی چمک ابھر رہی تھی۔ اس کے لیے اس کی نظروں کی تپش سے نگاہیں خود بخود جھک گئی تھی۔ وہ کتنے ہی پل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا تھا۔ دل نے بے اختیار وقت تھم جانے کی خواہش کی تھی۔ اس نے نرمی سے اس کے نرم گداز ہاتھ کو تھاما تھا جس میں ہیروں کا نفیس سا بریسلٹ پہنا دیا تھا اور پھر اس کی جانب دیکھا تھا۔

''میں تم سے کوئی وعدے نہیں کروں گا۔ نہ جانے زندگی کب تک وفا کرے اور میرے وعدے ادھورے رہ جائیں ہاں پر جب تک تمہارے ساتھ جیوں گا اپنے عمل سے اپنے ماضی کا مداوا ضرور کروں گا۔'' وہ متانت سے بولا۔ پشیمانی آج بھی اس کے چہرے پر تھی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہی تھی جو مکمل طور پر بدل چکا تھا۔

''تم ماضی کا بار بار تذکرہ مت کیا کرو۔ جب میرے دل میں کوئی ملال نہیں ہے تو تم کیوں نادم ہوتے ہو۔'' وہ نرمی سے بولی تھی اور وہ دھیما سا مسکرا دیا تھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''ایک پل کے لیے جب اپنی غفلت بھری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے آج وہ خواہشیں خاک سے زیادہ کچھ نہیں لگتیں۔'' وہ کہتے کہتے رکا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یہ یقین تھا تم ضرور سمجھو گی۔ جس حقیقت سے انسان ہمیشہ نظر چراتا ہے درحقیقت وہی اس کی قسمت ہوتی ہے۔'' اس کے لہجے میں گہرائی سموئی ہوئی تھی۔ اس کی بات پر وہ سوچ میں ڈوب سی گئی تھی۔

''شاید ٹھیک کہتے ہو تم خدا نے ہمیں تب ملایا جب ہم ایک دوسرے کے لیے بہتر تھے۔ اگر ہم اس آزمائش سے نہ گزرتے تو شاید ہم خود کو آج سمجھ بھی نہ پاتے۔'' اس کے لفظوں میں خاموشی سی اتر گئی تھی اور اس نے بھی دل سے تسلیم کیا تھا اس کی بات کو ایک معطری خوشبو تھی جو چاروں گرد پھیل گئی تھی۔

''رات کی سیاہ تاریک کے بعد دن کے اجالوں کو دیکھنا کیسا لگتا ہے میں آج محسوس کرسکتا ہوں۔'' وہ جذب سا بولا تھا۔ اس کی بات پر اس کے عنابی لبوں پر مسکراہٹ نے احاطہ کرلیا تھا۔

لمحوں کی ہوائیں یادوں کی خشکی کو اڑاتی چلی گئی تھیں۔ اندر کی گھٹن آج جیسے ختم ہوگئی تھی۔ دلوں پر گرتے شبنم کے قطرے محبت کو سرسبز ایک بار پھر کر گئے تھے۔ وصل میں برستی بارش رحمت کی صدا تھی جس کے ہر قطرے میں خدا کی عطا کردہ نعمتیں تھیں۔ دونوں نے نعمتوں کو جھولی میں بھرتے ہوئے عشق حقیقی کا سفر طے کرلیا تھا آج۔

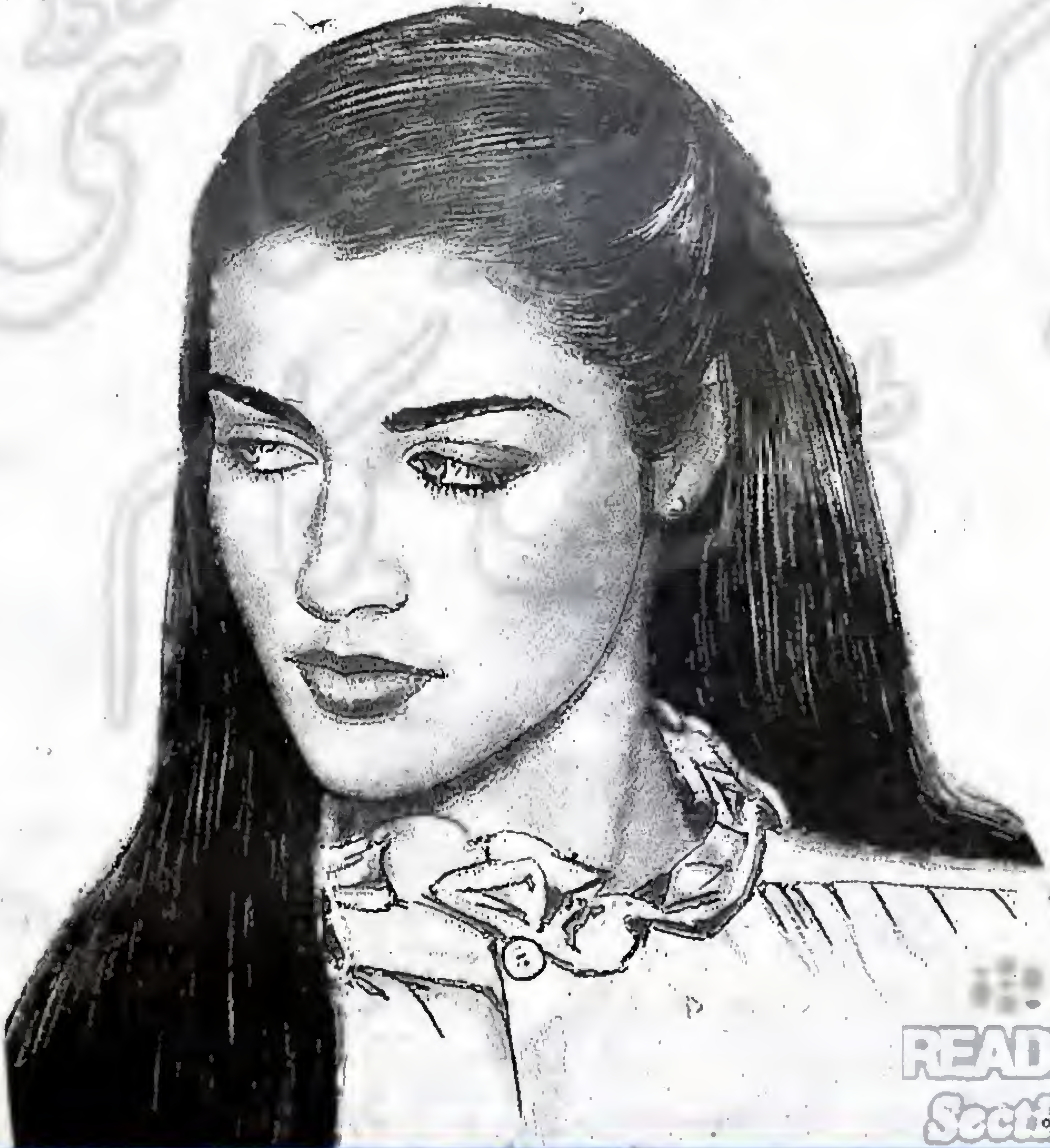
یہ دنیا مٹی ہے اور انسان اس کی پیداوار وہ ہمیشہ خلاء میں اونچی پرواز کرنا چاہتا ہے۔ اس بات سے بے خبر وہ جتنا بھی اونچا اڑ لے اس نے گرنا نیچے ہی ہے اور خلط ہوجانا ہے اس میں جس کی وہ پیداوار ہے۔

......☆......

ناولٹ

حسرتِ ناتمام

نورالعین نے صفائی ستھرائی کے بعد پورے گھر پر نظریں دوڑائیں۔ دو کمرے، ان کے آگے برآمدہ، برآمدے کے باہر چھوٹا سا کچن اور صحن، صحن کے ایک کونے میں بنا ہوا واش روم اور اس



کے ساتھ اوپر جاتی سیڑھیاں پورا گھر شیشے کی طرح چمک رہا تھا۔ صحن کی اینٹیں ہر روز گیلے کپڑے کا پونچا لگنے سے اتنی صاف اور سرخ ہو گئی تھیں جیسے ان پر سرخ رنگ کی پالش کی گئی ہو، ڈھونڈنے سے بھی ان پر مٹی نہیں ملتی تھی۔ صحن کے دوسرے کونے میں شہتوت کا ایک بڑا سا درخت تھا جس کا سایہ اس چھوٹے سے صحن کو گرمیوں میں دھوپ کی تمازت سے بچاتا تھا۔ صاف ستھرے صحن میں شہتوت کا سایہ ٹھنڈک اور تازگی کا احساس دلاتا تھا۔ صفائی ستھرائی سے مطمئن ہو کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کنگھی کر کے بالوں کو سمیٹا۔

اماں روٹین کے مطابق اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کو اسکول چھوڑنے گئی ہوئی تھیں۔ وہ ہر روز واپسی پر سبزی اور دیگر ضروری چیزیں خریدتی تھیں اس لیے تقریباً نو بجے تک گھر واپس آتی تھیں۔ ابا میاں اپنی نوکری پر جا چکے تھے۔ وہ ایک سرکاری محکمے میں کلرک تھے۔ مہنگائی کے اس دور میں ان کی قلیل تنخواہ ان پانچ نفوس کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر تھی۔ لیکن اماں کی دور اندیشی اور محنت نے ان کا بھرم رکھا ہوا تھا۔ اماں اپنے



فارغ وقت میں لیڈیز کپڑوں کی سلائی کیا کرتی تھیں اور آج کل خواتین جس طرح کپڑے بنوانے کے خبط میں مبتلا تھیں ان کو اس کام سے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی اس آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ بس انداز کرتی رہتی تھیں۔ اب تو نور بھی اس کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ یوں ان سب کی محنت سے گھر کی گاڑی رواں دواں تھی۔

☆..........☆..........☆

ابا میاں اور اماں کے تعلقات عجیب سی سرد مہری لیے ہوئے تھے بلکہ ابا میاں تو ان تینوں بہنوں کے ساتھ بھی بس ایسے تعلق رکھتے تھے جیسے وہ ان کی سگی بیٹیاں نہ ہوں۔ ''شاید نہیں بلکہ یقیناً ابا میاں کو یہ تینوں اس لیے بری لگتی ہیں کہ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ اگر بیٹیوں کی جگہ ان کے تین تین بیٹے ہوتے تو پھر ابا میاں ایسے سرد مہر سے نہ ہوتے''۔ یہ نور العین کا خیال تھا جو سو فیصد درست تھا۔ البتہ اماں ان تینوں کے مقدور بھر لاڈ اٹھاتی تھیں لیکن یہ لاڈ ایسے تھے جو ان کی تربیت پر کبھی اثر انداز نہ ہوئے تھے۔ ابا میاں ان کے کالج میں پڑھنے کے خلاف تھے سو نور العین پرائیویٹ ایف اے پاس کرنے کے بعد گھر پر ہی بی اے کی تیاری کر رہی تھی تاکہ وہ پرائیویٹ ہی سہی مگر اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکے۔

☆..........☆..........☆

نور العین نے صاف ستھرے صحن میں قدرے سائے والی جانب چٹائی بچھا کر اس پر سلائی مشین رکھی اور ان سوٹوں کے ٹراؤزر سینے لگی جن کی قمیضیں آج اماں نے مکمل کرنی تھیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سلائی مشین روک کر دروازے کی طرف بڑھی اور بغیر پوچھے ہی دروازہ کھول دیا کہ وہ اپنی اماں کی دستک کو خوب پہچانتی تھی۔ اس نے اماں کے ہاتھ سے سبزی والا شاپر پکڑ لیا اور کچن میں چلی گئی۔ اس نے سبزی ٹوکری میں نکالی اور دوبارہ صحن میں چلی آئی۔ اماں دروازہ بند کر کے صحن میں بچھی چارپائی پر لیٹ کر ستانے لگی تھیں۔ وہ دوبارہ اپنی جگہ پر آ کر ادھورا کام مکمل کرنے لگی۔

''نورا تمہارا کتنا کام رہ گیا ہے؟'' تھوڑی دیر بعد اماں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''بس اماں یہ آخری سلائی ہے اس کے بعد آپ قمیضیں سی لینا، میں سبزی کاٹ کر ہانڈی بنا لوں گی، پھر اس کے بعد مجھے پڑھائی بھی کرنی ہے''۔ نور نے تفصیلاً جواب دیا تو اماں سر ہلا کر کمرے میں چلی گئیں۔

☆..........☆..........☆

ابا میاں کی سرد مہری کے باوجود نور العین کو وہ بہت عزیز تھے۔ وہ ان کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ وہ یا اس کی بہنیں کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ان کو تکلیف ہو یا جو انہیں ناگوار گزرے۔

''ابا میاں! چائے لے لیں''۔ اس نے چائے کا کپ ان کے سامنے کیا۔ انہوں نے کپ پکڑ لیا۔ وہ پھر بھی وہیں کھڑی رہی۔

''ابا میاں! آپ کو کوئی پریشانی ہے؟'' انہوں نے اس غیر متوقع سوال پر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' انہوں نے ناسمجھی سے پوچھا۔

''ابا میاں! آپ اتنے خاموش کیوں رہتے ہیں۔ آپ بھی دوسروں کے والد کی طرح ہنسا بولا کریں''۔ نور نے جلدی سے بات مکمل کی۔

''اب اس عمر میں ہنسی ٹھٹھول کرتے ہوئے اچھا لگوں گا۔ جاؤ جا کر اپنا کام کرو اور ایسی فضول باتوں پر مت الجھا کرو''۔ انہوں نے رکھائی سے کہہ کر اسے

باہر کا راستہ دکھایا۔

''اماں! ابا میاں ایسے کیوں ہیں؟'' صبح ان کے دفتر جانے کے بعد نور نے ناشتہ بناتی اماں سے سوال کیا۔

''کیا ایسے ہیں؟'' انہوں نے مصروف سے انداز میں کہہ کر پراٹھے کے لئے بیلی ہوئی روٹی توے پر ڈالی۔

''وہ ہم سے بات چیت کیوں نہیں کرتے۔ اماں! میرا دل چاہتا ہے کہ ہمارے ابا میاں بھی صبا کے ابو جیسے ہو جائیں۔ سچ کتنا خیال رکھتے ہیں وہ ان سب کا''۔ اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

اماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''یہ کیسی حسرتیں پنپنے لگی ہیں میری بیٹیوں کے اندر''۔ وہ سوچ کر رہ گئیں۔

''بیٹا! ہر کسی کا اپنا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ تمہارے ابا میاں بھی تم سے بہت پیار کرتے ہیں''۔ انہیں اپنی ہی آواز اجنبی سی لگی۔

''پتہ نہیں یہ کیسا پیار ہے جو نہ تو ہمیں نظر آتا ہے نہ ہی کبھی ہمیں محسوس ہوا ہے''۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔

☆.........☆.........☆

''باجی! اس لفظ کا مطلب بتائیں''۔ سب سے چھوٹی معصومہ نے کتاب نور کے سامنے کی۔ نور، حرا اور معصومہ برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ کر پڑھائی کر رہی تھیں اور اماں نیچے چٹائی پر بیٹھ کر قمیض کی ترپائی کر رہی تھیں۔ نور معصومہ کو مطلب سمجھانے کے بعد اٹھی۔

''اماں! میں پہلے چائے کا پانی رکھ دوں۔ ابا میاں آتے ہوں گے''۔ وہ برآمدے سے باہر آئی۔ اتنے میں باہر کا دروازہ زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔

''کون ہے بھئی؟ کیا ہو گیا؟ آ رہی ہوں''۔ وہ کچن میں جانے کی بجائے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''دروازہ کھولو گی تو بتاؤں گی ناں کہ کون ہے۔ تمہاری طرح چیخنے سے تو رہی''۔ دروازے کھلتے ہی اس کی بڑی پھپھو بولتے ہوئے اندر داخل ہوئیں۔

''اب ہٹو سامنے سے''۔ انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر سائیڈ پر دھکیلا اور اسے سلام دعا کا موقع دیئے بغیر آگے بڑھ گئیں۔ وہ جی بھر کر کوفت زدہ ہوئی۔

وہ سیدھی برآمدے میں پہنچیں اور دعا سلام کے بجائے اماں پر اعتراضات کی بھرمار کر دی۔

''یہ تم کیا ہر وقت مشین پر جھکی رہتی ہو۔ ناں تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو کہ میرا بھائی نکما اور نکھٹو ہے جو تم ماں بیٹیوں کی ضروریات پوری نہیں کر سکتا''۔ وہ بڑے کڑوے لہجے میں بولی تھیں۔

''آپا! میں ایسا کچھ نہیں سمجھتی۔ بس اپنا فارغ وقت ادھر اُدھر ضائع کرنے کے بجائے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ ایسا کر کے نہ تو میں کسی پر کوئی احسان کرتی ہوں اور نہ ہی کسی کو کچھ جتانا مقصود ہے''۔ اماں نے رسان سے کہا۔

نجانے ان میں اتنا ضبط کہاں سے آ جاتا تھا کہ وہ پھپھو کی کڑوی کسیلی باتوں پر بھڑکنے کی بجائے ٹھنڈا ٹھار جواب دے کر خاموش ہو جاتی تھیں جس کے نتیجے میں پھپھو نخوت سے سر ہلا کر خاموش ہو جاتیں اور کبھی بھڑک اٹھتیں جیسے کہ ابھی ہوا تھا۔

''یہ وقت ضائع کرنے والی بات تم نے مجھے لگائی ہے؟'' انہوں نے خود ہی فرض کر لیا تھا۔

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا''۔ اماں اپنا کام سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''میں آپ کے لئے چائے لاتی ہوں''۔ وہ کچن کی طرف بڑھیں۔

"رہنے دو تم یہ چاپلوسیاں، بی بی! سب جانتی ہوں"۔ انہوں نے ایک اور تیر پھینکا۔

اماں خاموشی سے کچن میں غائب ہوگئیں۔ جانتی تھیں کہ اگر چائے پانی نہ پوچھا تو ابا میاں کے آتے ہی ان کا شکایت نامہ کھل جاتا اور خواہ مخواہ گھر کا ماحول خراب ہوتا۔ تینوں بہنوں کے چہروں پر بے چینی کے تاثرات بہت نمایاں تھے۔

☆......☆......☆

"اماں! پھپھو ابا میاں کے پاس بیٹھی رو رہی ہیں"۔ نور جو انہیں کھانے کے لئے بلانے گئی تھی الٹے قدموں واپس آئی۔

"یقیناً اپنی کوئی بات منوائی ہوگی ہمیشہ اسی طرح تو ہوتا ہے"۔ انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔

پھپھو کھانا کھا کر واپس چلی گئیں۔ ہمیشہ پھپھو کے جانے کے بعد کسی بات کو بنیاد بنا کر اماں کی کلاس لگتی تھی۔ آج بھی جب ابا میاں نے اماں کو جلد فارغ ہو کر کمرے میں آنے کا کہا تو تینوں بہنوں نے بیک وقت ابا میاں کے چہرے کی طرف دیکھا مگر آج ان کے چہرے پر غصے کی بجائے کسی سوچ کے سائے لہرا رہے تھے۔

"جنت خاتون! آپا نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کے لئے نور کا ہاتھ مانگا ہے"۔ ابا میاں نے بغیر کسی تمہید کے اماں کے سر پر بم پھوڑ دیا۔ وہ پھٹی ہوئی بے یقین آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگیں جیسے انہیں اُن کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی ہو۔

"پھر آپ نے کیا کہا؟" اماں نے چند لمحوں بعد سپاٹ سے انداز میں پوچھا۔

"کہنا کیا تھا، وہ میری بڑی بہن ہیں، میں ان کا کہا ٹال تو نہیں سکتا اس لئے میں نے اپنی رضامندی دے دی ہے۔ اب وہ کسی روز خاندان کے بڑوں کو لے کر باقاعدہ منگنی کرنے آئیں گی"۔ وہ بہت پرسکون تھے۔

ان کی بات سن کر اماں کو سمجھ آیا کہ پھپھو آج واپسی پر اتنی خوش کیوں تھیں۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" ابا میاں کے اتنا بڑا فیصلہ اکیلے لے لینے پر اماں جیسے ہکلا کر رہ گئیں۔

"کیا مطلب؟" ابا میاں نے تیوری چڑھائی۔

ان کے اس انداز پر اماں کا دل ڈوب کر ابھرا لیکن انہوں نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ساری زندگی وہ اپنے ہر حق سے دستبردار ہوتی آئی تھیں لیکن یہ ان کی لاڈلی کی زندگی کا معاملہ تھا، وہ کیسے خاموش رہتیں۔

"آپ حامد کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے جانتے ہیں پھر بھی اپنی بیٹی کو قربان کرنا چاہتے ہیں؟" اماں نے مبہم سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں پھر بھی، تمہیں کیا تکلیف ہے؟" وہ ہلکے سے غرائے۔ انہیں اس معاملے میں اماں کا بولنا ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔

"مجھے تکلیف کیوں نہیں ہوگی؟ نور میری بیٹی ہے اور میں اس کے ساتھ کچھ بھی غلط نہیں ہونے دوں گی"۔ اماں نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا حالانکہ اس بات نے ان کے اندر آگ سی لگا دی تھی۔

"کیا کر لو گی تم بدبخت عورت؟ تم سب کو میرا فیصلہ ماننا پڑے گا ورنہ میں تمہیں طلاق دے کر تمہاری لاڈلیوں سمیت نکال باہر کروں گا۔ پھر تم ان کو لے کر جہاں چاہے دفعان ہو جانا"۔ وہ اماں کی اس کمزوری کو اچھی طرح جانتے تھے اور بوقت ضرورت اس کا خوب استعمال کرتے تھے۔

ان کی اس دھمکی پر وہ خاموش ہوگئیں اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ انہوں نے بائیس تئیس سال اس شخص کی سنگت میں گزارے تھے اور ان کے ساتھ گزارا ہوا ہر لمحہ انہیں ایک آزمائش لگا تھا۔ وہ وقتی طور پر خاموش ہوگئیں۔ ابا میاں ان

پر ایک فاتحانہ سی نظر ڈال کر کمبل جھاڑنے لگے اور ان کے کمرے کے باہر دروازے سے لگ کر کھڑی نور جیسے سن ہوگئی۔ وہ اپنی کتاب لینے برآمدے میں آئی تھی کہ اماں اور ابا میاں کے کمرے سے آتی آوازوں پر وہیں ٹھہر گئی۔ پھر اپنا نام سن کر دروازے کے قریب آ گئی۔ وہ خاموشی سے کمرے میں آ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ جب کسی کروٹ چین نہ آیا تو وہ اپنی موٹی سی کاپی اور قلم اٹھا کر کچھ لکھنے لگی تھی۔

☆.........☆.........☆

اگلی صبح اماں اٹھ کر باہر آئیں تو ان کی آنکھیں رونے اور رت جگے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں۔ نور العین نے ان کی طرف دیکھا۔

''اماں! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟'' وہ آگے بڑھی۔

''ہوں''۔ انہوں نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''اماں! آپ رو کیوں رہی ہیں؟'' اس نے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔

''بیٹا! تم ناشتہ بنالو، میری طبیعت اچھی نہیں ہے میں تھوڑی دیر اور لیٹوں گی''۔ اماں یہ کہہ کر وہیں سے کمرے کی طرف مڑ گئیں۔

حرا اور معصومہ ابا میاں کے ساتھ اسکول گئی تھیں۔ ایسا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا کہ ابا میاں ان بہنوں کی کہیں آنے جانے کی ذمہ داری اٹھائیں۔

سب کے جانے کے بعد نور نے اماں کے لئے چائے بنائی، پھر چائے کی پیالی، دو سلائس اور سر درد کی گولی ٹرے میں رکھ کر کمرے میں چلی آئی۔

''اماں! اٹھیں یہ چائے اور سلائس کھا کر سر درد کی گولی لے لیں، طبیعت ٹھیک ہو جائے گی''۔ اس کے آواز دینے پر وہ دھیرے سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''اماں! بتائیں نا پھپھو اس دفعہ ایسا کون سا شوشا چھوڑ کر گئی ہیں جو آپ اتنی پریشان ہو رہی ہیں''۔ وہ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے چائے سے اٹھتی بھاپ پر نظریں جمائے رہیں۔

''آپ نہیں بتانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں، میں بتا دوں کہ آپ کیوں پریشان ہیں؟'' اس کی بات پر انہوں نے چونک کر سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''اماں! پلیز ابا کو ایسا کرنے سے روکیں، دوسری صورت میں تو میں گھٹ کر مر جاؤں گی''۔ وہ جو رات سے خود کو سنبھالے ہوئے تھی ان کے سامنے بکھر گئی۔

''نا میری بچی! میرے جیتے جی کوئی تم لوگوں کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ چاہے اس عمر میں مجھے بے گھر ہونے کا دکھ ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے''۔ اماں نے اسے خود میں سمیٹ کر تسلی دی۔

☆.........☆.........☆

''آپ میری بات سمجھ کیوں نہیں رہے؟ اپنی اتنی پیاری بچی کو کیوں ایک بدکردار کے پلے باندھ رہے ہیں؟ ایک بات اپنے ذہن میں بٹھا لیں کہ اگر وہ لڑکا صرف نکما ہوتا تو پھر بھی شاید میں مان جاتی لیکن میں اپنی پاکباز بچی کو اس بدکردار کے پلے ہرگز نہیں باندھنے دوں گی''۔ اماں نے اپنی عادت کے برعکس غصے سے کہا۔

''کون سی بدکرداری؟ جوانی میں لڑکے بالے ایسی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتے ہیں''۔ ابا میاں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

''آپ اپنی بچی کی فطرت سے واقف ہیں، وہ اس ماحول میں گھٹ کر مر جائے گی''۔ اماں منت پر اتر آئیں۔

''ارے ہٹو! مرتی ہے تو مر جائے اور تم نے بھی جتنا سوگ منانا ہے منالو، شادی تو میں اس کی حامد سے

ہی کروں گا۔ میں اس کا ولی ہوں اس کے بارے میں جو فیصلہ چاہے کرسکتا ہوں''۔ ان کے اس لہجے پر اماں کا کلیجہ دہل گیا اور برآمدے میں کھڑی نور کا چہرہ بالکل زرد ہو گیا۔

''باجی! ایسے کیوں کھڑی ہیں؟'' حرا نے اسے یوں کھڑے دیکھا تو اس کے قریب چلی آئی۔

''کچھ نہیں تم چل کر لیٹو میں رات کے برتن دھو کر آتی ہوں''۔ وہ کچن کی طرف بڑھ گئی اور حرا کندھے اچکا کر کمرے میں چلی آئی۔

رات کو سب کے سونے کے بعد نور آہستگی سے اٹھی اور کاپی قلم اٹھا کر کچھ لکھنے لگی۔ یہ ایک عام سی رجسٹر نما کاپی تھی جسے اس نے پرسنل ڈائری کی شکل دے رکھی تھی اور پچھلے چند سالوں سے یہ اس کی رازدار تھی کہ وہ اپنی ان تمام فیلنگز اور باتوں کو جو وہ کسی سے شیئر نہ کرسکتی تھی حتیٰ کہ اپنی ماں سے بھی نہیں، اس ڈائری کے سینے پر رقم کر دیتی تھی۔

☆.........☆.........☆

اس دوران پھپھو دو تین بار ان کے ہاں آئیں اور ان کا رویہ اماں اور ان تینوں بہنوں کے ساتھ پہلے سے بڑھ کر توہین آمیز تھا۔ پھر ابا میاں نے پندرہ روز بعد باقاعدہ منگنی کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ اماں ان کے اس سنگدلانہ فیصلے پر گھنٹوں روتی رہیں۔ وہ کیا کرتیں۔ اپنی بچیوں کو لے کر کہاں جاتیں کہ ان کے میکے میں کوئی ان کو خوش آمدید کہنے والا نہیں تھا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی بچی کو اس ظلم سے کیسے بچائیں۔ اس فیصلے کے بعد نور کو جیسے بالکل چپ لگ گئی اور اس کی دونوں چھوٹی بہنیں ہر وقت سہمی رہتیں۔ اسی پریشانی میں دس روز گزر گئے اور منگنی ہونے میں صرف پانچ دن رہ گئے۔ شدید ذہنی دباؤ اور پریشانی کی وجہ سے نور کو شدید بخار نے آ لیا۔ شام تک یہ حالت ہو گئی کہ وہ تقریباً بے ہوش تھی۔ اماں پریشانی سے ادھ موئی ہوئی جا رہی تھیں۔

''اٹھ میری بچی! یہ دوا کھا لو''۔ انہوں نے اسے سہارے سے اٹھایا۔

☆.........☆.........☆

تیسرا دن تھا نور کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ بخار نے جیسے اسے نچوڑ لیا تھا۔ اماں محلے کے ڈاکٹر سے دوا دارو کر رہی تھیں۔

''آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لیں۔ تین دن سے میری بچی بخار میں پھنک رہی ہے''۔ اماں نے ابا میاں کے سامنے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''جاؤ تم جا کر کوئی کام کرو، میرا سر نہ کھاؤ۔ موسمی بخار ہے اتر جائے گا''۔ انہوں نے لاپروائی سے جواب دیا۔

''آپ کو شاید ان بچیوں کے جینے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن میری تو ان میں جان ہے۔ آپ ایک دفعہ چل کر اس کی حالت تو دیکھیں''۔ اماں ان کے سامنے گڑگڑانے لگیں۔

ابا میاں نے کبھی اپنی بچیوں کو اپنے سے قریب نہیں ہونے دیا تھا لیکن آج نہ جانے اماں کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ وہ بھی پل بھر کو پریشان ہو گئے، اس سے پہلے کہ وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نکلتے، حرا دوڑی چلی آئی۔

''اماں اماں! دیکھیں باجی کو کیا ہو گیا؟'' وہ دروازے سے ہی واپس پلٹ گئی۔

''الٰہی خیر''۔ اماں سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے پیچھے لپکیں۔

نہ جانے کون سی طاقت تھی جس نے اس وقت ابا میاں کو اماں کے پیچھے نور کے پاس جانے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے ہوش و خرد سے بے گانہ نور کو دیکھا جس کے منہ سے بخار کی شدت سے جھاگ بہہ رہی تھی۔ وہ بے ساختہ اس کی چارپائی کے قریب آئے۔ اس کی حالت دیکھ کر یکدم انہیں

ایسا لگا جیسے کسی نے ان کے دل کو مٹھی میں لے کر مسل ڈالا ہو۔

''نورالعین! آنکھیں کھولو''۔ انہوں نے اس کے گال تھپتھپانے کے لیے اس کے گال کو چھوا لیکن بخار کی شدت انہیں اپنا ہاتھ واپس کھینچنے پر مجبور کر گئی۔

''تم ٹھہرو میں کسی سواری کا بندوبست کرتا ہوں پھر اسے اسپتال لے کر چلتے ہیں''۔

نہ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جو ابا میاں سے یہ سب کروا رہا تھا۔ اسپتال جانا بے کار ثابت ہوا۔ شدید ذہنی دباؤ نروس بریک ڈاؤن کی صورت میں اس کی جان لے گیا۔ ڈاکٹر نے ایمرجنسی میں اس کا چیک اپ کرنے کے بعد اس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھانپ دیا۔

''آپ لوگوں نے بہت دیر کر دی۔ آپ کی بچی اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکی تھی''۔ ڈاکٹر نے ابا میاں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ اماں کی چیخوں نے آسمان ہلا دیا۔

☆.........☆.........☆

ان کا سارا صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ابا میاں وہاں آئے تو اماں اٹھیں اور ان کا گریبان پکڑ لیا۔

''لے لی ناں میری بچی کی جان، کتنے ظالم انسان ہو تم۔ اب بتاؤ میں اسے کہاں سے لاؤں، کیسے واپس لاؤں اسے، بتاؤ اب''۔ وہ سسک اٹھیں پھر یکدم ہنسنے لگیں۔

''دیکھا ہار گئے ناں تم۔ میری بچی نے ہرا دیا تمہیں۔ اب کرو تم اس کی شادی اپنے بدکردار بھانجے سے۔ ہاہاہا''۔

اور ہمیشہ اپنی بیوی اور بچیوں سے دور رہنے والے ابا میاں ان کو سنبھالتے سنبھالتے خود بھی رونے لگے۔ نورالعین ان کے دل میں یہ کیسا درد جگا گئی تھی جو انہیں کسی پل چین نہیں لینے دے رہا تھا۔ ان کی ساری سختی ساری اکھڑ مزاجی جیسے نور کے ساتھ ہی مر گئی تھی۔

پھر نور کو دفنانے کے بعد جو ابا میاں واپس آئے وہ اُس ابا میاں سے بالکل مختلف تھے جو اپنی بچیوں سے بے نیاز تھے۔ واپس آ کر وہ حرا اور معصومہ کو سینے سے لگائے کھڑے رہے۔ اماں نے دیکھا تو لپک کر آئیں۔

''چھوڑو میری بچیوں کو، انہیں بھی چھیننا چاہتے ہو''۔ اماں نے ان دونوں کو اپنی طرف کھینچا۔

☆.........☆.........☆

''یہ کیا ہو گیا میری بچی میرے غلط فیصلے کی بھینٹ چڑھ گئی۔ میں کتنا بدنصیب باپ ہوں جو جیتے جی اپنی بچیوں کو اپنے سائے سے محروم رکھا۔ میری نورالعین! اس کے چلے جانے کے بعد یہ اس کی کیسی محبت جاگی ہے میرے دل میں یا شاید پہلے سے ہی تھی مجھے محسوس اس کے جانے کے بعد ہونے لگی ہے''۔ وہ دل ہی دل میں سوچتے اور ان کے آنسو بے ساختہ بہنے لگتے۔ ان کو نور اپنے آس پاس محسوس ہوتی تھی جیسے وہ اسے ایک آواز دیں گے تو وہ سارے کام چھوڑ کر بھاگتی ہوئی آئے گی۔ مگر وہ تو ان سے اتنی دور جا چکی تھی کہ کوئی آواز اس تک پہنچ سکتی تھی نہ کوئی بلاوا اسے واپس بلا سکتا تھا۔

اماں کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی پھر بھی وہ اچانک نور کو پکار کر رونے لگتی تھیں۔ ابا میاں نے اس دوران اُن کا پورا پورا خیال رکھا، مگر انہیں جیسے اب کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ نور نے خود مٹ کر ابا میاں کے دل میں اپنی محبت کی ایسی شمع روشن کی تھی جو اُن کے دل میں روشنی کرنے کے بجائے پچھتاوے کا دھواں بھرتی تھی اور اس گھٹن سے پریشان ہو کر وہ ادھر اُدھر پناہ ڈھونڈنے لگتے۔

آج بھی ان کی بے چینی حد سے بڑھی تو وہ صحن

سے اٹھ کر بچیوں کے کمرے میں آ گئے۔ حرا اور معصومہ اماں کے ساتھ صحن میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اُس کرسی پر بیٹھ گئے جہاں بیٹھ کر نور پڑھا کرتی تھی اور ساتھ ہی میز پر رکھی ہوئی اس کی کتابوں پر بے ساختہ ہاتھ پھیرنے لگے۔ اُن کی نظر اس موٹی سی کاپی پر پڑی جو دو تین کتابوں کے نیچے دبی ہوئی تھی اور اس کے اندر پین رکھ کر اسے بند کیا گیا تھا۔ انہوں نے پین والی جگہ سے اس کاپی کو کھول لیا، یہ ایک عام سی کاپی تھی جسے نور نے ڈائری کی شکل دے رکھی تھی۔ وہ اس کاپی نما ڈائری کو پکڑ کر سیدھے ہو بیٹھے اور اس کے صفحے الٹ پلٹ کرنے لگے۔

(20 اگست 2007ء)

''آج میرا میٹرک کا رزلٹ آیا ہے۔ میں اے گریڈ میں پاس ہوئی ہوں۔ میں ابا میاں کو یہ خوش خبری سناؤں گی تو مجھے امید ہے وہ ضرور مسکرا دیں گے اور میں ان سے کالج میں ایڈمیشن کی فرمائش کر دوں گی''۔

انہوں نے اگلی تاریخ پر نظر دوڑائی۔

☆..........☆..........☆

(21 اگست 2007ء)

''آج میں نے ابا میاں کو اپنے پاس ہونے کی خبر سنائی تو انہیں بالکل خوشی نہ ہوئی۔ بس 'ہوں' کر کے خاموش ہو گئے۔ پھر اماں سے کہنے لگے اب اسے گھر بٹھاؤ اور کچھ کام کاج سکھاؤ اور میں جو اُن سے کالج جانے کی بات کرنے والی تھی چپ کی چپ رہ گئی۔ بھلا میری چپ سے ابا میاں کو کیا فرق پڑنا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے سامنے رکھے کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اُن کو تو یہ بھی یاد نہیں ہوگا کہ میں نے ان سے آخری بار فرمائش کب کی تھی۔ مگر مجھے یاد ہے۔ جب میں پانچویں میں تھی تو میں نے ان سے گڑیا لانے کی فرمائش کی تھی۔ وہ میری فرمائش تو کیا پوری کرتے الٹا مجھے ڈانٹ دیا۔ وہ دن اور آج کا دن میں نے ان سے فرمائش کرنا بالکل چھوڑ دیا۔ ابا میاں کو تو شاید یہ بات محسوس بھی نہیں ہوتی ہوگی کہ ہم بہنیں ان سے کوئی فرمائش نہیں کرتیں''۔

ابا میاں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوئیں تو الفاظ گڈمڈ ہو گئے۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے باری باری دونوں آنکھیں صاف کیں اور صفحہ پلٹ دیا۔

☆..........☆..........☆

(10 ستمبر 2007ء)

''آج میری دوست صبا کا کالج کا پہلا دن تھا۔ قسمت کی بات ہے اس کے نمبر مجھ سے کم تھے لیکن پھر بھی اس نے ایڈمیشن لے لیا اور ایک میں ہوں شاید بدقسمتی اسی کو کہتے ہیں۔ اماں سے بات کرو تو وہ حوصلہ بڑھانے کو نہ جانے کون کون سی نعمتیں گنوانا شروع کر دیتی ہیں۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس گھر کی بجائے صبا کے گھر میں پیدا ہوئی ہوتی تو میرے بھی اس کی طرح بہت عیش ہوتے۔ صبا کے ابو اس سے اتنا پیار کرتے ہیں کہ مجھے تو وہ دنیا کی خوش قسمت ترین بیٹی لگتی ہے۔ کاش ہمارے ابا میاں بھی اس کے ابو کی طرح ہو جائیں۔ ہم بہنوں سے پیار کرنے والے اور ہماری چھوٹی چھوٹی فرمائشیں پوری کرنے والے۔ میں صبا کو اپنے ابو سے کسی بات پر بحث کرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو مجھے اس پر رشک آتا ہے کہ کیسے وہ اپنی ہر بات ان سے منوا لیتی ہے اور ایک میں ہوں اپنے ابا میاں سے اپنی جائز بات بھی نہیں منوا سکتی۔ منوانا تو دور کی بات میں تو ان کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار تک نہیں کر سکتی''۔

ابا میاں کے منہ سے سسکی سی نکلی۔ ہائے میری بچی کتنی حسرتیں لئے چلی گئی۔ یہ میں نے کیا کر دیا۔ کس زعم میں اپنی بچیوں کے نازک احساسات کو زخمی کرتا رہا ہوں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ کر

رخساروں پر لڑھکنے لگے۔ انہوں نے بے چین ہو کر کتنے ہی صفحے ایک ساتھ پلٹ دیئے۔

☆.........☆.........☆

(15 مئی 2008ء)

''آج شام سے ہمارے گھر کا ماحول بہت ٹینس ہے۔ اس کی وجہ فریدہ پھپھو ہیں۔ وہ جب بھی ہمارے ہاں آتی ہیں کچھ نہ کچھ ایسا کر جاتی ہیں کہ دنوں ہم ماں بیٹیوں کی شامت آئی رہتی ہے۔ اب نہ جانے کتنے دن تک ابا میاں کا موڈ خراب رہے گا۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ہمارے گھریلو معاملات میں پھپھو کا اتنا عمل دخل کیوں ہے۔ یہ سب ابا میاں کی کمزوری ہے۔ اماں ان کی بیوی ہیں، ہم ان کی بیٹیاں ہیں، ہمیں زمانے کے سرد و گرم سے بچانا ان کا فرض ہے۔ لیکن یہی تو میری غلط فہمی ہے کہ ابا میاں نے ہمیں اپنا فرض سمجھا ہی کب ہے۔ ہم تو ان کے لئے نرا بوجھ ہیں جسے وہ نجانے کس مجبوری کے تحت اٹھائے ہوئے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ کسی دن پھپھو کے حکم پر وہ ہمیں گھر سے بھی نکال باہر کریں گے۔ مجھے اپنی اماں پر بہت ترس آتا ہے۔ کیسے گھٹ گھٹ کر جی رہی ہیں۔ اگر مجھے ایسے حالات میں جینا پڑے تو......نہ، نہ میں تو اس گھٹن کے تصور سے ہی مر جاؤں گی''۔

اور میں نے ایسی ہی گھٹن کو تمہارا مقدر بنانے کی کوشش کی تو تم واقعی جان ہار گئی میری نور العین۔ ہائے تم اپنے ساتھ میرا چین بھی لے گئی ہو۔ حقیقت کے آئینے میں مجھے اپنا چہرہ بہت ہی بھیانک دکھ رہا ہے۔ ابا میاں دل ہی دل میں نور سے مخاطب تھے۔ پھر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ رگڑا۔

☆.........☆.........☆

(10 مارچ 2009ء)

''آج ابا میاں کو نہ جانے کس بات پر غصہ تھا۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چائے کی پیالی زمین پر دے ماری اور اماں کو صلواتیں سنانے لگے کہ اگر بیٹیوں کی بجائے ان کے بھی پھپھو کی طرح صرف بیٹے ہوتے تو ان کی زندگی بھی ان کی بہن کی طرح جنت ہوتی۔ نہ جانے ابا میاں کو پھپھو کی زندگی کیوں جنت لگتی تھی حالانکہ ان کے تینوں بیٹے ایک سے بڑھ کر ایک آوارہ اور بگڑے ہوئے تھے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ ہمارے ابا میاں آخر کس جنت کی تلاش میں ہیں۔ اگر وہ غور کریں تو اپنی بیٹیوں کی اچھی پرورش کر کے وہ حقیقی جنت کما سکتے ہیں۔ انہیں ہمارے ساتھ سختی اور بے حسی کا رویہ اختیار کرتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ بشارت کیوں یاد نہیں آتی کہ جس نے اپنی دو یا تین بیٹیوں کی اچھی پرورش کی وہ جنت میں آپ کے ساتھ یوں ہو گا جیسے ایک ہاتھ کی دو انگلیاں۔ مجھے یہ بھی سمجھ نہیں آتا کہ ابا میاں بیٹا پیدا نہ کرنے پر اماں کو کیوں دوش دیتے ہیں جبکہ اللہ خود اس بات کا اقرار کر رہا ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے بیٹا عطا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے بیٹیاں اور جسے چاہتا ہے بیٹے اور بیٹیاں دونوں اور جسے چاہتا ہے بے اولاد رکھتا ہے۔ تو پھر بیٹا پیدا نہ کرنا اماں کا جرم کیوں ٹھہرایا جاتا ہے؟ نہ جانے ہم انسان اللہ کی اس تقسیم پر راضی کیوں نہیں ہوتے؟ ہم بیٹیوں کو زحمت اور بوجھ کیوں سمجھتے ہیں جبکہ اللہ نے انہیں رحمت قرار دیا ہے''۔

ابا میاں کے سینے کا بوجھ اتنا بڑھا کہ انہیں سانس لینا دوبھر ہو گیا۔

☆.........☆.........☆

(12 اکتوبر 2009ء)

''آج میں بہت خوش ہوں۔ میرا ایف اے کا رزلٹ آیا ہے۔ اگرچہ میں نے پرائیویٹ ہی پیپر دیئے تھے پھر بھی میری فرسٹ ڈویژن آئی

ہے۔ میں نے اس خوشی کو اپنی اماں اور بہنوں کے ساتھ مل کر منایا ہے۔ اسی خوشی میں آج اماں نے میوؤں والا زردہ بنایا ہے جو ابا سمیت ہم سب کو بہت پسند ہے۔ ابا میاں کو میں نے اپنے رزلٹ کے بارے میں بالکل نہیں بتایا۔ انہیں کون سا خوش ہونا تھا۔ انہیں تو شاید خوش ہونا آتا ہی نہیں ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے اپنے ابا میاں بہت پیارے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد بی اے کرلوں اور کوئی معقول سی نوکری کر کے اپنے ابا میاں کا سہارا بن جاؤں اور یہ ثابت کرسکوں کہ بیٹیاں بھی بیٹوں کی طرح اپنے باپ کا بازو بن سکتی ہیں''۔

اور میں کتنا بدنصیب باپ ہوں جسے اپنی بیٹی سے محبت بھی ہوئی تو کب؟ جب وہ چلی گئی جہاں سے واپسی کسی طور ممکن نہیں ہوسکتی۔ ابا میاں یہ سوچ کر سسک اٹھے۔ نورالعین کی یہ ڈائری پڑھ کر ان کا دل پھٹا جارہا تھا لیکن انہوں نے پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

☆.........☆.........☆

(5 جنوری 2010ء)

''آج پھپھو آئیں تو بہت سنجیدہ نہیں بلکہ پریشان تھیں۔ آتے ہی ابا میاں کو لے کر کمرے میں چلی گئیں۔ آدھے گھنٹے بعد ابا میاں نے اماں کو بھی اندر بلالیا۔ اماں حیران تھیں کہ آج تک ان بہن بھائیوں نے انہیں کسی بات میں شریک نہیں کیا تھا تو پھر آج یہ انقلاب کیسے؟ مجھے بھی حیرت ہوئی لیکن جب اماں نے میرے پاس رکھوائے ہوئے وہ چالیس ہزار روپے مانگے جو ان کی کمیٹی نکلنے پر ان کو ملے تھے تو مجھے ساری صورتحال سمجھ آ گئی۔ انہوں نے اماں سے صرف پیسے مانگے تھے۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ پیسے انہیں کیوں چاہئیں۔ اماں کو وجہ معلوم ہو یا نہ مگر مجھے پورا یقین ہے پھپھو کے کسی سپوت نے کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہوگا جس کے نتائج سے بچنے کے لئے پیسوں کی ضرورت آن پڑی ہوگی''۔

اماں میاں کی آنکھوں کے سامنے اس واقعے کی فلم سی چلنے لگی اور انہیں نور کے اس قدر درست اندازے پر حیرت ہوئی۔

☆.........☆.........☆

(7 نومبر 2011ء)

''ابھی تھوڑی دیر پہلے میں برآمدے سے اپنی کتاب اٹھانے گئی تو ابا میاں کا ارادہ سن کر میری روح کانپ گئی۔ ابا میاں کو یہ کیا ہوگیا؟ میں اتنی بے مایا تو نہیں کہ وہ مجھے اپنے بھانجے پر قربان کر دیں۔ اگر جو ابا میاں یہ فیصلہ میری بھلائی کے لئے کرتے تو مجھے ان کا یہ فیصلہ دل و جان سے قبول ہوتا۔ مگر وہ تو اپنی بہن کے مسائل حل کرنے کے لئے اپنی بیٹی کو قربان کرنے چلے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو اس بھانجے سے بیاہنے چلے ہیں جس کی بدکرداری کے چار نہیں کم از کم بھی چار سو گواہ تو ضرور ہوں گے۔ آج کل وہ اپنے محلے کی ایک بیاہتا عورت کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں مصروف ہے اور محلے والوں کی لعن طعن سے تنگ آ کر پھپھو نے اس مسئلے کا یہ حل نکالا ہے کہ اپنے اس آوارہ فطرت بیٹے کی شادی کر دیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ انہیں اپنے سپوت کے لئے لڑکی کہاں سے ملے گی۔ پتہ نہیں ابا میاں کا دل اتنا سخت کیوں ہے؟ یہ فیصلہ کرتے وقت ان کا دل بھی نہیں کانپا۔ میں ابا میاں کے اس فیصلے کو ہرگز تسلیم نہیں کروں گی چاہے مجھے جان سے گزرنا پڑے''۔

اور تم اپنے سخت دل باپ کی وجہ سے واقعی جان سے گزر گئیں۔ ابا میاں نے لمحے بھر کو آنکھیں بند کر لیں۔

☆.........☆.........☆

(8 نمبر 2011ء)

''آج میں اماں کے سامنے بکھر گئی۔ یہ میں نے کیا کیا؟ وہ تو پہلے ہی بہت پریشان تھیں، میں نے انہیں اور پریشان کر دیا۔ لیکن میں بھی کیا کروں؟ میں کیسے ابا میاں کے فیصلے پر سر جھکاؤں؟ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اماں کچھ نہیں کر سکیں گی۔ کاش میرے ہاتھ میں جادو کی کوئی چھڑی آ جائے تو میں سب ٹھیک کر دوں۔ سب سے پہلے ابا میاں کا دل ان کی بیوی اور بیٹیوں کے لئے نرم کر دوں''۔

ابا میاں نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنے آنسو پیئے اور اگلا صفحہ پلٹ دیا۔

☆..........☆..........☆

(14 نومبر 2011)

''آج اماں پھر ابا میاں کے سامنے گڑگڑا رہی تھیں کہ وہ اپنا فیصلہ بدل لیں۔ ابا میاں کا لہجہ ''مرتی ہے تو مر جائے'' میرے دل میں انی کی طرح گڑ گیا ہے اور مجھے بہت تکلیف دے رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کے لئے ایسے سخت الفاظ استعمال کر سکتا ہے۔ کوئی کرے یا نہ کرے لیکن یہ تو ثابت ہو گیا کہ میرے ابا میاں ایسا کر سکتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ انہیں ہمارے مرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا''۔

آؤ دیکھو میری بچی تمہارے چلے جانے سے مجھے کتنا فرق پڑا ہے۔ ایک بار پلٹ کر تو دیکھو۔ ابا میاں نے آنکھیں بند کر کے اسے دل میں مخاطب کیا اور پھر آنکھیں کھول دیں۔ ان کی نظریں اس صفحے کی اگلی سطروں پر پھسلنے لگیں۔

''ابا میاں نے بڑے زعم سے کہا کہ وہ ہمارے ولی ہیں اور ہمارے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کر سکتے ہیں۔ میں مانتی ہوں کہ اللہ نے انہیں ہمارا ولی بنایا ہے لیکن اس سلسلے میں اللہ نے قرآن میں جا بجا مختلف ہدایات بھی دی ہیں۔ ابا میاں نے صرف ولی کا عہدہ قبول کیا ہے اور اللہ کی ان ہدایات کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اگر وہ ایک بار ان ہدایات کو پڑھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اللہ نے پاک باز مردوں کے لئے پاک باز عورتوں اور پاک باز عورتوں کے لئے پاک باز مردوں کی بات کی ہے تو شاید وہ اپنی پاک باز بیٹی کے لئے ایک بدکردار مرد کا انتخاب کبھی نہ کرتے۔ باپ تو بیٹیوں کے لئے گھنا سایہ ہوتے ہیں لیکن ہمارے ابا میاں تو ایک ایسے ٹنڈ منڈ درخت کی طرح ہیں جو اپنے نیچے بیٹھنے والوں کو دھوپ کی شدت سے بچانے میں ناکام رہتا ہے۔ یا اللہ! میرے ابا میاں کا دل بدل دے۔ انہیں ہمارے لئے گھنا سایہ بنا دے۔ مجھے کتنی حسرت ہے کہ ابا میاں کبھی پیار سے مجھے ماتھے پر بوسہ دیں۔ لیکن لگتا ہے کہ مجھے یہ حسرت اپنے دل میں لئے ہی اس دنیا سے رخصت ہونا ہے۔ کیونکہ ہمارے جیتے جی تو وہ کبھی ایسا نہیں کریں گے''۔

''ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
ہمیں رنگوں کے جگنو، روشنی کی تتلیاں آواز دیتی ہیں
ہمیں ماتھے پہ بوسہ دو
کہ ہم کو تتلیوں کے، جگنوؤں کے دیس جانا ہے''

اس کے بعد کے تمام صفحے خالی تھے۔ شاید اسے پھر کچھ اور لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی اور وہ منوں مٹی تلے جا سوئی۔ اپنی بیٹی کی حسرتیں اور دل کے غم دیکھ کر ابا میاں ہچکیوں سے رونے لگے۔ ان کے رونے کی آواز سن کر اماں، حرا اور معصومہ صحن سے اٹھ کر کمرے میں آئیں اور انہیں پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھ کر خود بھی رونے لگیں۔

☆..........☆..........☆

نور کو گزرے چھ ماہ ہو چکے تھے کہ ایک روز پھپھو

چلی آئیں۔

''نور کو گزرے چھ ماہ ہو گئے ہیں۔ اب تم اس کا سوگ منانا بند کرو اور اپنی دوسرے نمبر والی بیٹی کی منگنی میرے بیٹے سے کر دو''۔ انہوں نے ابا میاں سے کہا۔

''کون سی بیٹیاں اور کس کی بیٹیاں؟ یہ صرف میری بیٹیاں ہیں۔ میری ایک بیٹی کو تو آپ لوگوں نے مجھ سے چھین لیا ہے مگر اب کسی نے میری بچیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو میں اس کی آنکھیں نکال لوں گی''۔ اماں ہسٹریک ہوئیں۔

حرا اور معصومہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی جب ابا میاں نے پھپھو کا ساتھ دینے کی بجائے اماں کا دفاع کرتے ہوئے انہیں صاف جواب دے دیا۔

پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ ابا میاں اپنی دونوں بچیوں کے لئے چھپر چھاؤں بننے لگے اور اماں سے ان کا سلوک ہمدردی اور محبت آمیز ہونے لگا۔ حرا اور معصومہ کو ابا میاں کے اس رویئے کی عادت نہیں تھی۔ وہ گھبرا جاتیں۔ ابا میاں کی ہر محبت بھری بات پر اماں کو نور یاد آ جاتی اور بھیگی پلکوں سے انہیں یوں دیکھتیں کہ وہ شرمندگی سے کٹ کر رہ جاتے۔ پھر ابا میاں یوں بدلے کہ جو دیکھتا حیران رہ جاتا۔ ہر روز نور کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھتے اور کبھی کبھی گھنٹوں نور کی تصویر کو گود میں رکھے تکا کرتے۔

☆.........☆.........☆

شام کی سیاہی دھیرے دھیرے رات کی تاریکی میں بدل رہی تھی۔ موسم خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے لٹکا ہوا پردہ ہوا کے ساتھ اڑ کر اندر کی طرف پھڑ پھڑانے لگتا اور کبھی کھڑکی میں اپنے مقام پر جا گرتا۔ ابا میاں نور کی تصویر گود میں رکھے بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے جو قطروں کی صورت میں تصویر کے شیشے پر گر رہے تھے۔

''میری بچی نے میرے دل میں اپنی محبت جگانے کی قیمت اپنی جان دے کر چکائی ہے''۔ ان کے دل سے یہ پچھتاوا جاتا ہی نہ تھا۔ ان کی حالت اور تڑپ دیکھ کر اماں کو بھی اب ان پر ترس آنے لگا تھا۔

اماں کمرے میں آئیں تو انہیں اس طرح روتے دیکھ کر ان کے قریب چلی آئیں۔

''بس کریں کیوں ہر وقت روتے رہتے ہیں؟'' اماں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میں بہت برا انسان ہوں۔ میری بچی میری پیار بھری نظر کی حسرت لئے چلی گئی مگر میں سنگدل موم نہ ہوا۔ میں ایسا کیا کروں کہ میری نورالعین کو چین آ جائے''۔ انہوں نے پچھتاوے کے احساس سے مغلوب ہو کر کہا۔

''بس کریں اللہ کی امانت تھی وہ ہمارے پاس، اس نے واپس لے لی''۔ اماں نے تسلی دی۔

''اور میں اللہ کی اس امانت کی حفاظت نہ کر سکا''۔ ان کے لہجے میں بہت افسوس تھا۔

''تم دیکھنا میں اب ویسا ہی بن جاؤں گا جیسا میری بیٹی چاہتی تھی۔ میری وجہ سے میرے آنگن کا ایک پھول مرجھا گیا ہے لیکن اپنے باقی دو پھولوں کے لئے میں ایسا گھنا سایہ بن جاؤں گا جو انہیں زمانے کے ہر سرد و گرم سے بچائے گا اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس عمل سے خوش ہو کر میری نورالعین اپنے اس بدنصیب باپ کو معاف کر دے گی۔ کر دے گی ناں؟'' انہوں نے اماں سے تصدیق چاہی۔

اماں نے نم آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ کر سر ہلایا اور ان کی اس بات سے دور آسمانوں پر نورالعین کی روح مسکرا اٹھی تھی۔

☆.........☆.........☆

سیدہ فرزانہ حبیب فرزین

افسانہ

اپریل فول یا فضول رسم

آج کالج میں مس رابعہ کا اپریل فول کے حوالے سے خصوصی لیکچر تھا۔ جس کا بی ایس سی کی طالبات کو بے چینی سے انتظار تھا کچھ اس دن کے حق میں تھیں اور کچھ طالبات مخالفت میں چنانچہ ان کے پرزور



اصرار پر ہی مس رابعہ جو اسلامیات کی قابل اور تمام طالبات کی ہر دلعزیز پروفیسر تھیں، انہوں نے خصوصی لیکچر دیا کلاس میں ان کے آتے ہی خاموشی چھا گئی تھی۔

''السلام علیکم میری بچیوں!'' مس رابعہ نے اپنے مخصوص اور نرم لہجے میں سلامتی بھیجی جس کا خوب صورت اور پرجوش جواب دیا گیا۔

''جی ڈیئر اسٹوڈنٹ! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کل یکم اپریل ہے جسے ہر سال اپریل فول کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے، جو قطعی ہم مسلمانوں کا تہوار نہیں۔ آیئے اس کی اصل حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہیں کہ اصل میں اس کی حقیقت اور تاریخ ہے کیا۔''

مس رابعہ نے ٹرانسپیرنسی لگاتے ہوئے طالبات کی طرف دیکھا۔ ان کی گمبھیر اور پراثر آواز پر طالبات ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔ جس میں بالخصوص حرا کی سماعت مس رابعہ کی باتوں کی طرف تھی۔

''اپریل لاطینی زبان کے لفظ Aprilis سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ہے پھولوں کا کھلنا۔ قدیم



رومی موسم بہار کی آمد پر شراب کے دیوتا کی پرستش کرتی اور اسے خوش کرنے کے لیے شراب پی کر اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے تھے۔ یہ جھوٹ رفتہ رفتہ اپریل فول کا اہم حصہ بلکہ غالب حصہ بن گیا۔ انسائیکلو پیڈیا انٹرنیشنل کے مطابق مغربی ممالک میں یکم اپریل کو عملی مذاق کا دن قرار دیا گیا ہے مگر افسوس کہ یہ فضول رسم مسلم معاشرے میں آکٹوپس کی طرح ایک اور لازم حصہ بن چکی ہے اور مسلمان اپنے ہی مسلمان بہن بھائیوں کی تباہی و بربادی پر خوشی مناتے ہیں اور اپنے ہی مسلمان بھائیوں کو فول بنا کر ان کو مصیبت و پریشانی میں ڈالتے ہیں۔" یہاں تک کہہ کر مس رابعہ نے طالبات پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی حرا جیسے اپریل فول کی دردناک حقیقت سے واقف ہو رہی تھی، اس کی آنکھوں سے ندامت کے اشک بہہ رہے تھے۔ مس رابعہ نے آگے بتانا شروع کیا۔

"جب عیسائی افواج نے اسپین کو فتح کیا تو اس وقت اسپین کی زمین پر مسلمانوں کا بہت خون بہایا گیا جب قابض عیسائی افواج کو یقین ہو گیا کہ اسپین میں اب کوئی مسلمان نہیں بچا تو انہوں نے گرفتار مسلمانوں کو یہ موقع دیا کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ واپس مراکش چلے جائیں، جہاں ان کے آباؤ اجداد تھے۔ بظاہر اب اسپین میں کوئی مسلمان نظر نہیں آرہا تھا مگر اب بھی عیسائیوں کو یقین تھا کہ سارے مسلمان قتل نہیں ہوئے کچھ اپنی شناخت چھپا کر زندہ ہیں لہٰذا مسلمانوں کو باہر نکالنے کے لیے ایک منصوبے کے تحت اعلان کیا کہ تمام مسلمان غرناطہ میں جمع ہو جائیں، انہیں خیر و عافیت کے ساتھ ان کے ممالک بھیج دیا جائے گا چونکہ امن قائم ہو چکا تھا لہٰذا مسلمان ان کی جھوٹی باتوں میں آکر غرناطہ میں اکٹھے ہوئے، جہاں ان کی خاطر مدارات کے بعد یکم اپریل کے دن بحری جہاز میں بٹھا دیا گیا۔ مسلمانوں کو اپنا وطن چھوڑنے کا دکھ تو تھا مگر جان بخشنے پر مطمئن بھی تھے، دوسری جانب عیسائی حکمران اپنے محلوں میں جشن منا رہے تھے۔ ان مسلمانوں میں بوڑھے، جوان، بچے، عورتیں، مریض شامل تھے جب جہاز سمندر کے وسط میں پہنچا تو منصوبہ بندی کے تحت پانی میں ڈبو دیا گیا اور یوں تمام مسلمان ابدی نیند سو گئے۔ اس کے بعد عیسائی جرنیلوں اور حکمرانوں نے مسلمانوں کے بے وقوف بن جانے پر خوب جشن منایا اور انگریزوں میں اسے 1st April fool کا نام دیا گیا، آج بھی عیسائی اسے بڑے اہتمام سے مناتے ہیں اور لوگوں کو جھوٹ بول کر بے وقوف بنایا جاتا ہے۔

ڈیئر آپ کو معلوم ہے کہ جھوٹ کی ہمارے مذہب میں ممانعت ہے پھر جب خاص کر اسے دوسروں کی دل آزاری کا ذریعہ بنایا جائے سوچیے ہم کس طرف جا رہے ہیں؟ کیا ہمارے نبی پاک کی یہی تعلیمات ہیں جیسا کہ آپ نے جھوٹ کے متعلق فرمایا۔

"ہلاکت و بربادی ہے اس شخص کے لیے جو دوسروں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولے۔ وہ برباد ہوا، برباد ہوا۔"

ایک اور جگہ فرمایا۔ "جھوٹ سے بچو، بے شک جھوٹ نفاق کا دروازہ ہے۔"

چنانچہ ہمارے معمولی سے مذاق یا جھوٹ سے آپ کو معلوم ہے کیا کیا نقصانات ہوتے ہیں، سب سے پہلے اس عمل سے ہم دشمنوں کی خوشی میں شرکت کرتے ہیں۔ نفاق میں ڈوب جانا، اللہ کی ناراضی پانا، مسلمان بہن بھائیوں کو تکلیف اور اذیت سے دوچار کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا و آخرت میں صرف خسارہ ہی خسارہ ہے۔ میں امید کرتی ہوں آپ لوگ نہ صرف خود اس فضول رسم کا بائیکاٹ کریں گے بلکہ اپنے دوستوں کو بھی اس سے باز رکھیں۔"

مس رابعہ کا لیکچر ختم ہو گیا تھا۔ تمام طالبات اب تک ان کی سحر انگیز گفتگو میں کھوئی ہوئی تھیں اور آپس

میں عہد کر رہی تھیں کہ اس طرح کی غیر اخلاقی و غیر اسلامی فضول رسم کو منا کر اپنے پیاروں کو اذیت و تکلیف نہیں پہنچائیں گی۔ نہ ہی ان کی دل آزاری کریں گی، آہستہ آہستہ پوری کلاس خالی ہو گئی۔ حرا بھی حزن و ملال کی کیفیت میں لپٹی اپنا بیگ اور چادر سنبھالتے کالج گیٹ کی طرف روانہ ہوئی۔ گھر پہنچ کر اس نے حسب توقع ماما کو اپنا انتظار کرتے پایا۔

''السلام علیکم ماما!'' حرا نے اداسی سے جواب دیا۔

''وعلیکم السلام بیٹا! تھک گئی ہو گی۔ جاؤ فریش ہو جاؤ پھر کھانا کھاتے ہیں۔'' ماما نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا پھر حرا اور ماما نے مل کر کھانا کھایا۔ ماما اپنے کمرے میں آرام کرنے چلی گئیں جبکہ حرا ظہر کی نماز ادا کرنے لگی۔

''اے میرے رب! اے شہ رگ سے بھی قریب مالک! مجھے معاف کر دے۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے ناسمجھی اور بے وقوفی میں ایک غلطی سرزد ہوئی، جس پر میں بہت شرمندہ ہوں اور آج مس کے لیکچر نے مجھے مزید میری حماقت کا احساس دلایا۔ اے پروردگار تو ستر ماؤں سے زیادہ چاہنے والا ہے تو جانتا ہے کہ میرا مقصد کسی کی دل آزاری کرنا نہیں تھا، وہ میری کم عمری اور کم علمی کی ایک بھول تھی جس پر تو مجھے معاف کر کے میرے پیاروں کا اعتبار اور محبت واپس لوٹا دے۔'' حرا کرب و اذیت سے دعا مانگتے ندامت کے اشک بہانے لگی۔

آج کا دن پھر اسے ماضی کے درد ناک جھروکوں میں لے گیا، جس میں جھانکتے اس نے سختی و کرب سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

☆☆☆

ارشد اور عابد صاحب دو بھائی تھے۔ ارشد صاحب کے دو بچے ساحل اور دعا تھے جبکہ عابد صاحب کی صرف ایک ہی بیٹی حرا تھی۔ ساحل نے ایم بی اے کے بعد اپنے بابا اور چاچو کے ساتھ خاندانی بزنس سنبھال لیا تھا جبکہ حرا اور دعا ہم عمر اور سیکنڈ ایئر کی طالبہ تھیں۔ حرا اپنی چلبلی فطرت کی وجہ سے دونوں گھرانوں کے لیے مرکز نگاہ تھی۔ دونوں کا بچپن شرارتیں کرتے گزرا تھا۔ جس میں زیادہ ہاتھ حرا کا ہوتا مگر بڑے اس کی معصوم اور بے ضرر شرارتوں کو انجوائے کرتے۔ حرا کا رشتہ بچپن ہی سے ساحل سے طے تھا اور اب ارشد صاحب کے ایک دوست کے توسط سے دعا کا رشتہ بھی طے ہو گیا تھا۔ دعا کی شادی انٹر کے امتحان کے فوراً بعد کرنے کا ارادہ تھا کیونکہ لڑکے نے شادی کے فوراً بعد دبئی شفٹ ہو جانا تھا۔

''دعا یار! تمہاری شادی ہو جائے گی تو میں کیا کروں گی؟ مجھے تو اکیلے سونے اور کھانا کھانے کی عادت بھی نہیں اور پھر شرارتیں کرنے پر ماما سے مجھے کون بچائے گا؟'' حرا نے منہ بسورتے ہوئے معصومیت سے کہا۔

''ارے اس میں اتنا اداس بلبل بننے کی کیا ضرورت ہے۔ مائی ڈیئر کزن! ہم روز اسکائپ اور موبائل پر ڈھیروں باتیں کریں گے اور پھر اکیلی کب ہو؟ ساحل بھائی ہیں ناں ان سے.....'' اس سے پہلے دعا مزید کچھ گوہر افشانی کرتی ساحل کی آواز پر دونوں گفتگو کرتی ہوئی اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

''دعا! تمہیں ماما بلا رہی ہیں شاید ڈریس ڈیزائنر کے پاس جانا ہے۔'' ساحل نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

''اوہ ہاں میں تو بھول ہی گئی تھی۔'' یہ کہہ کر دعا وہاں سے اندر چلی گئی اب ساحل اور حرا اکیلے تھے۔ حرا نے بھی ساحل کی پرشوق سناحر نگاہوں سے گھبرا کر وہاں سے بھاگنا چاہا مگر ساحل نے اس کا ہاتھ اپنی گرفت میں لے کر اسے اس کے ارادوں سے باز رکھا۔

''کہاں چلیں محترمہ! ابھی تو بڑی پٹر پٹر زبان

چل رہی تھی، اب اتنی خاموشی..... اور یہ تم کیا کہہ رہی تھیں کہ اکیلی رہ جاؤ گی، بور ہو جاؤ گی۔'' ساحل نے اس کا ہاتھ تھامے تھامے برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھتے ہوئے کہا جس پر حرا اتنی نٹ کھٹ اور بولڈ ہونے کے باوجود جھینپ کر رہ گئی اور اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ساحل اس کی ادا پر مسکرا کر رہ گیا۔

''ویسے میرے پاس تمہاری بوریت اور اکیلے پن کو دور کرنے کا حل ہے۔'' ساحل کی بات پر حرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ کیا؟'' ساحل اس کی بے چینی پر ہنس دیا۔

''وہ یہ ڈیئر کزن پلس سوئٹ فیانسی کہ دعا کے ساتھ ساتھ آپ کو بھی رخصت کروا کر اپنے کمرے میں لے آتے ہیں پھر تمہیں اکیلے سونا نہیں پڑے گا اور ہر وقت میری کمپنی حاضر......'' ساحل نے اس کی طرف تھوڑا جھکتے ہوئے کہا۔

''کیا......؟'' حرا تو اس کی اتنی بے باکی پر شرم سے سرخ ہو گئی اس نے ہمیشہ ساحل کو سنجیدہ و سوبر روپ میں دیکھا تھا اور آج حرا کو اس کی پرشوق بولتی نگاہوں سے مسلسل الجھن ہو رہی تھی۔

''جی نہیں میرے گریجویشن سے پہلے ایسا سوچئے گا بھی مت۔'' یہ کہہ کر وہ وہاں رکی نہیں بلکہ اپنے کمرے میں آ کر ہی دم لیا مگر اب ساحل کی شوخ باتوں کی گونج اور پرشوق نگاہوں کا طلسم اسے آئندہ زندگی کے خوش نما خواب دکھا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خوب صورت سی مسکان سج گئی۔

☆☆☆

جیسے جیسے دعا کی شادی کے دن قریب آ رہے تھے، خوشی کے ساتھ ساتھ ایک اداسی بھی تھی، جس نے اس گھر کے تمام مکینوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب دعا کو خوشی و غم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ پیا کا نام کا پیلا جوڑا پہنا کر مایوں بٹھا دیا گیا۔ حرا نے اپنی چلبلی فطرت اور شرارتوں سے پوری محفل کو زعفران زار بنایا ہوا تھا، سب اس کی معصومانہ باتوں اور چٹکلوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دعا کی ماما نے دل ہی دل میں دونوں بچیوں کی خوشیوں کے قائم رہنے کی دعا مانگی اور ان کی نظر اتاریں۔ ساحل کی آنکھیں بھی اپنی بہن کے وداع ہونے کے خیال سے نم ہو گئی تھیں مگر پھر وہ اس کی خوش آئند زندگی کا سوچ کر اپنی جذباتی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے حرا کی باتوں کی طرف متوجہ ہوا جو اب بابا سے مزید شاپنگ کے لیے پیسے مانگ رہی تھی۔

☆☆☆

کل دعا کی بارات تھی، آج اسے حرا کے ساتھ پارلر جانا تھا جہاں اس کی اپائنٹمنٹ تھی۔ پارلر میں اتنی دیر تک بیٹھنا حرا جیسی چلبلی اور بے چین روح کے لیے صبر آزما کام تھا ادھر ادھر بے زاری سے دیکھتے ہوئے اس کی نظر دعا پر پڑی وہ کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں آنے والی خوشگوار ازدواجی زندگی کے خوب صورت سپنوں نے اس کے چہرے کو الوہی رنگوں سے سجا دیا تھا۔ حرا نے چٹ پٹ اسے پیار کیا پھر اس کے ساتھ باہر آئی اس کا ارادہ اپنی اور دعا کی مشترکہ دوست ثمین کے ساتھ کچھ وقت گزارنے کا تھا۔

☆☆☆

دعا کی ساس کچھ ضروری معاملات طے کرنے آئی ہوئی تھیں۔ بڑوں کے درمیان بات چیت چل رہی تھی۔ ساحل بھی وہیں موجود تھا کہ ایک دم اس کے موبائل کی رنگ ٹون پر کمرے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہوا ساحل نے بغیر دیکھے کال ریسیو کی۔ غلطی سے اسپیکر کا بٹن آن ہو گیا تھا۔ جس سے آنے والی آواز نے تمام نفوس کو بت بنا دیا۔

''ہیلو......ہیلو آپ سن رہے ہیں ناں۔ میں حرا

اور دعا کی دوست شرمین بات کررہی ہوں۔ آج آئس کریم کھاتے ہوئے واپسی پر دعا کو کسی نے اغوا کرلیا ہے۔ حرا کی حالت بھی تشویش ناک ہے پلیز آپ حوصلہ کریں جیسے ہی حرا کو ہوش آتا ہے میں اسے لے کر آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر لائن ڈس کنیکٹ ہوگئی۔ ساحل کے ہاتھ سے سیل فون گر گیا۔ سب سے پہلے دعا کی ساس کو ہی ہوش آیا۔

''اغوا......'' ان کے منہ سے سنسناتی گولی کی طرح آواز نکلی جس نے تمام نفوس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''معاف کیجیے گا بھائی صاحب! آپ کی بیٹی اغوا ہوئی ہے۔ اللہ کرے وہ مل جائے مگر اب وہ میرے بیٹے کے قابل نہیں رہے گی کیونکہ لٹیرے صرف مال نہیں بلکہ عزت بھی......'' مسز زبیر کی سفاکی پر سب سے پہلے ساحل ہوش میں آیا۔

''بس آنٹی! میری بہن کے بارے میں مزید ایک بھی غلط لفظ نہیں یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے جو کسی کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ آپ اسے قبول کریں یا نہ کریں مگر وہ ہمارے لیے ہمیشہ ویسے ہی رہے گی جیسے چند لمحے قبل ملنے والی اس بھیانک خبر سے پہلے تھی۔ اللہ اس کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔'' ساحل کی سچی اور کھری باتوں اور اٹل لہجے پر مسز زبیر خاموشی سے چلی گئیں۔ پل بھر میں اردگرد دعا کے اغوا کی خبر پھیل گئی۔ اندھیرا بڑھتا جارہا تھا۔ اب تک حرا کی واپسی کے بھی کوئی آثار نہیں تھے اس کی دوست کا بھی کسی کو پتا معلوم نہیں تھا۔ ایسا لگتا تھا یہ اندھیری رات ان کی خوشیوں کو نگل لے گی اور آنے والی صبح نہ جانے ان کی زندگی میں کون سی رسوائی کے داغ سجانے والی تھی؟ ان سب کے لب پر دعا کی سلامتی و خیریت سے واپسی کی دعا تھی۔ سب کو حرا کی بھی فکر تھی۔ ساحل نے پولیس میں رپورٹ درج کروانی چاہی مگر ارشد صاحب نے سختی سے منع کردیا انہیں اپنا خاندانی وقار اور بیٹی کی عزت بہت عزیز تھی۔ اب سب کو حرا کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس سے ہی صحیح صورت حال کا اندازہ لگا کر کوئی قدم اٹھایا جاسکتا تھا۔ ساحل نے اس کی دوست سے آنے والے نمبر پر کال کرنا چاہا مگر سیل پاور آف جارہا تھا۔ بالآخر دو گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد حرا اپنی دوست کے ساتھ آتی نظر آئی۔

''السلام علیکم! Happy april fool day بتایئے کیسا لگا آپ سب کو میرا فول بنانا؟'' حرا کی زندگی سے بھرپور اور کھنکتی آواز سنائی دی جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ سب نے چونک کر حیرانی سے اس کی طرف دیکھا انہیں لگا شاید صدمے سے حرا کی دماغی حالت ابتر ہوگئی ہے مگر وہ تو بالکل ہوش وحواس میں اپنی دوست کے ساتھ مسکرارہی تھی۔

''کیا ہوا...... آپ سب اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' آخر حرا کو ہی انہونی کا احساس ہوا۔

''دعا کہاں ہے حرا؟'' ساحل کی غراتی آواز آئی۔ حرا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ اس کی دوست شرمین بھی ساحل کے رویے پر سہم گئی تھی۔

''وہ ساحل...... اصل میں دعا اور میں پارلر سے واپسی پر شرمین کے گھر چلے گئے تھے پھر فرسٹ اپریل کی وجہ سے میں نے آپ لوگوں کو دعا کے اغوا کا بتا کر بے وقوف بنانا چاہا۔'' حرا نے ساحل اور وہاں موجود باقی لوگوں کے پریشان چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے اٹکتے اٹکتے وضاحت دی۔ اتنے میں دعا بھی اندر آچکی تھی۔ اس کے لیے بھی یہ ساری صورت حال غیر یقینی اور غیر معمولی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ حرا نے شرمین کے ساتھ مل کر کوئی اپریل فول پلان بنایا ہے جس پر اس نے اسے روکا بھی تھا مگر وہ حرا ہی کیا جو کسی کی بات مان جائے مگر اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس کی ذات کو نشانہ بنا کر اتنا سنگین

مذاق کرے گی۔

''تمہیں اندازہ ہے کہ تمہاری اس حماقت نے آج کتنا بڑا نقصان کیا ہے نہ صرف دعا بلکہ پورے خاندان کو رسوائی اور بے عزتی سے دوچار کر دیا ہے۔ حرا مجھے تم سے اس بچکانہ حماقت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔'' عابد صاحب نے بھی حرا کو جھنجوڑتے ہوئے اپنے غصے پر قابو پاتے ڈپٹا۔

''وہ پاپا......'' حرا کی گھبرائی آواز ساحل کی تیز چبھتی ہوئی آواز میں دب کر رہ گئی۔

''بس......اب اور کچھ نہیں سننا۔ بے وقوف اور لاپروا تو تم شروع سے تھیں مگر تم میری معصوم اور پرخلوص بہن کے ساتھ ایسا سلوک کرو گی یہ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہارے اس مذاق سے دعا کا رشتہ ختم ہو گیا ہے۔''

''کیا......کیا کہا؟'' حرا کے ساتھ دعا بھی یہ سن کر بالکل ڈھے گئی۔ اب حرا کو اپنی حماقت کا شدت سے احساس ہو رہا تھا مگر پانی سر سے گزر چکا تھا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔'' عابد صاحب کی غصیلی آواز پر ماما اور تائی اسے وہاں سے لے گئیں۔ دعا تو صدمے سے بے ہوش ہی ہو گئی تھی۔ شرمین کو حالات کی سنگینی پر شرمندگی سے برا حال تھا۔

''کاش وہ حرا کی بات میں نہ آئی ہوتی۔'' اس نے تاسف سے سوچا پھر حرا نے ہمت کر کے بڑی مشکل سے دعا کی ساس کو فون کر کے ساری صورت حال بتائی اور ایک بار آنے پر راضی کیا ان کے ساتھ ان کا بیٹا بھی تھا جسے حرا کی بات پر یقین آ گیا تھا پھر شرمین نے بھی ساری روداد سنائی کہ یہ صرف اپریل فول کا ایک مذاق تھا، حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ شرمین نے اپنے سیل فون پر لی ہوئی ساری تصویریں بھی دکھائیں جو آج اس کے گھر پر لی گئی تھیں اس طرح ان کا اعتبار بحال ہوا اور دعا کے کردار سے رسوائی کا داغ ہٹا۔ دعا کی شادی عزت و خیریت کے ساتھ ہو گئی۔ حرا نے سکون کا سانس لیا اور اپنے دل پر دھرے ندامت کے بوجھ کو ہلکا ہوتا محسوس کیا مگر رخصتی کے وقت دعا نے جس طرح اس کا خلوص سے بڑھا ہاتھ جھٹکا اور آنکھوں میں بے اعتباری لیے سرد نگاہوں سے دیکھا وہ ایک بار پھر حرا کو عرق ندامت میں بھگو گیا۔ گھر والوں کا رویہ بھی اس کے ساتھ لیا دیا تھا۔ تایا جی نے اپنے پورشن میں دیوار کھڑی کر لی۔ یہ دیوار صرف دو گھرانوں کے درمیان نہیں بلکہ دو خاندانوں کے دلوں میں کھڑی ہو گئی تھی جس کو گرانا اب ناممکن تھا۔ ماما اور پاپا نے تو اس کو معاف کر دیا تھا کہ آخر والدین تھے اور انہیں پتا تھا کہ ان کی بیٹی کی معصومیت اور نادانی کی وجہ سے یہ غلطی سرزد ہوئی۔ کاش ہمارے معاشرے میں اس طرح کی بیہودہ مغربی روایات پر پابندی عائد ہو جائے جس سے کئی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ساحل نے بھی پلٹ کر خبر نہیں لی پتا چلا کہ وہ تایا، تائی کے ساتھ امریکا میں شفٹ ہو گیا اور جاتے وقت اس نے ملنا بھی گوارہ نہیں کیا۔ وہ مانتی تھی کہ اس سے غلطی سرزد ہوئی مگر اس کا مقصد خدانخواستہ دعا کی زندگی خراب کرنا یا رشتوں میں دراڑیں ڈالنا نہیں تھا مگر اتنی معافی و تلافی کے باوجود اس کی معمولی سی خطا کو معاف نہیں کیا گیا اور اس کا یہ مذاق اس کی اپنی زندگی کو مذاق بنا گیا۔ نہ صرف اس نے پرخلوص دوست کے اعتبار کھویا بلکہ اپنی نوخیز عمر کی اولین چاہت کو بھی نفرت کی آگ میں جھلسا دیا۔ ساحل نے وہیں شادی کر لی تھی بابا بھی اپنوں کی جدائی کے غم میں دنیا سے چلے گئے، حرا اب بی ایس سی کر رہی تھی اب اس کی زندگی میں سنجیدگی و متانت آ گئی تھی۔ ساحل کے بعد اس کے دل کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور یہ سزا اس نے خود اپنے لیے چنی تھی۔

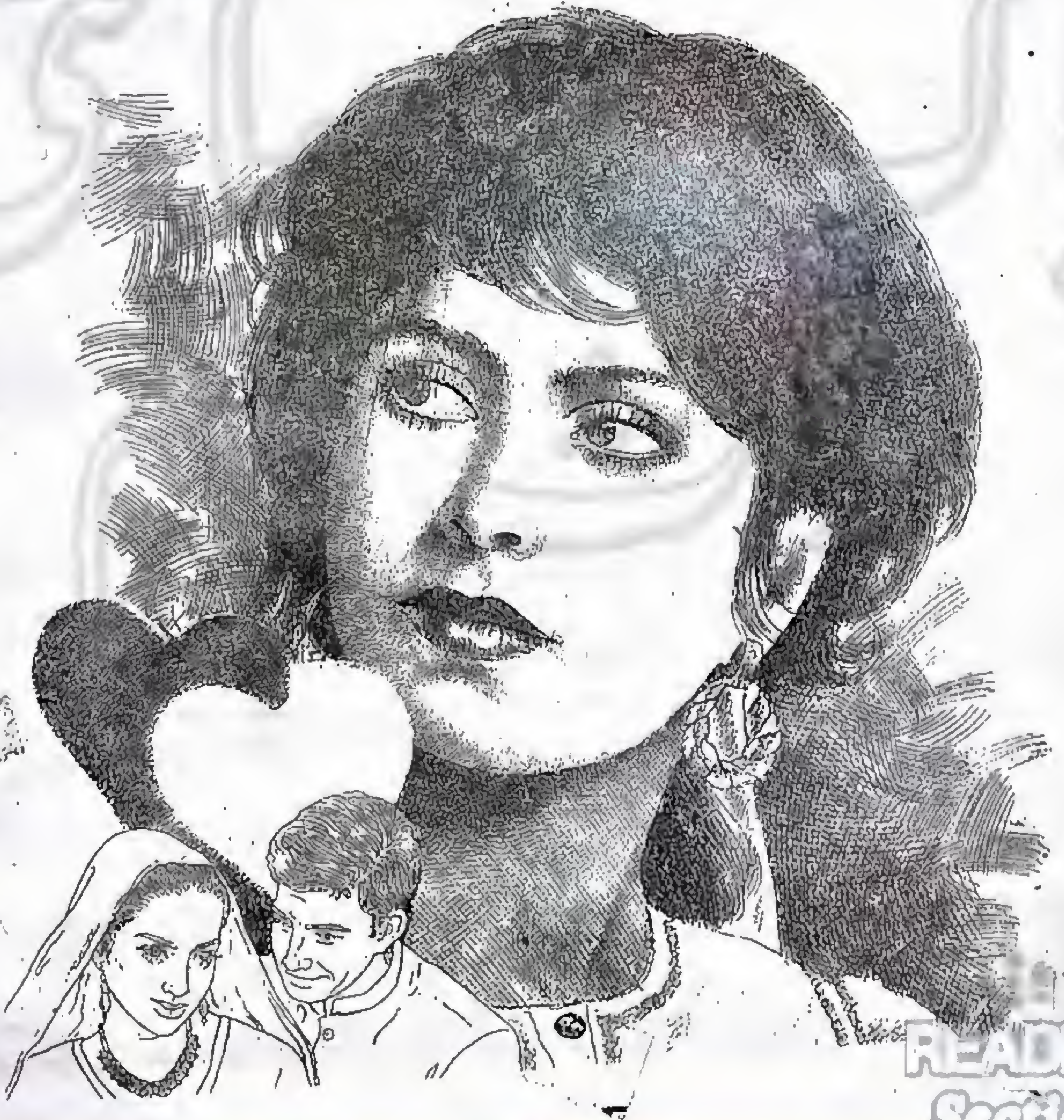
☆......☆......☆

ماریا یاسر

افسانہ

ہیں ایسے بھی مہرباں

''ماہ رخ بیٹا! ذرا تم یہ برتن تو کچن میں لے جاؤ، میں آکے ابھی دھوتی ہوں''۔ رخسانہ نے ڈائننگ ٹیبل پر پڑے برتنوں کی طرف اشارہ کیا اور خود ریموٹ اٹھا کے ٹی وی آن کر دیا۔



''مما! کیا مصیبت ہے، مجھے اپنا پروگرام دیکھنا ہے اسٹارٹ ہو گیا ہے، آپ پلیز خود اٹھا لیں ناں''۔ اس نے ڈائننگ ٹیبل پر بکھرے بے تحاشا برتنوں سے خائف ہو کے کہا۔

''سیدھی طرح کرو جو بولا ہے، نادرا کی طرح کام چور مت بنو، آج ویسے بھی اس نے چھٹی کر کے میرا موڈ سخت خراب کیا ہوا ہے، اوپر سے تم بحث کر کے مزید آف مت کرو''۔ انہوں نے ماسی کی چھٹی کا غصہ 14 سالہ ماہ رخ پر نکالا جو دانت پیستے ہوئے برتن سمیٹنے لگی۔

''آنے دو اس کام چور کو کل، سیدھا کرتی ہوں اس مہارانی کو، ہزار بار بولا ہے sunday کو چھٹی مت کیا کرو، سب گھر پر ہوتے ہیں تو پہلے ختم نہ ہونے والے کاموں کا ڈھیر ہوتا ہے، اوپر سے اس کے کام بھی کرنے پڑ جاتے ہیں، اسی لئے اس حرام خور کو 300 روپے ایکسٹرا دیتی ہوں کہ اتوار کو چھٹی نہ کرے لیکن پھر بھی یہ باز نہیں آئی، کل اچھی طرح خبر لیتی ہوں''۔ وہ نگاہیں ٹی وی پر جمائے خود ہی سوال جواب کرنے لگیں۔

''مما! میں رکھ آئی ہوں برتن۔ اب ریموٹ مجھے دیں ناں۔ آج کی چھٹی ہے تو آپ لے کر بیٹھ گئیں ہیں ریموٹ''۔ اس نے ماں کے ہاتھ میں ریموٹ دیکھا تو سخت بدمزہ ہوئی۔

''ہاں ہاں دیتی ہوں بس 2 منٹ مجھے ذرا یہ تو دیکھ لینے دو، کتنے زبردست کپڑے پہنے ہوئے ہیں اس ہوسٹ نے، ذرا غور سے تو دیکھ لوں، تمہاری سالگرہ کے لئے میں بھی ایسا ہی جوڑا ڈیزائن کرواؤں گی جو دیکھے گا دیکھتا ہی رہ جائے گا''۔ وہ نادرا کو بھول بھال کے ہوسٹ کے کپڑوں میں مگن ہو گئیں۔

''مما! یہ پروگرام تو ری پیٹ ہے، لائیو تو آپ نے دیکھا ہو گا ناں۔ پلیز مجھے دیکھنے دیں''۔ اس نے ماں کے ہاتھ سے ریموٹ تقریباً چھینتے ہوئے کہا۔

''توبہ ماہ رخ کتنی بدتمیز ہو گئی ہو تم، ذرا لحاظ نہیں ماں کا''۔ انہوں نے غصے کی ایک زبردست گھوری سے نوازتے ہوئے کچن کی راہ لی۔

☆..........☆..........☆

''آ گئی تم، کیا ضرورت تھی آج بھی آنے کی''۔ نادرا ابھی اندر آئی ہی تھی کہ رخسانہ نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ باجی طبیعت خراب تھی اس لئے نہیں آ سکی''۔ اس نے سرعت سے برتن دھوتے کہا۔

''ارے بس کر نادرا بی بی، رہنے دے اپنے یہ بہانے، ہر ہفتے تو 2 بار تم یہی بہانہ بناتی ہو، خدا کا خوف کر روز جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی کیا اور خبردار جو مجھے آئندہ باجی بولا۔ بی بی جی بولا کرو سیدھے سیدھے''۔ وہ جو اس کی چھٹی پر کلاس لے رہی تھیں ''باجی'' کے لفظ پر دھیان گیا تو سخت بدمزہ ہوئیں۔

''جی بی بی جی اور بی بی خدا جھوٹ نہ بلوائے میں ٹھیک کہہ رہی ہوں جی، میری طبیعت کل بڑی خراب تھی، بلکہ بچوں کو بھی پرسوں شام وہ حنا باجی نے پرانا سالن دے دیا وہ ہم ماں بیٹیوں نے کھا تو لیا، پر جی پتہ نہیں کیا بات تھی کھا کے میری اور میری بچیوں کی حالت ایسی خراب ہوئی، پیٹ میں اتنا درد کہ اللہ کی پناہ، حکیم سے دوائی جا کے لائی تو تب جا کے ٹھیک ہوا۔ پتہ نہیں کیا مسئلہ تھا کیا پتہ خراب سالن کھا لیا۔ لیکن خراب ہوتا تو حنا باجی مجھے کیوں دیتی''۔ وہ رخسانہ کے پاؤں میں بیٹھی اپنا مسئلہ بیان کر رہی تھی۔

''بس کر دے تو زیادہ نخرے نہ کیا کر۔ ایک تو لوگ تجھے کھانے کو دیتے ہیں اوپر سے تو اُسی میں سے کیڑے نکالتی ہے۔ شکر کیا کر، ناشکری مت بن اور چل جا کے اپنا کام کر، باتیں تو کوئی تجھ سے سیکھے اور خبردار جو آئندہ چھٹی کی، میں تجھے فارغ کر دوں گی اب کی بار''۔ وہ کہہ کے ٹی وی کی طرف متوجہ ہوئیں تو نادرا بولی۔

''نہ بی بی جی اب نہیں کرتی چھٹی''۔ کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆..........☆..........☆

''میں سوچ رہی ہوں کہ اس بار ہم ماہ رخ کی برتھ ڈے پارٹی بڑے پیمانے پر کریں''۔ وہ جو اخبار میں مشغول تھے بیوی کی بات پر ذرا سا دھیان ہٹا کے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے پچھلی بار بھی ہم نے خود ہی گھر میں کیک کاٹ لیا تھا، اس بار سب فیملی فرینڈز کو انوائٹ کریں گے''۔ انہوں نے وضاحت پیش کی۔

''جیسے آپ کی مرضی میں کون ہوتا ہوں آپ کی مخالفت کرنے والا''۔ انہوں نے لاڈ سے بیگم کی طرف دیکھا تو وہ جیسے کھل اٹھیں۔

''اچھا تو ٹھیک ہے پھر میں لسٹ بنا لیتی ہوں مہمانوں کی''۔ وہ خوشدلی سے کہتے اٹھ گئیں تو فہد صاحب بیگم کی جلد بازی پر مسکرا دیئے۔

☆......☆......☆

''اف یار! میں تو تھک ہی گیا آج''۔ فہد صاحب نے چشمہ اتار کے سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور تکیے سے ٹیک لگائی۔

''تھک تو میں بھی بہت گئی ہوں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ بہت اچھے سے ہو گیا۔ کھانا کم بھی نہیں پڑا اور تھا بھی بہت مزے کا، خاص طور پر بریانی تو بہت ہی لاجواب تھی۔ ماہ رخ بھی بہت خوش ہے اس پارٹی سے، اس کی آنکھوں کی چمک اس کی خوشی بتانے کے لئے کافی ہے''۔ رخسانہ اکلوتی بیٹی کے مطمئن سے چہرے کو یاد کر کے خود بھی مطمئن ہو گئیں۔

''اب سو جائیں آپ بھی پھر صبح آفس سے لیٹ نہ ہو جائیں کہیں، میں بھی سونے لگی ہوں 2 تو بج ہی گئے ہیں۔ صبح نادرا سے لان کی تفصیلی صفائی بھی کرانی ہے۔ پارٹی تو اچھے سے ہو گئی لیکن اپنے پیچھے خوب ڈھیر سارا کچرا چھوڑ کے گئی ہے، اب اللہ کرے کہیں وہ مہارانی صبح چھٹی نہ مار لے ورنہ تو بہت مسئلہ ہو جائے گا''۔ نیند کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے یہ آخری سوچ تھی جو ان کو پریشان کرنے کے لئے کافی تھی۔

☆......☆......☆

''مما! اتنی ڈھیر ساری بریانی بچ گئی ہے، آج نادرا آنٹی آئیں تو آپ ان کو دے دیجئے گا۔ آنٹی کے بچوں کے کام آ جائے گی''۔ ماہ رخ نے تھکاوٹ کی وجہ سے آج اسکول سے چھٹی کی تھی، اب کچن میں ناشتے کی غرض سے گئی تو فریج میں بریانی کے بڑے سے دیگچے کو دیکھ کر بولے بغیر نہ رہ سکی۔

''کیا فضول باتیں کر رہی ہو، میں نے اتنا پیسہ نادرا کو دینے کے لئے تھوڑا ہی لگایا ہے، بڑی آئیں مشورہ دینے والی۔ اتنی عمدہ بریانی ہے میں خود کھاؤں گی۔ مسز سارا اور مسز خان نے بھی اتنی تعریف کی تھی رات کو۔ حالانکہ وہ سڑیل سی عورتیں کہاں کسی کی تعریف کرتی ہیں لیکن بریانی کی تعریف کیے بنا نہ رہ سکیں۔ آج دن کو میں تو یہی کھاؤں گی اور دوسری بات کان کھول کر سن لو، خبردار جو میں نے تمہارے منہ سے نادرا کے ساتھ آنٹی کا لاحقہ سنا، مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا، ہاں کبھی۔ کام کاج کی ماسیوں کو آنٹی بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، ہمیں ایسے لوگوں سے رشتے لگانے کی کیا ضرورت بھلا۔ اس لئے خبردار جو دوبارہ نادرا کو آنٹی بولا تو۔ سیدھی طرح ماسی کہا کرو''۔ رخسانہ نے اپنا پسندیدہ مارننگ شو لگا کے بیز پسارے تو ماہ رخ منہ بنا کے رہ گئی۔

''یہ کیا مما! آپ بوائل رائس کے ساتھ دہی کھا رہی ہیں، بٹ آپ نے تو بولا تھا کہ بریانی کھائیں گی''۔ ماہ رخ نے ماں کو سادہ چاول سامنے رکھے دیکھا تو پوچھ بیٹھی۔

''ہاں کھانا تو دہی تھا مجھے لیکن پیٹ میں اتنا درد ہو رہا ہے تو سوچا کہ اس وقت سادہ سا ہی کچھ کھا لوں''۔ انہوں نے بے دلی سے چاول میں چمچ مارا۔

''تو مما! بریانی ماسی کو دے دیتیں ناں''۔ اس نے اپنی پرانی بات دہرائی۔

''ارے تم ماسی کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو، میں خود کھاؤں گی رات میں، تمہیں ماسی کی اتنی فکر کیوں ہو رہی ہے''۔ انہیں اب کی بار غصہ ہی آ گیا۔

''نہیں مما! میں تو بس اس لئے کہہ رہی تھی کہ وہ

بے چاری اتنا افورڈ نہیں کر سکتے تو ہم انہیں تھوڑی سی بریانی دے دیں، ماسی کے بچے بھی خوش ہو جائیں گے''۔ وہ منمنائی۔

''تم نے کھانی ہے تو کھاؤ ورنہ بریانی اور ماسی کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں، سمجھیں''۔ اب کی بار تو اسے جھڑک ہی دیا۔

''یہ کیا آج آپ جلدی آ گئے آفس سے؟'' رخسانہ نے گھڑی پر نظر دوڑائی جو سات بجا رہی تھی۔

''ہاں بیگم! آج سوچا کہ کیوں نہ باہر ڈنر کیا جائے، اس لئے جلدی آ گیا آفس سے۔ تم اور ماہ رخ جلدی سے تیار ہو جاؤ پھر چلتے ہیں''۔ وہ کہہ کر واش روم گھس گئے تو رخسانہ بھی اپنے لئے کپڑے نکالنے لگیں۔

☆.........☆.........☆

''مما! کدھر ہیں ماہ رخ بیٹا، ذرا انہیں میرے پاس بھیجو''۔ آج اتوار کی وجہ سے فہد اور ماہ رخ بھی گھر پر ہی تھے۔

''مما آپ کو پاپا بلا رہے ہیں، اس نے کچن میں آ کے فرمانبرداری سے پیغام پہنچایا۔

''پاپا کو بولو تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں، آج ذرا فریج کی تفصیلی صفائی کر رہی ہوں، کتنے دن ہو گئے فریج کی صفائی کیے ہوئے۔ تمہاری سالگرہ سے 2 دن پہلے کی تھی اور سالگرہ کے بعد بھی تقریباً 26-25 دن ہو گئے ہیں''۔ وہ خود ہی حساب لگاتے ہوئے فریج اور فریز سے برتن نکال کے کاؤنٹر پر رکھنے لگیں۔

''ارے یہ دیکھو ناں، پارٹی والی بریانی تو میں فریزر میں رکھ کے بھول ہی گئی تھی۔ اف خدایا کتنے مزے کی تھی لیکن ہماری قسمت میں نہ تھی۔ اف... اتنے دن پرانی نہ ہوتی تو میں ضرور کھا لیتی۔ چلو اب نادرا کے بچوں کے لئے دے دوں گی۔ پھینکنے سے بہتر ہے کہ کسی کے کام آ جائے، رزق کی بے حرمتی تو نہ کی جائے''۔ وہ خود ہی بڑبڑاتے ہوئے بریانی کا دیگچہ نادرا کے لئے علیحدہ سے رکھنے لگیں تو ماہ رخ نے عجیب سی نظروں سے ماں کو دیکھا۔

''مما اب تو بریانی بہت باسی ہو گئی ہے، ماسی کو مت دیں کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو جائے''۔ اسے اب نئی فکر ستانے لگی۔

''ارے ایسے کیسے طبیعت خراب ہو جائے گی، کوئی خراب تھوڑی ہوئی ہے، بس کچھ دن پرانی ہی تو ہے اور ویسے بھی ان غریب لوگوں کو ایسے ہی کھانے کھانے کی عادت ہوتی ہے، تم فکر مت کرو کچھ نہیں ہوتا۔ جاؤ جا کے پاپا سے پوچھو کہ کیا کام ہے''۔

☆.........☆.........☆

''ارے کمبخت نادرا! تمہیں تو اللہ پوچھے آج پھر چھٹی کر لی ہے، میں نے آج مشین لگوانی تھی، لیکن تم ہمیشہ ہی کام کے دن ہی چھٹی کرنا، حرام خور کہیں کی''۔ رخسانہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

''مما! میں نے آپ کو کل بولا بھی تھا کہ ماسی کو باسی بریانی مت دیں، مجھے لگتا ہے کہ ہیضہ وغیرہ ہو گیا ہوگا انہیں اسی لئے چھٹی کر لی ماسی نے''۔ ماہ رخ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''تم کیا ایک بات کو لے کر بیٹھ گئی ہو۔ کل بھی تمہیں بتایا تھا کہ ایسے لوگ سب ہضم کر لیتے ہیں، وہ محاورہ بھی تو ہے کہ لکڑ ہضم پتھر ہضم۔ اور بریانی کوئی خراب تھوڑی ہی تھی جو ہیضہ ہو جائے گا۔ ارے یہ تو حرام خوری کے بہانے ہیں۔ بجائے احسان ماننے کے کہ پیٹ بھرنے کے لئے کھانا دیا تو اور بھی دل سے کام کرتی، چھٹی کر کے بیٹھ گئی۔ آنے دو کل اسے میں نمٹ لوں گی اور اب کی بار تو سیدھا کر لوں گی اسے اور تم ایسے کیا سوچنے بیٹھ گئی ہو، آج چھٹی کی ہے اسکول سے تو آ کے میرے ساتھ کام کرو کچن میں''۔ اب کے انہوں نے رخ بیٹی کی طرف موڑا۔

''لگتا ہے آنٹی کا پیٹ خراب ہو گیا باسی بریانی سے، مما کو منع بھی کیا لیکن مما کہاں کسی کی سنتی ہیں''۔ وہ افسوس سے سوچتے کچن میں چلی آئی۔

☆.........☆.........☆

حنا اشرف

افسانہ

فیصلہ

کچھ لوگ بظاہر جیسے نظر آتے ہیں، ویسے ہوتے نہیں۔ انابیہ علی کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے۔ بقول اس کے میں بڑی سخت دل اور بے حس لڑکی ہوں، چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے کوئی فرق نہیں



پڑتا، بڑی سے بڑی بات میرے لیے معمولی ہوتی ہے۔

خود پرستی کا خول چڑھائے رہنے والی وہ انابیہ دراصل ایک نرم دل لڑکی ہے، جس پر دوسروں کی تکلیف کا اتنا ہی اثر ہوتا ہے کہ وہ خود کو پہروں کمرے میں بند کیے روتی رہتی ہے۔

بہت کم لوگوں سے دوستی کرنے والی مگر دوستوں پر جان تک قربان کرنے والی بیا، اپنی مما کی وفات کے بعد تو جیسے ہنسنا ہی بھول گئی تھی۔

''زندگی میں اس سے زیادہ تلخ اور کچھ نہیں، جو لوگ ہمیں جان سے بڑھ کر پیارے ہوتے ہیں۔ موت پہلے انہیں ہی ہم سے جدا کر دیتی ہے۔''

☆......☆

اس وقت وہ فائلوں میں سر کھپائے بیٹھی تھی جب بیل کی آواز پر ٹیلی فون کی سمت دیکھا، کام کے وقت وہ ہمیشہ اپنا سیل آف رکھتی تھی۔

''جی فرمائیں۔'' دوسری طرف اپنی عزیز از جان دوست ہانیہ کی آواز پر اسے اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

''ہانی! تم نے کیسے مجھے یاد کرلیا آج؟'' اس



نے شرارت سے کہا۔

''ایکسکیوز می انابیہ علی صاحبہ! ہمیشہ میں ہی آپ کو یاد کرتی ہوں اگر دماغ پر ذرا سا زور دے کر سوچیں تو...... پتہ نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جب میں نے آپ سے دوستی کے لیے کہا تھا۔'' ہانیہ کی مصنوعی خفگی سے کہنے پر وہ ہنس دی تھی۔

''تمہیں میری ذرا بھی پرواہ نہیں ہے مجال ہے جو کبھی میری بھی کوئی بات مانی ہو، ہمیشہ اپنی کرتی ہو۔'' دوسری طرف ہانیہ کا لیکچر شروع ہو چکا تھا۔ اس کی پیار بھری ڈانٹ ہمیشہ اسے اچھی لگتی تھی۔ کوئی تو ہے جسے اس کی بھی فکر ہے۔

''جناب! اگر آپ کا لیکچر ختم ہو گیا ہے تو عرض فرمائیں مجھ ناچیز کو کیسے یاد فرما لیا۔ میں ابھی تمہارے پاس آرہی ہوں، یقیناً تم اس وقت اکیڈمی کے معاملات سلجھانے میں لگی ہوئی ہو گی۔ مجھے یاد ہے رات میں نے تمہیں ٹیکسٹ کیا تھا۔ ہم آج شاپنگ کے لیے چلیں گے۔ شہزادی صاحبہ حیدرآباد تشریف لا چکی ہیں۔ یقیناً سیل اٹھانے کی زحمت تو ہرگز نہیں کی ہوگی۔ محترمہ کا سیل ابھی تک آف جو جا رہا ہے۔'' اس کے نان اسٹاپ بولنے پر انابیہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''اف لگتا ہے آج میری خیر نہیں جناب عالیہ آج بہت غصے میں ہیں۔'' اس کے کہنے پر دوسری طرف کال کاٹ دی گئی۔ لبوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ لیے اس نے ان دنوں کو یاد کیا جب اسے ہانیہ جیسی پیاری دوست ملی تھی۔

☆......☆

وہ ایک عام ساون تھا مگر اس کے لیے خاص بن گیا تھا گرمی کی شدت عروج پر تھی۔ جب انابیہ تپتی دوپہر کو پارک میں آکر بیٹھی تھی، یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اکیڈمی سے واپسی پر گھر سے نزدیکی پارک میں کچھ دیر آکر بیٹھتی، دن کے وقت وہاں کوئی نہ ہوتا، وہاں بیٹھے ابھی اسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی، جب ایک پیاری سی لڑکی اس کے ساتھ آکر بینچ پر بیٹھی۔

''ہائے آئی ایم ہانیہ اینڈ یو؟'' انابیہ کے ماتھے پر بل نمودار ہوئے اسے ہانیہ کی آمد ناگوار گزری تھی۔

''پلیز ڈونٹ ڈسٹرب می!'' اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

''کیا ہے یار! ڈسٹرب تو آپ نے مجھے کر دیا ہے۔ اتنی گرمی میں، میں یہاں اس پارک کو دیکھنے چلی آئی، سوچا تھا اس وقت کہاں کوئی ہوگا۔ خوب صورت مناظر کی پکس لوں گی مگر یہاں تو آپ جناب کو دیکھ کر حیرت ہوئی، پاگل صرف میں نہیں جو تپتی دوپہر کو یہاں چلی آئی، پاگل کوئی اور بھی ہے۔'' اس نے شرارت سے انابیہ کی طرف دیکھا۔

انابیہ کی نظر اندازی اور بے رخی سے اسے کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ اس کی چھوٹی بہن فریحہ ٹھیک اسے ڈھیٹ کہتی تھی جو ایک بار کچھ کرنے کی ٹھان لیتی کر کے رہتی۔ انابیہ اپنا بیگ اٹھا کر جانے لگی جب اسے ہانیہ کی آواز سنائی دی۔

''اس میں غصے والی کیا بات ہے۔ آپ مجھ سے دوستی کریں گی؟'' انابیہ نے چڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں انجان لوگوں سے دوستی نہیں کرتی۔'' یہ کہہ کر وہ گھر کی طرف چل دی۔ جب کہ وہ دیر تک وہاں بیٹھی مسکراتی رہی۔

''نئے مشن کی کامیابی کے لیے دعا کی درخواست۔'' میسج ٹائپ کر کے فریحہ کے نمبر پر سینڈ کرنے کے بعد وہ پکس بنانے میں مصروف ہو گئی۔

''ہانی کی بچی سدھر جاؤ۔'' فریحہ کے ریپلائی پر وہ اسے بعد میں ساری بات بتانے کا کہہ کر پھپھو کے گھر کی طرف جانے والے راستے پر چل دی۔''

ہانیہ اپنی پھپھو سے ملنے ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اپنی عادت سے مجبور کل جب اس نے ساتھ والوں کے گھر کا جائزہ لینا شروع کیا تو اس نے دیکھا بلیک کلر کے لباس میں ایک لڑکی وہاں پودوں کو پانی دے رہی تھی، ہانیہ نے نیچے زمین سے مٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اٹھا کر اس لڑکی کی طرف پھینک دیا۔ جو اسے لگنے کے بجائے اس کے پیر کے ساتھ جا گرا اس لڑکی نے ناگواری سے ادھر ادھر دیکھا۔ مگر کوئی نہ تھا پانی دے کر وہ اندر چلی گئی۔ اسے وہ لڑکی بہت پسند آئی تھی۔

آج اس نے اپنی کزن سے کہا کہ وہ کسی نزدیکی پارک جانا چاہتی ہے۔ دوپہر ہونے کی وجہ سے اس کی کزن نے اسے روکا تھا مگر نزدیکی نئے بننے والے پارک کا ایڈریس پوچھ کر وہ اکیلی ہی چلی آئی تھی۔ پارک میں اندر آتے ہوئے اس نے کل والی اس بلیک ڈریس والی لڑکی کو دیکھا جسے کل اس نے شرارت کا نشانہ بنایا تھا۔ اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ چلو مل کر دو چار باتیں ہو جائیں گی مگر انابیہ نے اسے سرے سے لفٹ ہی نہ کروائی نہ اس کی دوستی کی درخواست قبول کی۔

☆......☆

وہ ابھی اپنے لیے ناشتہ بنا کر صوفے پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ چوکیدار نے آ کر اسے ایک کارڈ تھمایا۔

''انابیہ باجی! یہ ساتھ والوں کے گھر سے ایک لڑکی نے آپ کو دینے کے لیے کہا ہے۔''

ہاتھ سے بنا ایک دلکش سا کارڈ تھا جہاں باہر کی طرف

''Only for angry girl''

لکھا ہوا تھا۔

ستارے مشعلیں لے کر مجھ کو ڈھونڈنے نکلیں
میں رستہ بھول جاؤں جنگل میں شام ہو جائے
اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے ہٹ کر چلتے ہیں جو رستہ عام ہو جائے

''خاص لوگوں سے دوستی کی خواہاں ہانیہ! جناب اب تو تعارف بھی کروا دیا ہے۔'' نیچے منہ چڑانے والی اسمائلی بنی ہوئی تھیں۔

انابیہ کو کل والی لڑکی یاد آئی اور چہرے پر خوش نما مسکراہٹ نمودار ہوئی، ناشتہ کرنے کے بعد وہ باہر آ کر بیٹھ گئی۔ موسم کافی اچھا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہاں بیٹھے ہوئے اسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ اچانک ایک چھوٹا سا پتھر بڑے زور کا اس کے سر پر آ لگا۔ اس نے کوفت سے سائیڈ پر دیکھا جہاں سے پتھر آیا تھا۔ ہانیہ ساتھ والوں کے ٹیرس پر سے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلا رہی تھی۔ یقیناً یہ اسی کا کارنامہ تھا۔

''مس غصے والی، کیا میں آپ کے گھر آ جاؤں؟'' اس نے اجازت چاہی اور اگلے پانچ منٹ میں وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں۔ ایسے جیسے صدیوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ بابا کام کے سلسلے میں دو تین دن کے لیے شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ باتوں کے دوران اچانک انابیہ نے اس سے پوچھا تھا۔

''آپ مجھ سے دوستی کیوں کرنا چاہتی تھیں۔''

تیرے سوا بھی کئی رنگ خوش نظر تھے مگر
جو تجھ کو دیکھ چکا ہو وہ اور کیا دیکھے

جواب اس نے شعر میں دیا تھا۔ دونوں ایک ساتھ ہنس دیں۔

رفتہ رفتہ دونوں کی گہری دوستی ہو گئی ہانیہ اپنی ہر بات انابیہ سے شیئر کرتی، مگر انابیہ بہت کم اس پر کھلتی، ہانیہ کو زبردستی باتیں اگلوانا آتا تھا، وہ جب بھی حیدرآباد پھپھو کی طرف آتی، زیادہ وقت انابیہ کے ساتھ رہتی تھی۔ اب جب دوستی ہوئی تھی پھپھو کی طرف آنا جانا بھی اس کا کچھ زیادہ ہو گیا تھا۔

سیل پر رابطہ تو تھا ہی مگر سامنے مل بیٹھنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔

☆......☆

شاپنگ کے بعد وہ ریسٹورنٹ میں آ بیٹھی تھیں۔

''آج کا مزیدار کھانا میری طرف سے، ہاں ادائیگی مگر مس انو کی طرف سے ہوگی۔'' مینو لکھانے کے بعد ہانیہ نے کہا تو انابیہ کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

''یار! اپنی سخاوت سنبھال کر رکھو کہیں اور کام آئے گی۔''

''بیا تمہیں معلوم ہے اس بار میں اتنی جلدی یہاں کیوں آئی ہوں؟'' ہانیہ کے اچانک سنجیدگی اختیار کرنے پر اس نے اسے دیکھا تھا۔

''مجھے بابا جانی نے یہاں تمہارے لیے بلایا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔ بابا کا کہا مان لو تم اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ بے جا ضد لے کر بیٹھی ہو تم۔ زندگی اکیلے نہیں گزرتی انو۔ بیٹیاں خوشبو ہوتی ہیں جنہیں صرف والدین کا ہی نہیں بلکہ سسرال کا گھر بھی مہکانا ہوتا ہے۔ کراچی اب اتنا دور بھی نہیں کہ تم بابا جانی سے ملنے نہ آسکو۔'' ہانیہ نے محبت سے اسے سمجھایا۔

''ہانی! فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے میں بابا جانی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ان سے دور رہوں تو ڈر لگتا ہے۔ جب وہ شہر سے باہر جاتے ہیں میں ساری رات جاگ کر گزارتی ہوں، مما کے جانے کے بعد جس طرح انہوں نے مجھے سنبھالا ہے یہ وہی جانتے ہیں۔ ان کا کہا میرے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے مگر انہیں اکیلے چھوڑ کر جانا...... امپاسبل، میں یہ نہیں کر سکتی۔'' دوسری طرف رخ موڑے اس نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے۔

''بابا کی طبیعت اب خراب رہتی ہے انو! وہ تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں تم اگر ان کا کہنا مان لو تو بہتر ہے۔ اب تو نکاح کو بھی بہت سال ہو چکے، آنٹی کا رخصتی کے لیے اصرار اب بڑھتا جارہا ہے۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے نفع ونقصان کا سوچ لو، آنٹی فاطمہ کو لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں آخر ان کا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ لوگ تو ایسی فیملی کی خواہش کرتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر بابا کو کچھ ہو گیا تو پھر تم کیا کرو گی۔ اکیلے زندگی گزارنا بہت مشکل ہے انابیہ! آنٹی لوگ بہت اچھے ہیں تم نے ان کے سامنے انکار کیا تھا مگر پھر بھی وہ بار بار بات کرتی ہیں۔ بے جا ضد چھوڑ دو۔ اللہ پاک پر بھروسہ رکھو، انشاء اللہ سب اچھا ہوگا۔'' ہانیہ نے اس کے دونوں ہاتھ محبت سے تھام لیے تھے۔

☆......☆

''بعض اوقات ہم فیصلہ کرتے ہوئے پرسکون نہیں ہوتے۔ ہم کنفیوز ہو جاتے ہیں کہ یہ فیصلہ درست ہے یا نہیں مگر پھر کسی بہت اپنے کا مشورہ ہمیں درست فیصلہ کرنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔''

''پرخلوص دوست کسی نعمت سے کم نہیں ہوتے۔'' وہ جو ایک غلط فیصلہ کرنے جارہی تھی۔ ہانیہ نے کتنی محبت اور خلوص سے اسے سمجھایا تھا، اس کی کہی ہر بات سو فیصد درست تھی، زندگی تنہا نہیں گزرتی، بعض اوقات ہمیں ایسے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ جن پر دل ودماغ آمادہ نہیں ہوتے مگر وہی کام ہمارے لیے نفع بخش ہوتا ہے، بروقت صحیح فیصلہ کرنے پر بابا جانی بھی اس کی فکر سے آزاد ہو جاتے، اس نے اللہ کا شکر ادا کیا وہ غلط فیصلہ کرنے سے بچ گئی تھی۔ پلکیں موندھے اس نے سر تکیے پر ٹکا دیا تھا۔

☆......

ثناء ناز

افسانہ

محبت فاتح عالم



شام کی چادر دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ سورج دن بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد اس وقت تھکن اتارنے کی تیاریوں میں مگن تھا، ہوا میں ہلکی سی خوشگوار خنکی تھی اور چاند ہر سو اپنی ٹھنڈی چاندنی بکھیرنے کو بے قرار ہو رہا تھا۔ جب وہ دنیا جہان سے بے خبر شانِ بے نیازی سے چلتے ہوئے کانوں میں ہینڈ فری ٹھونسے منہ ہی منہ میں گنگناتے ہوئے اپنے اور دانیہ کے مشترکہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کمر تک آتے براؤن سلکی بال سلور کیچر میں مقید تھے جب کہ کچھ آزاد شرارتی لٹیں اس کے شفاف چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ بلیو جینز اور نیوی بلیو ٹاپ میں اس کا نازک سراپا بے حد دلکش لگ رہا تھا۔ بیش قیمت ہینڈ بیگ اور ہاتھ میں پکڑا فولڈر بیڈ پر اچھالتے ہوئے وہ صوفے پر ڈھے سی گئی اور تھکے ماندے انداز میں اپنے دودھیا پاؤں خوب صورت موتیوں سے جڑی سلور سینڈل سے آزاد کروانے لگ گئی۔

''ریمل! کہاں رہ گئی تھیں تم، کم سے کم آج تو جلدی گھر آتی تمہیں بتایا بھی تھا خالہ بیگم آرہی ہیں۔'' دانیہ، ریمل کی لاپروائی پر جھنجلاتے ہوئے بولی تھی۔

''سو واٹ میں کیا کروں تمہاری ساس ہیں تم جانو اور تمہارا کام۔ اب میں روز ہرایرے غیرے کی آمد پر کلاسز تو آف کرنے سے رہی۔ تم جانتی ہو نا میرا فائنل ایئر چل رہا ہے۔ پروجیکٹ، اسائنمنٹس سے جان نہیں چھوٹتی اور تم مجھے نئے حکم جاری کردیا کرو۔'' اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

''میری ساس تمہاری بھی کچھ لگتی ہیں، کچھ تو ہوش کے ناخن لو بڑے چھوٹے کا لحاظ ہی نہیں رہا تمہیں۔''

وہ دانیہ کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کانوں میں ہیڈ فون لگائے اپنے فیورٹ میوزک کو انجوائے کرتی رہی۔

''ریمل! میں تم سے بات کر رہی ہوں۔'' دانیہ نے کشن اٹھا کر ریمل کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

''کیا مصیبت ہے یار؟'' وہ پل بھر میں بھڑک اٹھی تھی۔

''خالہ بیگم آرہی ہیں اٹھو اور اپنا حلیہ درست کرو۔'' اب کی بار دانیہ نے قدرے نرم لہجے میں کہا تھا۔

''ٹھیک تو ہے میرا حلیہ اب اور کتنا ٹھیک کروں۔'' ایک نظر خود پر ڈالنے کے بعد وہ کندھے اچکاتے ہوئے میسیج ٹائپ کرنے میں محو ہوگئی۔

''خالہ ہشام اور تمہاری شادی کی بات پکی کرنے آرہی ہیں۔''

''کیا کہا میری شادی کی بات، وہ بھی ہشام سے دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا جو یوں بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔'' دانیہ کی بات سن کر ریمل یوں اچھلی جیسے اسے 440 کا کرنٹ چھو کر گزر رہا ہو۔

''میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔ تم اپنا دماغ جتنی جلدی ٹھیک کرسکتی ہو کرلو۔ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔'' دانیہ نے تنک کر کہا۔

''دیکھو دانی! اگر تم مذاق کر رہی ہو تو میری بات کان کھول کر سن لو ایسے تھرڈ کلاس اور گھٹیا مذاق بالکل پسند نہیں ہیں۔'' ریمل اسے خبردار کرتے ہوئے بولی تھی۔

''میں مذاق کیوں کروں گی مجھے خود امی نے بتایا ہے۔ ابو کی طرف سے بھی ہاں ہے۔ ہشام بھائی اور خالہ جان کو تو نہ پہلے کبھی اعتراض تھا اور نہ اب ہے اور تو اور دادا جان تو خوشی سے پھولے نہیں سمار ہے بلکہ ان کا کہنا ہے یہ تو اللہ کا خاص احسان ہے ہم پر ورنہ ہشام جیسا ہیرا تو چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہ ملے ہماری ریمل کے لیے۔ ویسے کہہ تو وہ بھی ٹھیک رہے ہیں ہشام ہے ہی ہر لحاظ سے قابلِ رشک سچی ریمل تم دونوں کی جوڑی چاند سورج کی جوڑی لگے گی۔ خبردار جواب تم نے کوئی ہنگامہ برپا کر کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کی۔'' دانیہ، ریمل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر محبت بھرے لہجے میں نان اسٹاپ بولتی چلی گئی۔

''یوسلی وہ امریکن بندر اب وہ جچے گا میرے ساتھ، دماغ تو تمہارا پہلے ہی خراب تھا اب لگتا ہے تمہاری نظر بھی کمزور ہو گئی ہے۔ جاؤ جا کر کسی ماہر آشوب کو چیک کرداؤ۔ بلکہ اس سے پہلے ذرا ای کے پاس جاؤ اور کہہ دو ان سے مجھے نہیں کرنی کسی سے شادی۔ اگر انہوں نے زبردستی کی تو میں......''

''اسٹاپ اٹ ریمل۔'' دانیہ نے بات کاٹی تھی۔

''آج نہیں تو کل تمہاری شادی کرنی ہے۔ ہمیں اب ساری زندگی تمہیں گھر میں بٹھا کر تو نہیں رکھ سکتے۔ بچی نہیں ہو تم جو ایک ہی بات تمہیں بار بار سمجھائی جائے۔'' وہ ایک دم متفکر سی ہو گئی۔

''دانیہ! میں نے یہ کب کہا کہ مجھے شادی نہیں کرنی میں تو بس اتنا کہہ رہی ہوں مجھے ہشام سے شادی نہیں کرنی۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی تھی۔

''کیوں کیا کمی ہے ہشام میں تعلیم یافتہ ہے ماشاء اللہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوب سیرت بھی ہے ویل سیٹل ہے اور سب سے بڑھ کر وہ تمہیں بچپن سے چاہتا ہے۔ اب اور کیا چاہیے تمہیں عیش کرو گی، جتنی اچھی خالہ ہیں ہماری ماما ہمیشہ کہتی تھیں خالہ جیسی ساس کسی قسمت والی کو ملے گی اور وہ بالکل ٹھیک کہتی تھیں خالہ جیسی اچھی ساس کوئی اور دنیا میں ہو ہی نہیں سکتی۔'' دانیہ بڑی بہن ہونے کا فرض بخوبی نبھا رہی تھی۔

''دیکھو ریمل! زندگی میں ہمیشہ وہی نہیں ملتا جو ہم نے مانگا یا سوچا ہوتا ہے، کبھی کبھی ہمیں دوسروں کی خوشیوں کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ دوسروں کی خواہشات کے لیے کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ یہ جو زندگی ہے نا محض اپنی خواہشوں کے حصول کی خاطر نہیں گزاری جا سکتی، جب خاندان کے سبھی افراد کی یہی خواہش ہے تو پلیز تم ان کی خوشیوں کا پاس رکھ لو اللہ کے حکم سے تمہیں کبھی مایوسی نہیں ہو گی۔ اب چپ چاپ اٹھو اور تیار ہو کر فوراً نیچے آؤ خالہ بیگم بس پہنچنے والی ہوں گی میں ذرا کچن میں جا کر انتظامات سنبھال لوں۔''

''اف حد ہے یار!'' وہ غصے سے اسمارٹ فون صوفے پر پٹختے ہوئے چینجنگ روم میں گھس گئی۔

کہنے کو تو دانیہ اور ریمل جڑواں بہنیں تھیں مگر شکلوں کے ساتھ ساتھ ان کی عادتوں میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا۔ ریمل ہو بہو ماں کا پرتو تھی۔ پشت تک آتے لمبے سنہری بال گندم کے خوشوں کی مانند چمکتی ہوئی دلکش سنہری رنگت، سنہری آنکھیں جن میں زمانے بھر کا خمار چھلکتا تھا۔ کچھ وہ قدرتی خوب صورت تھی کچھ جب نک سک سے تیار ہوتی تو اس کی پروقار شخصیت ہر دیکھنے والے کے دل میں خود بخود گھر کر جاتی۔ اس کے برعکس دانیہ کے نین نقوش فاروقی صاحب (ابو) سے ملتے جلتے تھے۔ خاص کر چمکدار سیاہ آنکھیں اس کی ذہانت کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ کسی بھی چیز کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت اس میں ریمل سے کہیں زیادہ تھی جب کہ ریمل عادتاً جذباتی اور ضد کی انا پرست لڑکی تھی۔

دانیہ اور ریمل جیسے ہی گریجویشن کر کے فارغ ہوئیں خالہ بیگم نے جھٹ پٹ اپنے دونوں لڑکوں سانول اور ہشام کے لیے ان کا ہاتھ مانگ لیا۔ ریمل نے ہائر اسٹڈی کی آڑ لے کر شادی سے انکار کر دیا جب کہ دانیہ نے ماں باپ کے فیصلے کو بخوشی قبول کر لیا۔ دانیہ کی شادی کے بعد گھر کی ذمہ داری مکمل طور پر ریمل کے نازک کندھوں پر آ پڑی تھی۔ جسے وہ مجبوراً کسی نہ کسی طرح نبھا رہی تھی۔

☆......☆

''ہشام صاحب! آخر مسئلہ کیا ہے۔ آپ کے ساتھ کیا سمجھتے ہیں آپ میرے ہاتھ میں اپنے نام کی انگوٹھی پہنا دیں گے اور میں چپ چاپ اپنا آپ مکمل طور پر آپ کو سونپ دوں گی۔ داسی بن کر ساری زندگی آپ کی پوجا کروں گی۔ ایک بات میری آپ کان کھول کر سن لیں نہ تو میں آپ سے شادی کروں گی

اور نہ ہی مجھے کوئی شوق ہے آپ سے کسی بھی قسم کا رشتہ استوار رکھنے کا آئندہ پلیز میرے راستے میں مت آیئے گا ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" اب کی بار اس نے بھی کسی قسم کا لحاظ نہ رکھنے کا تہیہ کرلیا تھا۔

ہشام، خالہ بیگم کے کہنے پر ریمل کے ساتھ انگیجمنٹ کی شاپنگ کرنے آیا تھا۔ گھر میں تو وہ بھی مردتا سب کے سامنے چپ رہی اور دل ہی دل میں جلتی کڑھتی ان کے ساتھ چل دی مگر شاپنگ مال میں انٹر ہوتے ہی اس نے اپنے دل کا غبار نکالنے میں ایک سیکنڈ نہیں لگایا۔ ریمل کی بات سن کر جہاں ہشام سکتے میں آیا تھا وہیں دانیہ کے چہرے پر بھی ندامت اور پریشانی کے آثار پھیلے تھے۔

"ریمل! تم حد سے بڑھ رہی ہو آخر برائی کیا ہے ہشام میں؟" دانیہ اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے ہشام سے دور لائی تھی۔

"دانی ان سے کہو مجھ سے شادی کا خیال دل سے نکال دیں۔ مجھے ان سے شادی نہیں کرنی کیونکہ نہ یہ میرے آئیڈیل ہیں اور نہ ہی سول میٹ، انہیں میرے کپڑوں سے چڑ ہے، انہیں میری کمپنی پر اعتراض ہے۔ یہ مشرق ہے تو میں مغرب، ہمارا گزارا ایک ساتھ ناممکن ہے اور میرے خیال میں جن رشتوں کے بعد میں ٹوٹنے کا خدشہ ہو ان رشتوں کی بنیاد سرے سے رکھنی ہی نہیں چاہیے اور پھر یہاں تو ساری بات ہی دل کی ہے۔ جب دل ہی راضی نہ ہو تو ویل کا ساتھ نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ شادی تو پھر تاحیات کا بندھن ہے۔" بالآخر وہ دل میں پلنے والے سبھی خدشات کو زبان دیتے ہوئے روہانسی ہو کر بولی تھی۔

"واٹ کیا کہا تم نے؟" دانیہ ناسمجھی کے عالم میں اسے تکتی جارہی تھی۔

"ریمل تم...... تم پڑھی لکھی ہو کر بھی ایسی احمقانہ سوچ رکھتی ہو تف ہے تم پر۔"

"اب ساری زندگی تمہیں تمہارے مسٹر سول میٹ نہ ملے تو کیا یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی رہو گی۔ کچھ تو ہوش کے ناخن لو لڑکی۔" ریمل کی اس قدر بچگانہ سوچ پر دانیہ کا دل چاہا کہ وہ اپنا سر پیٹ لے۔

"میرا یقین ہے دانی! ایک دن مجھے وہ ضرور ملے گا جو بن کہے میری ہر خواہش جان لے گا، جسے کبھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہوگی جو میری آنکھوں میں دیکھے گا اور میرے دل کے سبھی راز پڑھتا چلا جائے گا۔" ریمل کسی بات کے زیر اثر پختہ لہجے میں بولی تھی۔

"ہشام اپنی محبت کی تذلیل پر دل برداشتہ تو بہت تھا پر ضبط کے گھونٹ پی کر ان کے قریب چلا آیا۔

"بھابی! ان سے کہیں انہیں میری وجہ سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ویسا ہی ہوگا جیسا یہ چاہیں گی ان کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ ویسے بھی جہاں دل ہی راضی نہ ہو وہاں زبردستی کے رشتوں کا کوئی مول نہیں ہوتا۔" اپنی بات مکمل کرنے کے بعد وہ رکا نہیں بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا شاپنگ مال سے باہر نکل گیا اور دانیہ ریمل کی ہٹ دھرمی پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

☆......☆

"کل خالہ بیگم آئی تھیں ہشام کا رشتہ لے کر۔" ریمل بجھے بجھے لہجے میں سامنے بیٹھے علی کو گزشتہ شام کی سرگزشت سنا رہی تھی۔ اس وقت وہ دونوں کیفے ٹیریا میں بیٹھے باہر برستی بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

"تو تم نے ہاں کردی۔" علی ازلی لاپرواہی چہرے پر سجائے کافی کا سپ لیتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"میں ہاں کیسے کرتی؟" وہ الٹا دست سوال ہوئی۔

"کیوں بھئی ہشام اچھا لڑکا ہے، امریکہ میں رہتا ہے اور تمہیں کیا چاہیے تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو بنا سوچے سمجھے فوراً ہاں کردیتی۔" وہ اب چکن پیٹز کے ساتھ بھرپور انصاف کرنے میں مگن تھا۔ جب کہ ریمل نم آنکھوں کے ساتھ اس کے دھندلے پڑتے

چہرے کو پڑھنے کی ناکام کوشش کرتی رہی۔ جہاں ابھی تک کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔

علی اور ریمل کا شمار یونیورسٹی کے ٹاپ ٹین اسٹوڈنٹس ہوتا تھا۔ ان کی پہلی ملاقات دو سال پہلے ہونے والے ایک کوئز کمپیٹیشن میں ہوئی تھی۔ دونوں ممبران کو اپنے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی نمائندگی کرنا تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سرسری سی ملاقات دوستی میں کب بدلی، وہ خود بھی نہیں جانتے تھے۔ شاید اس دوستی میں سب سے بڑا ہاتھ ان کی ذہنی ہم آہنگی کا تھا۔

''ایکسکیوزمی Can I sit here?'' وہ لائبریری میں بیٹھی کچھ کتابوں کا مطالعہ کرنے میں مگن تھی کہ علی کے اس طرح اچانک مخاطب کرنے پر اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔

''شیور۔'' وہ پروقار لہجے میں کہہ کر دوبارہ ارد گرد بکھری کتابوں کے ڈھیر پر جھک گئی۔

''مکینکس میں علی ہوں مکینیکل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ سے۔'' وہ شائستگی سے اپنا تعارف کروا رہا تھا۔

''تو......؟'' ریمل نے سر اٹھائے بغیر بے زاری سے جواب دیا۔

''پرسوں اسلام آباد میں آل پاکستان یونیورسٹی ایکسپو ہے۔ ہماری یونیورسٹی کی ڈیبیٹنگ سوسائٹی نے اس ایونٹ میں شرکت کے لیے آپ کا اور میرا نام نامزد کروا دیا ہے، سو میرے ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹس کی طرف سے یہ آرڈر تھا کہ میں آپ سے مل لوں اور اس کمپیٹیشن کے بارے میں ڈسکس کر لوں۔'' وہ اپنی پوزیشن کلیئر کرتے ہوئے تیز تیز بولا تھا۔

''اوہ......! میں ریمل ہوں سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ سے۔'' اب کی بار اس کا لہجہ قدرے نارمل تھا۔

''ریمل...... تم اسٹارز پر یقین رکھتی ہو؟''

وہ کمپیٹیشن کے لیے کمبائن اسٹڈی کر رہے تھے کہ اچانک موڈ خوشگوار کرنے کے لیے علی نے سوالات کا سلسلہ جوڑ لیا۔

''انجوائے منٹ کے لیے لیکن پریکٹیکلی نہیں۔'' وہ سرسری سا جواب دے کر دوبارہ نوٹس بنانے میں مصروف ہو گئی۔

''تمہارا اسٹار کون سا ہے؟''

''لیبرا۔''

''اوہ رئیلی میرا اسٹار بھی لیبرا ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

''اور ڈیٹ آف برتھ؟''

''18 اکتوبر۔''

''دات تم یقین نہیں کرو گی پر میری ڈیٹ آف برتھ بھی یہی ہے۔'' وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات لیے اچھلا تھا۔ اس کے بعد تو گویا ان کے لیے ایک نیا کھیل شروع ہو گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو زیادہ سے زیادہ جان لینا چاہتے تھے۔ علی، ریمل سے ایک کے بعد ایک سوال پوچھتا اور ہر سوال کا جواب خود میں بھی موجود پاتا، اب اسے اپنی اور ریمل کی ذہنی ہم آہنگی کی وجہ سمجھ آنے لگی تھی۔

علی کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے تھا۔ وہ اکلوتا تھا باپ کی وفات کے بعد ساری ذمہ داری اس کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔ کلاسز اٹینڈ کرنے کے بعد وہ رات گئے تک ہوم ٹیوشنز دیا کرتا تھا۔ یوں اس کی زندگی کا پہیہ کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا۔ جب حالات گردش میں آ جائیں تو انسان صبر کے بجائے اونچی اڑان اڑنے کی کوشش میں ہلکان ہوا پھرتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت علی کی تھی۔ وہ راتوں رات امیر ہونے کے خواب بنایا کرتا تھا۔ ماسٹر مائنڈ تو وہ تھا ہی اس کے ذہن میں آنے والے وقت کو لے کر پوری پلاننگ موجود تھی۔

☆......☆

ریمل اور علی کا زیادہ تر وقت ایک ساتھ گزرتا تھا۔ دونوں کی پسند ناپسند تقریباً ایک جیسی تھی۔ دونوں کی عادتوں میں بھی زیادہ فرق نہ تھا۔ دونوں بولنے پر آتے تو گھنٹوں باتیں کرتے رہتے، کبھی چپ بیٹھتے تو

ان کے درمیان مکمل خاموشی کا راج ہوتا، دونوں کئی کئی گھنٹے ساتھ گزارتے، ملکی، غیر ملکی نصابی غیر نصابی ہر طرح کے موضوعات پر ڈسکس کرتے۔ ریمل کو علی کی شکل میں اپنی تصوراتی دنیا کا آئیڈیل مل چکا تھا۔ وہ اپنے دل میں قید جذبوں کو علی پر عیاں کرنا چاہتی تھی مگر حیا تھی کہ ہر بار آڑے آجاتی تھی۔ وہ زمانے کے لیے لاکھ بولڈ سہی مگر اندر سے تھی تو ایک لڑکی حیا کے رنگوں میں ڈھکی چھپی شرم وحیا کا لاجواب پیکر، علی کے سامنے آتے ہی اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔ الفاظ خود بخود ساتھ دینا بھول جاتے تھے۔

آج وہ دونوں بڑی مدت کے بعد اپنے فیورٹ ریسٹورنٹ میں اکٹھے تھے۔

''تو پھر کیا سوچا تم نے؟'' ویٹر کو آرڈر لکھوا کر علی نے موبائل ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کس بارے میں؟'' وہ الجھی ہوئی نگاہوں سے اس کی جانب تکنے لگی۔

''آف کورس یار ہشام کے بارے میں۔'' وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔

''بتایا تو تھا میں نے نا کردی۔''

''مگر کیوں؟'' وہ واقعی انجان تھا یا پھر جان بوجھ کر اس کے ضبط کا امتحان لے رہا تھا۔

''تم اپنے گھر والوں سے بات کب کرو گے۔'' ریمل مہارت سے بات بدلتے ہوئے بولی تھی۔

''کس بارے میں؟'' وہی ازلی لاپرواہی وہی پرسکون تاثر وہ کچھ اندازہ نہ لگا پائی۔

''بھئی ہماری شادی کے بارے میں اور کس بارے میں۔'' آج وہ جیسے ہر بات کرنے کا تہیہ کر آئی تھی۔

''واٹ......!'' پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔

ریسٹورنٹ میں موجود لوگوں نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا پھر واپس اپنی اپنی دنیا میں مگن ہو گئے۔

''میں نے یہ کب کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' ریمل کی بات سن کر وہ ایک دم چونکا تھا۔

''دیکھو ریمل! میری بات تسلی سے سنو تم کردار کی مضبوط اور بلا کی ذہین لڑکی ہو، ہر کوئی تمہیں پا کر فخر کرے گا مگر مجھے معاف کرنا وہ کوئی میں کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے تمہیں ہمیشہ دوست کی نظر سے دیکھا ہے۔ پھر تم نے یہ سوچ بھی کیسے لیا میں اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجوں گا؟''

باہر برستی بارش کا شور ریمل کے دل میں کہرام مچا رہا تھا۔ کتنے لمحے وہ پلکیں جھپکے بنا سامنے بیٹھے بے حس پتھر دل انسان کو نم آنکھوں سے تکتی رہی۔ اسے جیسے اپنی سماعتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

ذرا سی دلچسپی ذرا سی توجہ جانے کیوں ہمیں اس وہم میں مبتلا کر دیتی ہے کہ فریق ثانی کو بھی آپ سے اتنی ہی محبت، اتنی ہی چاہت ہے جتنی کہ آپ کو اس شخص سے وہ بھی آپ کے لیے اتنا ہی بے قرار ہے جتنا کہ آپ خود اس شخص کے لیے مگر یہ جو محبت ہوتی ہے نا اسے محض وہمات کی بنا پر نہیں جیتا جا سکتا۔

''پر تم تو کہتے تھے میں تمہارا سہارا ہوں اور یہ بھی میں نہیں ہوتی تو تم ہمت ہارنے لگتے ہو۔ تمہارے ہی کہے گئے الفاظ ہیں نا یہ؟'' وہ ٹھکرائے گئے دل کی تسکین کی خاطر جانے کس بنا پر پھر سے تصدیق کر رہی تھی۔

''اوہ کم آن ریمل! کیا ہو گیا ہے تمہیں ہم اچھے دوست ہیں اور اس دوستی کی بیس پر میں اب بھی تمہیں یہی کہوں گا تم نے ہر موڑ پر میرا ساتھ نبھایا ہے، تم میرے لیے بہت خاص ہو اور ہمیشہ رہو گی لیکن تم میں وہ سب نہیں ہے جو میں اپنی لائف پارٹنر میں دیکھنا چاہتا ہوں، میں سمجھ نہیں پا رہا تم میرے بارے میں ایسا کیسے سوچ سکتی ہو۔ مجھے یقین نہیں آرہا سب جاننے کے باوجود بھی کہ میں بچپن سے اپنی کزن سے منسوب ہوں تم ایسا خیال دل میں لا کیسے سکتی ہو۔'' وہ اسے کچھ جتاتے ہوئے خفگی سے بولتا جا رہا تھا۔

''ہم سول میٹ ہیں علی! ہم چاہیں تو لائف میں بہت اچھی طرح ایڈجسٹ کر سکتے ہیں۔'' ریمل ایک بار پھر سول میٹ پر اڑ گئی تھی۔

''کن خوش فہمیوں میں رہتی ہو بی بی، یہ دنیا ہے، حقیقی دنیا کسی آئیڈیل پرسن کا انتظار کرو گی تو پھپھو جان کی طرح بیٹھی رہو گی۔ پوری زندگی بیت جائے گی مگر ہاتھ کچھ نہیں آئے گا سوائے پچھتاوے کے۔'' دانیہ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگی۔

''کتنا سچ کہتی تھی وہ لڑکی ایکسکیوز می مس ریمل سول میٹ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے تم میری آئیڈیل تو نہیں ہو نا۔'' تمسخر سے کہتا ہوا وہ ریمل کے جذبات کا مذاق اڑاتا چلا گیا۔ مزید بیٹھنا بے کار تھا۔ وہ اشک برساتی دھندلی آنکھوں کے ساتھ اندھا دھند بھاگتی ہوئی ریسٹورنٹ سے باہر آئی۔ باہر برستے بادل لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کر رہے تھے۔ دل جیسے غم کے مارے بیٹھنے کو بے قرار تھا۔ وہ ہوش و حواس سے عاری بیگانگی کے عالم میں یونہی سڑک کے کنارے چلتی رہی۔

''میں نے ایسا کب کہا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' آنسوؤں نے ایک بار پھر شدت اختیار کی تھی۔

''تم میں وہ سب نہیں ہے جو میں اپنی لائف پارٹنر میں دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ ہچکیاں بھرتی وہیں سڑک کے کنارے پر پڑے بینچ پر ڈھے گئی۔

''ایکسکیوز می مس ریمل! سول میٹ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے تم میری آئیڈیل تو نہیں ہو نا......'' علی کے الفاظ مسلسل اس کے کانوں میں سیسہ انڈیل رہے تھے۔ احساسات کی اس قدر تذلیل کیے جانے پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ یہ جانے بغیر کہ اس وقت وہ ایک پبلک پیلس پر بیٹھی لوگوں کی سوالیہ نگاہوں کا نشانہ بن رہی ہے۔

کہتے ہیں محبت جب وار کرتی ہے تو انسان کو ہر شے سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ کچھ ایسی ہی بے خودی کی کیفیت اس وقت ریمل کی بھی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی گہرے اذیت ناک ذہنی صدمے سے گزر رہی ہو۔ اچانک ایک بلیک مرسڈیز اس کے پاس آ کر رکی۔ ہشام جو خراب موسم کے پیش نظر خالہ جان کی ہدایت پر ریمل کو پک کرنے یونیورسٹی جا رہا تھا۔ اسے ایسی حالت میں بیچ سڑک پر روتا دیکھ کر تڑپ سا اٹھا، زرد پتوں کے بیچ زرد چہرہ لیے برستی بارش میں تنہا بیٹھی وہ اس اداس شام کا اجڑا ہوا منظر لگ رہی تھی۔ وہ کچھ بے قراری اور کچھ اضطراری کیفیت میں تقریباً دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچا جو بارش میں مسلسل بیٹھے رہنے کی وجہ سے تھر تھر کانپے جا رہی تھی۔

''ریمل تم ٹھیک تو ہو نا؟'' ہشام نے تیزی سے اپنا اوورکوٹ اتار کر ریمل کے گرد پھیلایا۔ ریمل نے الجھی ہوئی نگاہوں سے ایک نظر اس کے چہرے کی جانب دیکھا اور پھر اپنے حواسوں پر قابو نہ رکھتی ہوئی وہیں اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

ریمل کی اجڑی حالت اور سرخی مائل آنکھیں دیکھ کر ہشام بخوبی جان گیا تھا کہ وہ ایک بہت بڑی شکست کا سامنا کر کے لوٹی ہے اور کیسے نہ جانتا ایک عرصہ وہ بھی بہار رت کے لیے ترسا تھا۔ ایک عرصہ اس پر بھی خزاں کی آمد رہی تھی۔ ایک عرصہ یہ ٹوٹے ہوئے زرد پتے اس کے بھی ہمراز رہ چکے تھے جنہیں وہ روز اپنے دل کی روداد سنایا کرتا تھا۔ پر آج یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے محبت کی راہ گزر پھولوں سے سجنے والی ہو۔ جیسے زندگی کی سبھی مسافتیں یک دم ختم سی ہو گئی ہوں۔

ریمل کو بحفاظت گھر ڈراپ کرنے کے بعد وہ مطمئن سا ہو کر آگے کی جانب بڑھ گیا۔ اسے واپس لوٹنا تھا اپنی متاعِ حیات کو ہمیشہ کے لیے لے جانے کے لیے۔ ''محبت فاتح عالم'' کسی نے ہولے سے اس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی اور جواباً وہ ڈھیر سے مسکرا دیا۔ اداس زرد پتوں کا موسم ڈھل چکا تھا۔

آگے کا راستہ بہت حسین تھا۔ کیونکہ محبت کے گیت گاتے، پھول اور ملن کی سرگوشیاں کرتے شوخ پتے اس کے منتظر جو تھے۔

☆......☆

آج یونیورسٹی میں اس کا آخری دن تھا۔ وہ جلدی جلدی تھیسز رپورٹ کروا کر اتھل پتھل کرتے دل کو سنبھالتے ہوئے پارکنگ ایریا تک پہنچی جہاں خوشیاں بانہیں پھیلائے بے تابی سے اس کی منتظر تھیں۔ پچھلے ہفتے خالہ بیگم اسے ہشام کے نام کی ایک نفیس سی رنگ پہنا گئی تھیں۔ بے درد ماضی کو ایک بھیانک خواب سمجھ کر وہ کب کا فراموش کر چکی تھی۔ بظاہر وہ اس رشتے سے بہت خوش تھی۔ دماغ سے آئیڈیلزم کا بھوت اترا تو ہشام اپنی تمام تر اچھائیوں کے ساتھ اس کے دل میں آن بسے۔ جیسے جیسے شادی کے دن قریب آتے جا رہے تھے اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہشام کی تذلیل کو لے کر طرح طرح کے خدشات اس کے ذہن و دل پر دستک دے رہے تھے۔ اب اس میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ وہ ڈائریکٹ ہشام سے بات کرتی اس سے اپنی نادانیوں کی معافی مانگتی۔ بالآخر کافی سوچ بچار کے بعد اس نے ہشام کو میسج کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ لینڈ لائن اسکرین پر چمکتے ہشام کے نمبر نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف مرکوز کر لی۔ بمشکل دل کو سنبھالا اور لیس کا بٹن دباتے ہوئے ریسیور کان سے لگایا۔

''السلام علیکم، کیسی ہیں آپ؟'' ریسیور میں سے ہشام کی شوخ آواز ابھری تھی۔

''وعلیکم السلام میں ریمل بات کر رہی ہوں۔'' دوسری جانب مکمل طور پر خاموشی چھا گئی۔

''ہشام مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔'' ریمل نے ڈری سہمی آواز میں خاموشی کا تسلسل توڑا۔

''جی کہیے۔'' مودبانہ انداز میں کہا گیا۔ وہ سب الفاظ جو اس نے ہشام کو کہنے کے لیے سوچ رکھے تھے یک دم دماغ کی سلیٹ سے مٹنے لگے۔

''وہ مجھے...... ہشام......'' زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ پچھتاوے اور ندامت کے کئی ملے جلے آنسو اس کے سفید پڑتے گالوں پر آر کے تھے۔

''ریمل! پہلے رونا بند کریں۔'' وہ بے آواز روئی تھی مگر ہشام جان چکا تھا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا میں رو رہی ہوں؟'' وہ نم لہجے میں پوچھنے لگی۔

''ریمل صاحبہ! جو دل میں بستے ہیں ان کی تو سانس بھی سات سمندر پار سنائی دیتی ہے آپ تو پھر میری ذات کا ایک حصہ ہیں۔ ابھی آپ مجھ سے معافی مانگنے والی تھیں تو جناب آپ کو آگاہ کرتے جائیں معاف انہیں کیا جاتا ہے، جن سے کوئی گلہ ہو، مجھے تو آپ سے کبھی کوئی گلہ تھا ہی نہیں تو پھر معافی کسی۔ ان فیکٹ آپ کا ہر لفظ ہر انداز میرے لیے تحفہ ہے محبت کا نایاب تحفہ، جس عمر میں بچے محبت کے صحیح معنوں سے بھی آشنا نہیں ہوتے اس عمر سے میں آپ کے خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھ سے بہتر آپ کو اور آپ کے دل میں پلنے والی خواہشوں کو بھلا کون جان سکتا ہے۔'' محبت اور سچے جذبوں کی چاشنی میں ڈوبی ہشام کی آواز اسے خوابوں کے حسین نگر لے پہنچی تھی۔

''خیر میں نے فون یہ بتانے کے لیے کیا تھا کل یونیورسٹی کے بعد تیار رہیے گا امی جان نے ہونے والی بہو کو ڈھیر ساری شاپنگ کروانی ہے۔'' ہشام اپنے مخصوص لہجے میں بولتا چلا گیا۔

''زندگی میں محض اپنی خواہشوں کے حصول کے لیے نہیں جیا جا سکتا۔'' وہ ایک بار پھر وانیہ کی بات سے متفق ہوئی تھی۔

''نئی صبح اس کے دل کے سونے آنگن میں بے پناہ خوشیاں لے کر اترنے والی تھی۔

......☆......

نائلہ طارق

سلسلے وار ناول

اے عشق ہمیں برباد نہ کر

بوسیدہ اور قدیم عمارتوں کا یہ عقبی حصہ تھا جہاں ایک چوڑی اور طویل سڑک موجود تھی۔ سڑک کے دوسری جانب کھنچی باؤنڈری سے دور کافی ہٹ کر کچی مگر محدود آبادی والی بستی تھی اور اس وقت وہاں تاریکی میں چند ہی ٹمٹماتی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے موجود پول پر ایک اسٹریٹ لائٹ روشن تھی اور اس



کی دور دور تک بکھری تیز زرد روشنی میں وہ موجود تھا۔ وہ جس کا وجود اسٹریٹ لائٹ سے بھی زیادہ روشن اور منور۔ وہ انسانی وجود واقعی نظر بھر کر دیکھنے اور پھر دیکھتے ہی رہ جانے کے قابل تھا۔ کوئی عجیب سی کشش تھی اس میں ٹھٹھکا دینے والی، چونکا دینے والی عجیب مگر انوکھی ہیئت کے سیاہ لانگ شوز کے ساتھ بلیک لیدر کی چمکتی چست پینٹ میں اس کی ٹانگیں انتہائی پرکشش دکھائی دے رہی تھیں۔ خون کو رگوں میں منجمد کر دینے والی سردی میں اس کے جسم سے چپکی بغیر آستینوں کی سرخ رنگ کی شرٹ دور سے ہی جھلملاتی دکھائی دے رہی تھی۔ برہنہ بازوؤں پر رنگین نقش و نگار نمایاں تھے۔ اس کے ہاتھوں اور گردن میں مختلف وضع طرز کی زنجیریں موجود تھیں اور انگلیاں خوب صورت انگوٹھیوں سے لیس تھیں۔ اس کے سرخ و سپید چہرے کے نقوش بے حد جاذب نظر اور چبھتے ہوئے تھے، جن میں نوخیزی اور معصومیت کی چمک بھری ہوئی تھی مگر اس کی آنکھیں

قسط نمبر 1



معصومیت کی چمک سے عاری تھیں۔ بے شک ان بڑی بڑی شہد رنگ آنکھوں میں بدمقابل کو مبہوت کر دینے والی صلاحیت موجود تھی مگر ان میں عقاب جیسی تیزی اور عیاری موجود تھی۔ اسے دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اس کا شمار ایسی مخلوقات میں ہوتا ہے جو آدھی رات میں سڑکوں پر گھومتی پائی جاتی ہیں۔ وہ مخلوقات جو بہت مخصوص اور مخصوص جگہوں پر باآسانی دکھائی دے جاتی ہیں مگر وہ ان سب سے الگ ہے اس کے ریٹ عام اسٹریٹ ورکرز سے کافی زیادہ ناٹی ہیں۔ شہر کے مہنگے ترین کال بوائز میں اس کا نام ٹاپ پر ہے باوجود اس کے کہ وہ کسی کے ماتحت نہیں نہ ہی اس کی بیک پر کوئی مخصوص سپورٹ ہے۔ دوسرے کئی اسٹریٹ ورکرز کی طرح سڑکوں پر گھوم پھر کر اس نے کبھی کسٹمرز کو تلاش نہیں کیا شاید وہ اس بات پر زیادہ یقین رکھتا ہے کہ پیاسا ہمیشہ خود چل کر کنویں کے پاس آتا ہے۔ ویسے بھی وہ کافی نفیس اور نازک مزاج طبیعت رکھتا ہے۔ سڑکوں پر کسٹمرز کی تلاش میں خوار ہونے کے بعد تھکن کے باعث وہ یقیناً بہتر سروس مہیا کرنے کے قابل نہیں رہ سکتا تھا اور پھر یہ بھی کہ اس طرح بھٹکنے کے دوران اسے غیر مہذب لوگ بھی ٹکرا سکتے تھے جب کہ ایسے لوگوں کی طرف دیکھنا بھی اس کی برداشت سے باہر تھا۔ جب مہذب اور ہائی کلاس کے افراد خود اس تک اسے ڈھونڈتے ہوئے آتے ہیں تو اسے ضرور ہی کیا تھی خواری اٹھانے کی حالانکہ اس کے کسٹمرز اس کے ریٹ سن کر تذبذب میں ضرور پڑ جاتے تھے مگر اس کی مقناطیسی شخصیت ان کو سب کچھ بھلانے پر مجبور کر دیتی تھی ہر بار وہ ڈیلنگ کے دوران ہی اپنی منہ مانگی قیمت طلب کرتا تھا۔ وہ بھی کیش کی شکل میں۔ رقم کے معاملے میں کوئی کمپرومائز نہیں۔ اس کی بے نیازی اس کی شخصیت کا اہم خاصہ تھی۔ ڈیلنگ میں وہ اپنی شرائط پہلے رکھتا تھا۔ سب سے اہم تو یہی کہ وہ کسی بھی قسم کی ڈرگز اور رقص وغیرہ سے اجتناب کرتا ہے۔ کسی بھی قسم کے Violence کے خلاف وہ اپنی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ہر چیز میں پہلے اس کی رضامندی ضروری ہے۔ اس کے پاس ایسے کسٹمرز بھی آتے تھے جن کو صرف ایک اچھے سامع کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ اچھے ماحول میں ڈنر کر سکیں۔ اپنی پرابلمز اور پرسنلز شیئر کر سکیں اور اس سب کے لیے وہ ایک آئیڈیل بوائے فرینڈ تھا۔

اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی میں وہ ٹہلنگ کرتے ہوئے چہل قدمی کر رہا تھا۔ مہکتے بھڑکتے لباس میں اس کی چال مکمل اور خالص مردانہ تھی مگر کچھ لاابالی اور لاپروائی کا عنصر بھی موجود تھا۔ یکدم ہی چونک کر رکتے ہوئے اس نے ایک طائرانہ نگاہ اپنے اطراف میں دوڑائی تھی۔ ایک بار پھر اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ مسلسل کسی کی نظروں کے حصار میں ہے اور آج یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا حالانکہ اس وقت دور دور تک اس کے علاوہ کوئی آدم زاد نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ سڑک سے کبھی کوئی گاڑی گزرتی تو سناٹا چند لمحوں کے لیے ٹوٹ جاتا۔ ویسے بھی اس کڑاکے کی سردی میں کوئی اسے تکنے کے لیے وہاں نہیں رک سکتا تھا۔ سر جھٹکتے ہوئے اس نے سفید پول سے پشت ٹکائی تھی اور سینے پر بازو باندھ کر آسمان پر چھائی دھند کو دیکھنے لگا تھا۔ اس جگہ کا انتخاب اس نے ہفتے بھر پہلے ہی کیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے وہ کسی اور اسٹریٹ پر ہوتا تھا۔ جس پروفیشن میں وہ تھا جیلسی اور رقابت اس میں بھی موجود تھی۔ پولیس کا چھاپہ اچانک پڑا تھا۔ بروقت اگر وہ منظر سے غائب نہ ہوتا تو یقیناً کسی لاک اپ میں ہوتا۔ کچھ دن پوشیدہ رہنے کے بعد منظر پر آنے کے لیے اس نے یہ موجودہ اسٹریٹ تلاش کر لی تھی اور کافی مطمئن تھا کہ یہاں بہت خاموشی اور سکون تھا اور اس کا واسطہ بھی یہاں کافی مہذب اور ہائی کلاس کسٹمرز سے پڑ رہا تھا۔ جو کام وہ کر رہا تھا اس سے متعلق وہ کسی مخصوص یا خفیہ ایجنسی سے منسلک نہیں ہوا تھا بلکہ اپنے طور پر اپنی مرضی سے یہ کام کر رہا تھا اس لیے اپنے تحفظ اور حفاظتی اقدامات بھی اسے خود ہی کرنے پڑتے تھے اور اس میں

وہ کامیاب تھا۔
خوب صورت تراش خراش کے ہلکے سنہری بالوں میں انگلیاں پھیرتا وہ ایک بار پھر چونکا تھا۔ اس بار چونکتی نظروں سے اس نے دور کچی آبادی کی جھونپڑیوں پر نظر ڈالی تھی اور پھر اپنے دوسری جانب سڑک کے اس پار بوسیدہ عمارتوں کو بغور دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ تب ہی اس کی تیز نگاہ اس ایک عمارت پر رک گئی تھی۔ دھند اتنی بھی نہ تھی کہ کچھ دکھائی نہ دیتا۔ اس عمارت کے فلیٹس کی سب کھڑکیاں بند تھیں سوائے اس ایک کھڑکی کے جہاں اس کی عقابی نظریں جم گئی تھیں۔ وہ کھڑکی روشن تھی اس کے کھلے پٹ کے درمیان ایک انسان کا سر دکھائی دے رہا تھا مگر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سر کسی عورت کا ہے یا مرد کا۔ وہ سر سیاہ ہیولے کی طرح ہی ساکت نظر آرہا تھا کچھ دیر تک وہ بھی اس سیاہ ہیولے کو دیکھتا رہا مگر پھر بھی ہیولا وہاں موجود رہا تھا۔ پول سے دور ہٹتا وہ دوبارہ چہل قدمی شروع کر چکا تھا مگر کن انکھیوں سے اس کھڑکی کی جانب بھی وقتاً فوقتاً دیکھتا جارہا تھا۔ کھڑکی میں ہیولا اب بھی ساکت تھا اور وہ اس کی نظروں کی تپش بخوبی محسوس کر رہا تھا۔
پھر بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا جب سڑک پر ایک چمچماتی کار آکر رکی تھی جس کے شیشے بالکل سیاہ تھے۔ کار سے ایک شوفر اتر کر اس کی طرف آیا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ کار کے اندر اس کا کوئی پرانا کسٹمر موجود ہے جو ظاہر ہے کہ اس کی شرائط وغیرہ کے بارے میں جانتا ہے۔ شوفر اور اس کے درمیان کچھ جملوں کے تبادلے ہوئے اس کے بعد شوفر نے ایک خاکی رنگ کا بھاری لفافہ اسے دے دیا تھا۔ لفافہ کھول کر اس نے رقم کو دیکھا اور مطمئن ہو کر اسے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لیا تھا۔ ازلی بے نیازی کے ساتھ وہ شوفر کی تقلید میں کار تک آیا تھا۔ شوفر نے پہلے ہی اس کے لیے بیک سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک آخری نگاہ سامنے اس کھڑکی پر ڈالی تھی جہاں سیاہ ہیولا اب تک موجود ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ہی کار تیزی سے طویل سڑک پر بھاگتی جارہی تھی۔
جہاں تک اس کی نظریں کار کا تعاقب کر سکتی تھیں وہ اس جانب دیکھتی رہی تھی اور پھر گہری سانس لے کر دوبارہ سامنے اس پول کی جانب دیکھا تھا جہاں اب کوئی نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد پول کی روشنی بھی پھیکی پھیکی دکھائی دے رہی تھی۔ اس سنسان سڑک کو رات گئے تک تکتے رہنا اس کی عادت تھی۔ سڑک سے گزرتی اکا دکا گاڑی کی آواز اسے اپنے زندہ ہونے کا احساس دلا جاتی تھی اس کے بعد پھر وہی موت جیسا ہولناک سناٹا گہرا سکوت اور کسی دوسری گاڑی کا انتظار......!
تقریباً ایک ہفتہ پہلے وہ اس کی نظروں میں آیا تھا۔ رات بارہ بجے سے ایک بجے کے درمیان وہ جانے کہاں سے اسٹریٹ لائٹ کے نیچے نمودار ہو جاتا تھا۔ اس سے زیادہ اس کی حرکتیں چونکا دینے والی تھیں۔ دو راتیں گزرنے کے بعد ہی اسے مکمل یقین ہو گیا کہ وہ کس مقصد سے وہاں موجود ہوتا ہے اور یہ کہ اسے کس گاڑی کے رکنے کا انتظار ہوتا ہے۔
اس کی اپنی زندگی بہت محدود تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ وہ اپنی ویران قبرستان جیسی زندگی میں سانس لیتے لیتے دنیا سے کٹ کر بالکل الگ تھلگ ہو چکی ہے اور پچھلے ایک ہفتے میں وہ یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے اور اس کے ساتھ چلنے والے اشرف المخلوقات کہلائے جانے والے انسان کیسے کیسے راستوں سے گزر جانے کا عزم رکھتے ہیں۔ غلاظتوں سے اٹے پڑے سیاہ راستے..... گھناؤنے راستے..... بوجھل دل کے ساتھ اس نے آہستہ سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے تھے۔

فرش پر بچھی سفید چادر پر ہلکی سلوٹیں پڑی ہوئی تھیں۔ دیوار سے پشت لگائے بیٹھی وہ ان سلوٹوں کو تک رہی تھی۔ کمرے میں پھیلی بلب کی بیمار زرد روشنی میں اور کوئی چیز تھی بھی نہیں دیکھنے کے لیے۔ اگربتی اور لوبان کی دھیمی مہک اب تک فضا میں بسی ہوئی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے اپنی ڈھٹائی پر حیرت تھی اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ سر سے آخری سائبان بھی چھن جانے کے بعد وہ اب تک زندہ کیسے ہے؟ اس کی نظریں کمرے میں رکھے واحد تخت تک گئی تھیں جو خالی تھا۔ اس تخت کو اب خالی ہی رہنا تھا کیونکہ جسے وہ اس تخت پر دیکھتی تھی جو اس کی ڈھارس تھیں وہ اب منوں مٹی تلے ابدی نیند جا سوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں تخت دھندلانے لگا تھا۔ اس کا دل بند ہونے لگا تھا۔ دل سے کراہیں بلند ہو رہی تھیں۔ باپ کے لیے اس نے کسی نہ کسی طرح صبر کر لیا تھا مگر ماں کے لیے اس کی روح تک تڑپ رہی تھی۔ اس کے دل سے ان سب کے لیے بددعائیں نکل رہی تھیں جو اس کی ماں کو اذیت میں دیکھ کر بھی انجان بنے رہے۔ انہیں تو ابھی اپنی بیٹیوں کے گھر آباد کرنا تھے ان کی خوشیاں دیکھنی تھیں مگر...... اپنے ہی دشمن نکلے۔ ننھیال ، ددھیال دونوں طرف سے سب دامن بچاتے رہے۔ زکوٰۃ خیرات کے قابل بھی نہ سمجھا کہ کم از کم ایک عورت کو بہتر علاج تو میسر آ جاتا۔ گرم سیال اس کے چہرے سے بہتا اس کے گریبان تک آ پہنچا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں قبر میں بھی سکون سے نہیں ہو گی۔ اس ظالم دنیا میں اپنی ناتواں بیٹیوں کو بے آسرا چھوڑ کر کس کس طرح نہ ان کی روح تڑپی ہو گی۔ آج تین دن گزر چکے تھے مگر اس کا دل اس وقت بھی ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس کی سسکیاں دیواروں سے ٹکرانے لگی تھیں۔

"دراج......" کمرے میں بھاگی آئی رائمہ کا دل مٹھی میں جکڑا تھا۔ سرعت سے اس نے روتی بلکتی دراج کو اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔ ماں کی جدائی کا غم تو آخری سانس تک تازہ رہنا تھا مگر رائمہ کا دل چھوٹی بہن کے لیے پھٹا جا رہا تھا۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں کتنی مشقتیں کتنی اذیتیں اٹھا رہی تھی۔ اس کا بچپن، شوخیاں، شرارتیں سب حالات کی تلخیوں کی نذر ہو گئی تھیں۔ یہ ایک ستم جو ہر اذیت پر بھاری تھا تین دن سے وہ دونوں بہنیں اس کا بوجھ دل پر رکھے کیسے زندہ تھیں یہ ان کا رب ہی جانتا تھا۔ کوئی ان کے آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔ کوئی سر پر ہاتھ رکھنے والا نہیں تھا۔ کہنے کو سب رشتے ناتے اس زمین پر تھے مگر کوئی قریب اس ڈر سے نہیں آتا تھا کہ کہیں دنیا دکھاوے کی ہمدردی بھی گلے نہ پڑ جائے۔ ایک تو اپنی جان سے گئی کہیں دو جانوں کا بوجھ ان کے کندھوں پر نہ آ جائے۔

جانے کتنی دیر دونوں بہنوں کی سسکیاں کمرے میں گونجتی رہی تھیں۔ ضبط کا دامن کسی طرح تھام کر رائمہ نے اس کے آنسو بھی صاف کیے تھے اور پھر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔

"دراج! اب ہم دونوں کو ہی ایک دوسرے کو سہارا دینا ہے ورنہ ہمارے آنسو ہمارے ماں باپ کو سکون نصیب نہیں ہونے دیں گے۔ ہمیں اس سچ کو قبول کرنا ہی ہو گا کہ اللہ کے سوا کوئی ہمارا مددگار نہیں ہے۔ زندہ رہنے کے لیے ہمیں خود کو مضبوط کرنا ہو گا۔"

"تم اکیلی نہیں ہو میں ہوں تمہارا خیال رکھنے کے لیے، تمہاری فکر کرنے کے لیے۔ بڑی بہن ماں کی جگہ ہوتی ہے تمہاری ماں ابھی زندہ ہے۔ ہمت رکھو، ایک دن سب ٹھیک ہو جائے۔" اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتی وہ نم لہجے میں اسے سمجھاتی جا رہی تھی۔

"کھانا لے آؤں تمہارے لیے؟" رائمہ کے سوال پر اس نے بس نفی میں سر ہلایا تھا۔ "سو جاؤ کچھ دیر تم تین دن سے ٹھیک طرح سوئی نہیں ہو۔" رائمہ کے محبت بھرے اصرار پر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ رائمہ نم

آنکھوں سے اس کے بے حد سوجے پپوٹوں اور چہرے پر پھیلے درد کے سائے دیکھتی رہی تھی۔ تب ہی باہر سے پکارتی آواز پر رائمہ نے دروازے کی طرف دیکھا تھا۔

''رائمہ باجی! اوپر آجائیں زرکاش بھائی کا فون آیا ہے۔ آپ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔'' دہلیز پر رکی اس کی تایازاد شہزا نے اطلاع دی تھی اور وہیں سے واپس چلی گئی تھی جب کہ دراج ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

''آپ اوپر نہیں جائیں گی۔ نفرت ہے مجھے ان سب کی شکلوں سے، کھا گئے میری ماں کو یہ لوگ......!''

''دراج! مجھے جانا پڑے گا زرکاش بھائی اتنی دور بیٹھے ہیں۔ ان کا کیا قصور ہے؟''

''امی کے لیے ہی بات کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ نہیں جاؤں گی تو بری بات ہوگی۔''

''آتی ہوں ابھی میں۔'' رائمہ اس کی بات کاٹتے ہوئے اٹھ گئی تھی۔

''یہ ماں، بیٹے، بیٹیاں سب کے سب شاطر ہیں۔ خدا غارت بھی نہیں کرتا ان لوگوں کو۔'' زہر خند لہجے میں وہ غرائی تھی جب کہ رائمہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد رائمہ کی واپسی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ حزن پھیلا تھا۔ خاموشی سے وہ دراج کے پاس آ بیٹھی تھی۔

''تمہارا پوچھ رہے تھے میں نے بہانہ کر دیا کہ دراج ابھی سوئی ہے۔''

''بہانہ کیوں؟ سچ بتا دیتیں اسے کہ دراج اس سے بات تو کیا اس پر تھوکنا بھی گوارا نہیں کرتی۔'' وہ شدید نفرت سے بولی تھی۔

''امی، ابو اور تایا کو یاد کر کے رو رہے تھے بہت۔'' رائمہ کا لہجہ سوگوار تھا۔

''اس کے گھر والے کم ہیں ناٹک کرنے کے لیے جو اب وہ فون پر ڈرامے کر رہا ہے۔ اس سے کہنا تھا میرے ماں باپ کو نہیں اپنے باپ کو روئے بیٹھ کر۔ جن کا آخری دیدار بھی کرنا نصیب نہیں ہوا اس نامراد کو۔ یورپ میں بیٹھ کر عیاشیاں کر رہا ہے۔ گھر والے اس کے نوٹوں پر خوب اچھل رہے ہیں۔ ویسے تو کبھی خبر تک نہیں لیتا جنازے اٹھتے ہیں تو ہمدردی دکھانے کے لیے فون کر لیتا ہے۔''

''کہہ رہے تھے ہفتہ دس دن میں وہ واپس آ رہے ہیں۔'' رائمہ نے بتایا تھا۔

''کیوں......! اب کس کو کندھا دینے واپس آ رہا ہے؟''

''مت کرو ایسی باتیں۔'' رائمہ نے ہول کر اسے روکا تھا۔

''ہمیں ان سب نے مل کر ڈسا ہے۔ میں جو بولوں کم ہے۔ اس فتنے کے ہی بل بوتے پر اس کے گھر والے اس گھر کو بیچنا چاہتے ہیں۔ ہم دونوں کو دربدر کرنا چاہتے ہیں اور خود جائیں گے بنگلے میں۔ آئینہ دکھا دوں گی ان سب کو پوری دنیا کے سامنے اس گھر کی زمین میرے باپ کی ملکیت ہے ہماری ہے۔ میرا باپ ان لوگوں کو پیر رکھنے کے لیے یہ زمین نہ دیتا تو اوپر والا پورشن کیا یہ لوگ ہوا میں بناتے؟ ابو کے لیے ڈیڑھ لاکھ علاج کی مد میں اگر ان لوگوں نے خرچ کیا تو صرف اس لیے کہ اس وقت تایا ابو زندہ تھے۔ اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ وہ ڈیڑھ لاکھ دے کر انہوں نے اس زمین کی قیمت ادا کر دی ہے۔ میری ماں کو تڑپتا دیکھتے رہے ہیں یہ لوگ۔ اذیت ہم نے اٹھائی، عیش کرتے یہ لوگ ہماری بے بسی کا تماشا دیکھتے رہے ہیں اگر آج ہم قانونی کارروائی کرنے کے قابل ہو جائیں تو اس زمین کی قیمت لاکھوں میں ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھوں سے طوطے اڑ جائیں گے۔ پچھلی بار تو مجھے آپ نے روک لیا تھا مگر اب اگر تائی یا شیراز نے گھر کے معاملے کو اٹھایا

تو دن میں ماں، بیٹے کو تارے دکھا دوں گی۔ بہت کم لیے ان کے طعنے، بہت دیکھ لیے ان کے رنگ رشتوں کے نام پر سیاہ دھبہ ہیں یہ لوگ بے شرم خود غرض آستین کے سانپ......!!''

''بس کرو مت دل جلاؤ اپنا۔ اچھا ہوا پتا چل گیا کہ زرکاش بھائی آ رہے ہیں۔ میں موقع دیکھ کر ان سے تمام معاملات پر بات کروں گی۔ وہ ضرور کوئی حل نکالیں گے وہ ان سب کی طرح نہیں ہیں۔''

''خوش فہمی ہے آپ کی۔ اس کی رگوں میں بھی اپنی ماں اور بھائی جیسا سیاہ خون دوڑ رہا ہے۔ اس کی ماں ہمارے سائے سے بھی بچا کر رکھے گی اسے سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے زرکاش اپنے گھر والوں کے لیے۔ دولت کے پجاری۔'' اس کے زہر خند لہجے پر رائمہ سر جھکائے خاموش ہی رہی تھی۔

☆......☆

رات کی رانی کی مخصوص پراسراری مہک ہوا کے مدھم جھونکوں کے ساتھ ہر سمت پھیلتی جا رہی تھی۔ کیاری میں بے تحاشہ کھلے نازک سفید پھولوں کے قریب گہری سانس لیتی وہ سر اٹھائے آسمان پر ٹمٹماتے لاتعداد ستاروں کو دیکھ رہی تھی۔ پورے چاند کے گرد روشنی کا ایک ہالا سا بنا ہوا تھا۔ اس ہالے کے گرد پہرہ دیتے ستاروں پر اس کے قدم تھے۔ ایک تارے سے دوسرے، دوسرے سے تیسرے اور پھر چوتھے...... ایک ہی جست میں وہ ایک تارے سے دوسرے تارے پر قدم رکھتی چاند کا طواف کر رہی تھی۔ اس کے لبوں پر مسحور کن سی مسکراہٹ جھلملا رہی تھی۔ چاند کے گرد اس کا دوسرا پھیرا شروع ہو رہا تھا جب ایک آواز اسے زمین پر کھینچ لائی تھی۔ سرعت سے آسمان سے نگاہ ہٹاتی وہ پلٹ کر برآمدے کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ ''رجاب! وہاں کیا کر رہی ہو؟ سب کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' ندا واپس اندر جاتی بولی تھیں۔

''آتی ہوں بھابی۔'' آواز لگا کر اس نے دوبارہ آسمان کی جانب دیکھا تھا اور پھر تیز قدموں سے برآمدے کی سمت بڑھ گئی تھی۔

''آج خاص آپ کے لیے آپ کی فیورٹ سبزی بنائی ہے۔'' ندا نے مسکراتے ہوئے اطلاع دی تھی۔

''واقعی؟'' راسب نے حیرت سے اسے دیکھا تھا جو جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔

''کہیں تم نے اپنا ہاتھ تو نہیں جلایا؟ دکھاؤ ذرا مجھے۔'' راسب کی تشویش پر اس نے اپنے ہاتھ ان کو چیک کروائے تھے۔

''فکر مت کریں میں اس کے ساتھ کچن میں تھی۔ اب آپ رجاب کو زیادہ انتظار نہ کروائیں۔ یہ آپ کی تعریف سننے کے لیے بے چین ہے۔'' ندا نے کہا تھا۔

''اتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے، یقیناً یہ سبزی بہت ذائقے دار ہے۔'' ڈش میں سے سبزی پلیٹ میں نکالتے ہوئے راسب نے تعریفی نظروں سے بہن کو دیکھا تھا۔

''زبردست۔'' پہلا لقمہ لیتے ہی وہ بے ساختہ بولے تھے جب کہ رجاب کی کانچ جیسی سبز آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔

''ندا! اس نے پہلی ڈش ہی اتنی عمدہ بنائی ہے اس کے ہاتھ میں تم سے زیادہ ذائقہ ہے۔'' وہ ندا سے مخاطب تھے جب کہ رجاب کے لبوں پر مسکراہٹ کھل اٹھی تھی۔

''شاباش! اب کل تمہاری فیورٹ آئس کریم پکی ہے۔'' اس کا سر تھپتھپا کر راسب نے مزید اسے خوش کر دیا تھا۔

''لیکن بیٹا! ابھی اپنی پوری توجہ پڑھائی پر دو۔ تمہیں یاد ہے ناں مجھے اس گھر میں ایک ڈاکٹر چاہیے؟''
راسب کے تنبیہی لہجے پر اس نے فوراً اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''مجھے اس دن کا انتظار ہے جب میرے سامنے تم ڈاکٹر رجاب خان بن کر آؤ گی۔'' راسب نے شفقت بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ''اور ذرا اپنی پڑھائی کے ساتھ ذرا اس نالائق پر بھی توجہ دو۔ آج بھی اس کا سارا ہوم ورک غلط تھا۔'' راسب نے ناگوار نظروں سے بیٹے کو دیکھا تھا جو منہ لٹکائے اپنی پلیٹ پر جھکا ہوا تھا۔

''کھانے کے بعد اپنا سارا ہوم ورک دوبارہ کرو، کوئی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔ میں چیک کروں گا۔ سمجھے۔''
ان کی ہدایت پر رومیل نے بس خفت زدہ نگاہ ان پر ڈالی تھی۔

''آغا جان! یہ آج بھی اسکول نہیں جا رہا تھا۔ بھائی نے زبردستی اسے تیار کر کے وین میں بٹھایا تھا۔''
رجاب کی باپ کو شکایت لگانے پر رومیل نے منہ بگاڑ کر گز بھر کی زبان اسے دکھائی تھی۔

''بری بات۔ کھانا کھاؤ۔'' ندا نے اس کے سر پر چپت لگائی تھی جب کہ رجاب ہنسی روکتی کھانے کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔

☆......☆

12 بج چکے تھے۔ جب اسٹریٹ لائٹ کے حصار میں ایک ٹیکسی آکر رکی تھی۔ سیاہ ہینڈ بیگ پکڑے وہ ٹیکسی سے اترا تھا اور پھر ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی۔ بیگ سے پانی کی بوتل نکال کر اس نے بیگ پول کے قریب ہی رکھ دیا تھا اور پول سے پشت ٹکا کر بوتل سے پانی کے گھونٹ بھرتا اردگرد کا جائزہ بھی لیتا رہا تھا۔ بوتل کا کیپ لگا کر وہ اسے بیگ میں رکھنے کے لیے جھکا تھا اور جھکتے ہی اس نے کچھ فاصلے پر موجود برگد کے پرانے درخت کی جانب نگاہ ڈالی تھی۔ درخت کی گھنی شاخوں تلے نیم تاریکی کا راج تھا۔ اس کے کانوں نے کوئی دھوکا نہیں کھایا تھا۔ گہری خنک خاموشی میں اسے ایک سے دو بار کسی کے لباس کی سرسراہٹیں سنائی دی تھیں۔ بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے اس نے اپنی عقابی نظریں چاروں سمت دوڑائی تھیں اور پھر دبے قدموں اس درخت کی جانب بڑھا تھا۔ احتیاطاً دو چار قدم کے فاصلے پر رک کر اس نے دوسری جانب سے کسی حرکت کا انتظار کیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ تنے تک پہنچتا چادر میں چھپا کوئی دوسری جانب سے نکلتا برق رفتاری سے بھاگا تھا۔ اتنی ہی برق رفتاری سے اس چادر میں چھپے وجود کے پیچھے جاتا وہ عقب سے اس کے بھاگتے پیروں پر ایک زوردار ٹھوکر لگا گیا تھا جس کے بعد وہ وجود بری طرح لڑکھڑاتا دھڑام سے زمین پر گر چکا تھا اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک تکلیف دہ نسوانی چیخ بلند ہوگئی تھی۔ وہ بھونچکا رہ گیا تھا۔ ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جو گرنے کے بعد فوراً ہی سر سے اترتی چادر سنبھالتی سرعت سے اٹھی تھی اور پلٹ کر دیکھے بنا گرتی پڑتی وہاں سے بھاگتی چلی گئی تھی۔ حق دق کھڑا وہ تب تک اسے دیکھتا رہا تھا جب تک وہ سڑک کے دوسری جانب عمارت کے زنگ آلود گیٹ کے اندر غائب نہ ہوگئی۔ چند لمحوں بعد پول کی سمت الٹے قدموں جاتے ہوئے اس نے اسی عمارت کی اس مخصوص کھڑکی کی جانب دیکھا تھا جو کھلی ہوئی تھی مگر وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ الجھی نظروں سے وہ کبھی زنگ آلود گیٹ کو اور کبھی خالی کھڑکی کو دیکھتا رہا تھا۔ اس وقت تک جب تک کوئی گاڑی اس کے لیے سڑک پر نہ رکی۔

☆......☆

چند لمحوں تک وہ بڑی سی دیگچی میں ابلتی تھوڑی سی دال کو دیکھتی رہی پھر پانی کا گلاس ہاتھ میں پکڑے کچن سے نکل آئی تھی۔ تھکے تھکے انداز میں وہ باہر ہی تخت کے کنارے بیٹھ گئی تھی۔ کمرے سے مشین کی تیز گھرر گھرر

اس کے دماغ میں چبھ رہی تھی۔ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے رائمہ کو پھر سے مشین سنبھالنی پڑی تھی۔ رائمہ کا یہی ہنر تو گھر کی دال روٹی چلاتا رہا تھا۔ باپ کی طویل بیماری کے دوران حالات بہت دگرگوں نہیں تھے کیونکہ تایا کا ہاتھ ان کے سر پر تھا مگر دو سال پہلے ان کی وفات نے صحیح معنوں میں دنیا کی پہچان کروادی تھی اور پھر ماں کی بیماریوں کی شروعات...... ان کی مہنگی دوائیں...... تائی اور ان کی اولادوں نے ہاتھ جھاڑ دیئے ان ماں بیٹیوں کی طرف سے مکمل غافل ہو گئے۔ نوبت یہاں تک آ گئی کہ تائی نے فرمان جاری کر دیا کہ اس کی ماں اب اپنی بیٹیوں کو لے کر بھائی کے پاس جائے۔ وہ اب ان تینوں پر اپنے بیٹے کی کمائی خرچ نہیں کر سکتی تھیں۔ رائمہ نے ان کے آگے ہاتھ پھیلانا چھوڑ دیا، محلے سے سب ہی عورتیں اپنے کپڑے اس سے سلوانے لگی تھیں مگر سلائی سے ملنے والی اجرت ماں کے علاج کے لیے ناکافی تھی۔ دراج نے دو سال پہلے میٹرک پاس کر کے کالج میں ایڈمیشن لیا تو صرف تایا کی وجہ سے مگر ان کا اچانک ہارٹ اٹیک اور وفات، اعلیٰ تعلیم کا خواب ادھورا رہ گیا۔ وہ فرسٹ ایئر کے پیپرز بھی نہ دے سکی۔ گھر کی حالت اور ماں کی بیماری نے اسے ایک گارمنٹس فیکٹری تک پہنچا دیا۔ رائمہ بہت روئی مگر کڑے وقت کے طویل سلسلے نے دراج کے دل کو سخت کر دیا تھا۔ اس نے رائمہ کی ایک نہ سنی۔ رائمہ اس کی جگہ جاب کرنا چاہتی تھی مگر دراج کو معلوم تھا کہ یہ رائمہ کے لیے بہت مشکل ہو گا۔ ماں باپ کی خدمت میں رائمہ ہمیشہ چار دیواری میں ہی رہی تھی۔ وہ میٹرک بھی مکمل نہ کر سکی تھی۔ گھر کے اندر وہ اپنی بہن کو اتنے کڑے حالات کا مقابلہ کرتے دیکھتی رہی تھی کہ اب وہ اسے گھر کے باہر دوسرے دوزخ میں جھلستا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ رائمہ اس سے عمر میں سات سال بڑی تھی مگر کسی سات سال کے بچے کی طرح معصوم۔ اس میں اور دراج میں بہت فرق تھا۔ رائمہ کی نظر میں وہ بہت چھوٹی تھی مگر دراج جانتی تھی کہ اس کا بچپن کہیں بچپن میں ہی دفن ہو گیا تھا۔ وہ رائمہ سے کئی گنا زیادہ گہری سوچ اور گہری نظر رکھتی تھی۔

پانی کے گھونٹ لیتے ہوئے اس نے چونک کر مین گیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں شاپر اٹھائے شیراز اندر داخل ہوا تھا۔ اس کی شکل دیکھتے ہی دراج کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔ شیراز کے تاثرات بھی اس پر نظر پڑتے ہی بگڑ گئے تھے۔ دھڑ دھڑ سیڑھیاں پھلانگتا وہ اوپر چلا گیا تھا جب کہ دراج تو پہلے ہی نفرت سے رخ پھیر چکی تھی۔ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے اس بات کو جب گھر کو فروخت کرنے کے معاملے کو لے کر بات اتنی بڑھی کہ اپنی ماں اور دراج کے درمیان ہوتی بحث میں شیراز بھی کود آیا تھا اور اتنا کھل کر سامنے آیا کہ دراج نے بھی سارے لحاظ بالائے طاق رکھ دیئے تھے اپنی ماں بہنوں کی حوصلہ افزائی پر شیراز نے کیا کچھ ان بہنوں کو نہیں کہا تھا۔ الزام دھرتے، طعنے دیتے، ذلت بھرے جملے داغتے ہوئے جب شیراز نے اس کی بیمار ماں اور خاموش کھڑی رائمہ کے لیے بھی زہر اگلنا شروع کیا تو دراج کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس کے جو منہ میں آیا وہ جوابی کارروائی میں بولتی چلی گئی۔ اس سے پہلے کہ بات ہاتھا پائی تک پہنچتی رائمہ نے کسی طرح کھینچ کھانچ کر زبردستی اسے کمرے میں دھکیلا اور باہر سے لاک کر دیا تھا۔ اس وقت وہ اپنی تائی اور ان کی اولادوں سے زیادہ دراج کے تیوروں پر خوفزدہ تھی اگر وہ اسے کمرے میں بند نہ کرتی تو شیراز اسے مارتا یا پھر وہ شیراز پر ہاتھ اٹھا لیتی اور اس کے بعد رائمہ کو یقین تھا کہ دونوں صورتوں میں ان ماں بیٹیوں کو ہاتھ پکڑ کر نہیں دھکے دے کر گھر سے بے دخل کر دیا جاتا۔ اس سے بہتر تھا کہ وہ صبر و تحمل کے ساتھ سر جھکا کر تائی اور ان کی اولادوں کی چیخ پکار اور بھڑاس کو سنتی رہتی۔ ان کے گنوائے جانے والے احسانات پر ان سے ہاتھ جوڑ کر معافی بھی مانگتی اور اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

تخت سے اٹھ کر وہ کمرے میں رائمہ کے پاس آبیٹھی تھی۔ مشین روک کر رائمہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"آپ نے ٹھیک کہا تھا آ گئی ہے سونے کا انڈا دینے والی مرغی...... جب ہی تو وہ آوارہ کسی کام نہ کاج کا، اندر باہر کے چکر لگا رہا ہے بھائی کی سیوا کے لیے۔ آخر بھائی کے ٹکڑوں پر ہی تو پل رہا ہے۔ اتنا تو کرنا ہی پڑے گا۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی تھی۔

وہ فجر کی نماز پڑھ رہی تھی۔ جب باہر شور ہوا تھا۔ شاید اچانک آئے تھے یا پھر تائی کو ان کی آمد سے بے خبر رکھا گیا تھا۔ آوازوں سے تو کچھ ایسا ہی لگ رہا تھا۔" رائمہ نے کہا تھا۔

"فجر میں آئے تھے مگر اب تو دن چڑھ آیا ہے۔ فون پر تو بہت مگر مچھ کے آنسو بہا رہے تھے۔ ملنے نہیں آئے آپ کے زرکاشی بھائی؟ یا سب کی سن کر ان کی زبانیں اپنے منہ میں ڈال کر آئیں گے۔ ویسے اگر ہمارے خلاف کان بھرے بھی جا رہے ہیں تو مجھے نہیں لگتا کہ اگلے ایک ہفتے تک بھی وہ سیڑھیاں اتر کر ہم تک آسکیں گے۔"

"خاموش رہو، بہت بڑے ہیں وہ تم سے۔ ان کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کرنا کہ وہ ہم سے بدظن ہو جائیں۔" رائمہ نے ٹوکا تھا۔

"مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کی ماں بہنیں اور بھائی بخوبی یہ کام کر رہے ہوں گے مگر آپ غور سے سن لیں اگر آپ سیڑھیاں چڑھ کر اس سے ملنے خود گئیں تو میں آپ سے بات نہیں کروں گی اور آپ جانتی ہیں میں جو کہتی ہوں وہ کرتی بھی ہوں۔" اس کی دھمکی پر رائمہ خاموش رہی تھی۔

"میں کل سے فیکٹری جا رہی ہوں۔" اس کی اطلاع پر کپڑے کی تہہ لگاتی رائمہ چونکی تھی۔

"اب کس کے لیے کام کرنے باہر جاؤ گی؟ نہ ڈاکٹر کی فیس، نہ دواؤں کی اب ضرورت ہے۔" رائمہ کا لہجہ نم تھا۔

"بجلی اور گیس کے آدھے بل جو اوپر بیٹھے فرعونوں کو دیتے ہیں ہر مہینے۔ کہاں سے آئیں گے اس کے لیے روپے؟"

"فکر مت کرو، اللہ کا شکر ہے سلائی سے اتنے پیسے ہر ماہ بن جائیں گے۔ دو وقت کی روٹی بھی کسی نہ کسی طرح اس میں پوری ہو رہی ہے اور کیا چاہیے؟" رائمہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی تھی۔

"مگر میں صرف دو وقت کی روٹی کھانے کے لیے زندہ نہیں ہوں۔ حال تباہ ہو گیا مگر مستقبل کسی قیمت پر تباہ نہیں ہوگا۔ اپنے لیے مجھے سب کچھ چاہیے۔ وہ سب کچھ جو میں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔" اس کے مضبوط لہجے میں چھپے عزم اور چہرے کے تاثرات نے رائمہ کو ساکت کر دیا تھا۔ اس وقت دراج اپنی عمر سے کئی سال بڑی نظر آرہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی اور یہی چمک رائمہ کو اس سے خوفزدہ کر دیا کرتی تھی۔

☆......☆

چند دنوں کی نرل کو گود میں اٹھائے وہ ندا کے قریب آبیٹھی تھی۔

"بھابی! یہ اتنی پیاری ہے کہ میرا دل ہی نہیں کرتا اسے گود سے اتارنے کے لیے۔ کالج میں بھی دل نہیں لگتا میرا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کروں۔" بچی کے چہرے کو چومتی وہ بے بسی سے بولی تھی۔

"اب یہ مت کہنا کہ میں تمہارے آغا جان سے سفارش کروں کہ تم کل کالج نہیں جانا چاہتیں۔ بہت غصہ کریں گے وہ پہلے ہی میری وجہ سے تمہاری دو چھٹیاں ہو چکی ہیں۔ تم کالج سے آکر سارا وقت اسے اپنے ساتھ لگائے رکھو کوئی تمہیں منع نہیں کر رہا۔" ندا نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' ناچار دل پر جبر کرکے وہ چونک کر کمرے میں داخل ہوتے راسب کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔
''بس تمہیں یہ ایک ناول گیا ہے۔ سارا وقت اسی میں لگی رہتی ہو۔ کتابوں کو بھی بھلا دیا ہے۔'' راسب کے ناراض انداز پر وہ چور سی بن گئی تھی۔
''حاذق کا فون آیا تھا کل آرہا ہے وہ۔'' کرسی پر براجمان ہوتے وہ ندا سے مخاطب ہوئے تھے۔
''یہ تو اچھی بات ہے۔ پانچ سال بعد وہ یہاں آرہا ہے۔'' ندا بولی تھیں۔
''کل شام کو تایا جان کی طرف جاؤں گا۔ تم تو جا نہیں سکتیں میں رجاب کو ساتھ لے جاؤں گا۔''
''آغا جان! آپ چلے جایئے گا۔ میں چلی جاؤں گی تو بھابی اکیلی یہاں......''
''تم سے کسی نے کچھ پوچھا ہے؟'' راسب کے سخت لہجے پر اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔
''یہ بعد میں میرے ساتھ چلی جائے گی۔ وہاں کوئی اس کا ہم عمر نہیں اس لیے جانے سے کتراتی ہے۔'' ندا نے اس کی طرف داری میں کہا تھا۔
''وہاں اس کا کوئی ہم عمر نہیں ہے تو کیا ہوا۔ وہاں سب جان چھڑکتے ہیں اس پر۔ پانچ سال بعد حاذق آرہا ہے۔ اس سے ملنے صرف میں جاؤں۔ یہ اچھا لگے گا؟'' وہ ندا پر برس پڑے تھے۔ جب کہ رجاب چپکے سے اٹھتی کمرے سے نکل گئی۔ راسب کے غصے سے اس کی جان جاتی تھی۔
''ہزار بار تم سے کہا ہے کہ جتنی بات اس کے سامنے کرنی ہو اتنی ہی کیا کرو۔ ٹھیک ہے کوئی نہ جائے میں تنہا ہی چلا جاؤں گا۔'' ان کا خاندانی جلال بیدار ہو چکا تھا۔ کچھ کہنا اب بے کار تھا سو ندا نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش رہی تھیں۔ شوہر کی ایک یہی عادت ان کو کھٹکتی تھی کہ اپنے سامنے وہ کسی کی نہیں سنتے تھے۔



پول سے پشت ٹکا کر اس نے لائٹر جلایا تھا اور پھر سگریٹ سلگاتے ہوئے رک کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا جو دھیرے دھیرے کچھ رک کے قدموں سے اسی جانب آرہی تھی۔ لائٹر جھٹک کر بجھاتا وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا جو بالکل سامنے آرکی تھی۔ بلاخوف و خطر اس لڑکی کی نظریں اس کی گردن میں سجی زنجیروں سے گزر کر اس کے بازوؤں سے پھسلتیں ہاتھوں میں چمکتی آرائشی چیزوں پر آکر ٹھہر گئی تھیں۔ دوسری جانب وہ بڑے صبر اور خاموشی سے کھڑا بے نیاز بظاہر نظر آرہا تھا۔ لڑکی دور دور سے ہی اس کے گرد ایک چکر کاٹ کر دوبارہ سامنے آرکی تھی اور پھر عجیب نگاہوں سے اس کے شوخ بھڑکتے لباس کا جائزہ لینے لگی تھی اور اسی دوران وہ مکمل یقین کر چکی تھی کہ اردگرد جو مسحور کن خوشبو پھیلی ہے وہ اسی عجیب مخلوق کے وجود سے پھوٹ رہی ہے۔ دوسری طرف سگریٹ کے گہرے کش لیتا وہ بغور اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے کے علاوہ سب کچھ گرم چادر میں قید تھا۔
''دور سے نظارے کر کے دل نہیں بھرتا جو دوبارہ یہاں آگئی ہو؟'' ناگوار لہجے میں پہلی بار وہ اس سے مخاطب تھا جو پلکیں جھپکتی اس کے چہرے کو ہی تک رہی تھی۔
''سیدھی طرح نو دو گیارہ ہو جا پیاری۔'' کڑی نظروں سے اسے دیکھتا وہ غرایا تھا۔
''سنو!'' لڑکی بے خوفی سے دو قدم اس کی جانب بڑھی تھی۔ ''کیا تم ''وہ'' ہو؟''
اس کے پرتجسس لہجے سے زیادہ وہ اس کے سوال پر چونکا تھا۔
''وہ کون؟'' اس کے جھڑکنے والے انداز پر جواباً لڑکی کچھ کہتے کہتے رک گئی تھی۔ شاید زبان سے وضاحت کرنے میں وہ تذبذب کا شکار تھی۔ اس لیے اپنے چادر میں چھپے ہاتھ باہر نکال کر اس نے یک لخت اپنی دونوں

ہتھیلیاں دوبار آپس میں ٹکرائی تھیں۔ دوسری جانب وہ ایک پل کے لیے دنگ ہوا تھا مگر دوسرے ہی پل ایک جھٹکے سے سگریٹ پھینکتے ہوئے وہ جارحانہ انداز میں اس لڑکی کی طرف بڑھا تھا مگر لڑکی ہوشیار تھی۔ بروقت سر پٹ وہاں سے بھاگتی چلی گئی تھی۔ بمشکل ضبط کے ساتھ اپنی جگہ رکا وہ خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا جو زنگ آلود گیٹ کے اندر سے جھانک رہی تھی۔ وہ چاہتا تو با آسانی اسے یہیں قابو کر لیتا مگر اسے ضبط کا مظاہرہ کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ لڑکی تو اس کا ایک ہاتھ بھی برداشت کرنے کے قابل دکھائی نہیں دیتی تھی اور پھر وہ اپنے آپ کو بھی کسی مصیبت میں گرفتار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اب بھی گیٹ سے جھانک رہی تھی جب کہ اسے نظر انداز کرتا وہ اس گاڑی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جو قریب آ کر رکی تھی۔



سلائی مشین ایک طرف کرتی وہ تھکے تھکے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شام کے چھ بج رہے تھے۔ دراج کے واپس آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ آتے ہی اسے پہلے کھانا چاہیے ہوتا تھا۔ صبح فیکٹری جاتے ہوئے اس نے رائمہ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ ہرگز زرکاش سے ملنے اوپر والے پورشن میں نہیں جائے گی۔ دراج بہن کی فطرت جانتی تھی۔ اس لیے صبح جاتے جاتے بھی وعدہ یاد دلاتی گئی تھی۔

زرکاش سے ملنے کے لیے کوئی نہ کوئی آ رہا تھا۔ یہ سلسلہ کل شام سے ہی جاری تھا۔ آخر دس سال کے طویل عرصے کے بعد وہ وطن واپس آیا تھا۔ رائمہ سارا دن کمرے میں سلائی میں مصروف رہی تھی۔ لاشعوری طور پر وہ منتظر ہی رہی تھی کہ اوپر سے اسے کوئی بلانے آ جائے یا زرکاش خود ہی تعزیت کے بہانے نیچے آ جائے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ رائمہ کو کسی سے اب اچھائی کی امید نہیں رہی تھی اس لیے زیادہ اس چیز کا اسے دکھ بھی نہیں تھا۔

کل کی دال ایسے ہی رکھی تھی اس میں تھوڑا پانی ڈال کر اس نے ہلکی آنچ پر گرم کرنے کے لیے رکھ دی تھی۔ ابھی وہ آٹا گوندھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی جب اسے اپنے نام کی پکار سنائی دی تھی۔ ایک پل کو تو اسے اپنی سماعتوں پر شک ہوا تھا مگر جب دوبارہ نامانوس آواز کے ساتھ ہی اسے کچن سے باہر دیکھنا پڑا تھا۔ فوری طور پر وہ صحن میں کھڑے شخص کو واقعی نہیں پہچان سکی تھی۔

”رائمہ! کیا پہچانا نہیں مجھے؟“ بھاری گھمبیر لہجے نے رائمہ کے ہاتھ پیر پھلا دیئے تھے۔ بمشکل چہرے پر مسکراہٹ کھینچ کر لائی وہ اس کی جانب بڑھی تھی۔ رائمہ کے سلام کا جواب دیتے ہوئے زرکاش نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ رائمہ کا دل بھر آیا تھا وہ نظر نہیں اٹھا سکی تھی۔

”کیسی ہو تم اور دراج کہاں ہیں؟“ اس کے سوال پر وہ کچھ بول نہیں سکی تھی۔ سر جھکائے وہ بمشکل اپنے آنسو روکنے کی کوشش میں تھی کیونکہ اسے ڈر تھا کہ اگر اوپر سے کسی نے زرکاش کے سامنے اسے آنسو بہاتے دیکھ لیا تو سو باتیں سوچی جائیں گی۔ جن میں سے ایک بھی اچھی نہ ہو گی۔

”حوصلہ رکھو، تم اور دراج میری ذمہ داری ہو، میں ہوں یہاں تم دونوں کے ساتھ۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں یہ مت سوچنا کہ تم تنہا ہو۔ چچا، چچی اور ابو کی جدائی کا غم ہم سب کا غم ہے۔ ہم مل کر یہ سارے غم بانٹیں گے۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں ان تینوں کا آخری دیدار تک نہ کر سکا شاید میں ہی بہت زیادہ گناہ گار ہوں کہ اپنی اتنی پیاری ہستیوں سے دور رہا۔“ شدید مضطرب اور افسردہ لہجے میں وہ بول رہا تھا۔ رائمہ کے کان ترس رہے تھے اپنائیت بھرے چند لفظوں کو سننے کے لیے۔ زرکاش نے سر پہ ہاتھ رکھا تو دل کو ایک ڈھارس سی ملی تھی۔

''بھائی! آپ بیٹھ جائیے۔'' خود کو سنبھالتے ہوئے رائمہ نے تخت کی جانب اشارہ کیا تھا۔
''میں آپ کے لیے چائے لے آئی ہوں پہلے۔''

''نہیں رائمہ! اپنا ہی گھر ہے بعد میں چائے ہی نہیں کھانا بھی کھاؤں گا۔ تم بیٹھ جاؤ۔'' زرکاش نے اسے بیٹھنے کا اشارہ بھی کیا تھا۔ ایک پل کو وہ کچھ تذبذب کا شکار ہوئی تھی مگر پھر تخت کے دوسرے کنارے پر سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

''رائمہ! یہ وقت ان باتوں کے لیے مناسب تو نہیں ہے مگر بہت ساری باتیں مجھ تک پہنچی ہیں لیکن میں نے بس ایک طرف کی باتیں سنی ہیں، اس لیے میں صحیح غلط کے بارے میں نہیں جانتا۔'' زرکاش نے چند لمحوں کا توقف کیا تھا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ دراج نے امی اور شیراز سے بدتمیزی کی تھی؟'' زرکاش نے اس کے جھکے سر کو دیکھا تھا۔

''جی ہاں اس نے ایسا کیا تھا جس کے لیے میں نے تائی امی اور شیراز سے معافی مانگی تھی لیکن آپ کو یہ نہیں پتا ہوگا شاید آپ ان وجوہات سے بھی بے خبر ہوں جن کی بنا پر دراج زبان کھولنے پر مجبور ہوئی تھی۔''

''میں تم سے ان وجوہات کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔'' زرکاش نے درمیان میں کہا تھا۔

''میں زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ یہ سچ ہے کہ آپ سب کے بہت احسانات ہیں ہم پر، جب تک تایا ابو رہے سب کچھ ٹھیک رہا۔ ان کے بعد سب نے ہی قدم پیچھے ہٹا لیے۔ امی دن بدن بیمار ہوتیں بستر سے جا لگیں۔ ان کے علاج معالجے کے لیے مجھے گھر کی ایک ایک چیز فروخت کرنی پڑی تھی۔ آپ خود اندر جا کر چیزیں گن سکتے ہیں۔ یہ تائی امی کا احسان تھا کہ امی کے لیے انہوں نے میرے ہاتھ پر پانچ ہزار روپے رکھے تھے۔ امی دو سال تک بیماری کی حالت میں رہیں۔ پانچ ہزار تو چند دن میں ہی ختم ہو گئے تھے۔ سب کچھ برداشت ہو جاتا ہے مگر اپنوں کی نفرت اور بیزاری نہیں۔ امی کی زندگی میں ہی ہمیں بوجھ قرار دے دیا گیا۔ ہم سے کہہ دیا گیا کہ اس گھر میں اب ہمارا کوئی حصہ نہیں۔ یہ گھر فروخت ہو گیا تو ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا یہ پرواہ کسی کو نہیں۔ دراج سے یہی سب برداشت نہیں ہوا تھا اس گھر میں امی، ابو کی خوشبو ہے۔ یہاں سے ہمیں نکل جانے کا حکم دیا جائے گا تو کیا گزرے گی دل پر یہ محسوس کرنے کا کسی کے پاس وقت نہیں۔'' سر جھکائے وہ لرزتے لہجے میں بولتی چلی گئی تھی۔ دوسری جانب زرکاش بالکل خاموش تھا کیونکہ وہ اپنی ماں کو بہتر جانتا تھا۔ اسے پتا تھا کہ وہ اپنے دیور کے بیوی بچوں سے شروع سے ہی خار کھاتی ہیں۔

''یہ ٹھیک ہے کہ میرا ارادہ تھا اس جگہ سے نکل کر سب کسی اچھے علاقے میں شفٹ ہو جائیں، مجھے یہاں ایک گھر خریدنا ہی تھا مگر میری نیت یہ بالکل نہیں تھی کہ چچی تم اور دراج کو الگ کر دیا جائے۔ میں تم سب کو اس گھر میں شفٹ کرنا چاہتا تھا جو مجھے خریدنا تھا۔ ہر کوئی یہاں الگ الگ باتیں کر رہا ہے مجھے سمجھ نہیں آتا یہاں حالات اتنے کیوں بگڑ گئے ہیں، مجھے معلوم ہے ان حالات میں میرے گھر والوں کا اہم کردار رہا ہوگا۔ تم شاید یقین نہ کرو مگر چچا کے گزر جانے کے بعد میں نے سب سے ہر بار یہی کہا کہ چچی کا خیال رکھیں۔ مجھے ان کی بیماری کی اطلاع ملی تو میں نے تم سے بھی بات کی تھی۔ امی کو بار بار یہی تاکید کی تھی کہ چچی کے علاج میں کوئی کمی نہ چھوڑیں۔ روپوں کی فکر نہ کریں۔ جس وقت جتنی رقم چاہیے مجھے بتائیں۔''

''بھائی! آپ ان الجھنوں میں خود کو پریشان نہ کریں۔ میری ماں اتنی ہی زندگی لے کر آئی تھیں۔ تائی امی نے جتنا کچھ ہمارے لیے کیا وہ بہت ہے۔ ان کے بس میں جتنا تھا انہوں نے کیا۔'' رائمہ نے مدھم لہجے میں کہا تھا۔

''ہاں وہ تو نظر آرہا ہے۔'' زرکاش کا لہجہ سپاٹ تھا۔ رائمہ چپ رہی تھی۔

''بہرحال اس گھر کو فروخت کرنے کا ارادہ میں پہلے ہی ترک کر چکا تھا۔ تمہارے اور میرے باپ نے مل کر اس گھر کو بنایا تھا۔ ہمارے پاس یہ گھر ان کی نشانی ہے۔'' زرکاش کے قطعی لہجے پر وہ شدید بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''اس گھر پر تمہارا اور دراج کا اتنا ہی حق ہے جتنا کہ باقی سب کا ہے۔'' زرکاش نے مزید کہا تھا ''دراج کہاں ہے؟ کیا وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی؟''

''وہ آپ سے کیوں نہیں ملنا چاہے گی؟''

''اس کے گھر آنے کا وقت ہو چکا ہے بس آتی ہی ہوگی۔''

''کہاں گئی ہے وہ؟''

''وہ جاب کرتی ہے ایک فیکٹری میں۔''

''فیکٹری میں جاب؟'' وہ ششدر رہ گیا تھا ''کب سے جاب کر رہی ہے وہ؟''

''تایا ابو کی وفات کے بعد سے ہی۔''

''مگر اس کی پڑھائی؟''

''وہ زیادہ دن کالج نہیں جا سکی۔ گھر کے حالات ایسے تھے کہ اسے یا مجھے گھر سے باہر نکلنا ہی تھا۔ میری سلائی سے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ امی کی دوائیوں کے لیے زیادہ روپے چاہیے تھے پھر تائی امی نے بھی کہہ دیا تھا کہ مہنگائی بہت ہے۔ بجلی، گیس کے بل کے لیے مجھے دو ہزار روپے ان کو بھی ہر ماہ دینے ہوتے ہیں۔''

رائمہ کے اس انکشاف پر وہ سناٹے میں آ گیا تھا۔ اب اسے سمجھ آ رہا تھا کہ اس کی ماں، بہنیں کیوں کل سے اب تک نیچے آنے سے روکتی رہی تھیں۔ اب وہ اپنی غفلت پر شرمسار بیٹھا تھا۔ دس سال پہلے یہاں سے جاتے ہوئے وہ بہت ذمہ دار نہیں تھا مگر پردیس میں وقت کے ساتھ ساتھ اسے رشتوں کی قدر و اہمیت بہت ہو گئی تھی۔ چچا کے بعد باپ کے بھی گزر جانے کے بعد اسے ان کے مقام مل گئے تھے۔ یہ سب اس کی ذمہ داری تھی اور وہ سب کے لیے بہت کچھ اچھا کرنے کے ارادے ساتھ لے کر آیا تھا مگر یہاں سب کچھ ویسا نہیں تھا جیسا اس نے سوچا تھا۔ کچھ بھی کہے بغیر وہ تخت سے اٹھ کر کمرے کی جانب چلا گیا تھا۔ دونوں کمروں کا جائزہ لینے کے بعد اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں۔ کمرے کے باہر رکی رائمہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی جو نظر نہیں ملا پا رہا تھا۔ اس کے تاثرات بے انتہا سنجیدہ تھے۔

''کیا آپ دوبارہ واپس چلے جائیں گے؟'' رائمہ کے سوال پر زرکاش نے اسے دیکھا تھا۔

''نہیں، ابھی یہاں بہت سے کام کرنے ہیں بہت سی ذمہ داریاں پوری کرنی ہیں۔ مزید غفلت برت کر میں کیا چہرہ دکھاؤں گا روز آخرت اپنے باپ اور چچا کو......'' بوجھل لہجے میں بولتا وہ رکا تھا اس کی نظروں کے تعاقب میں پلٹ کر رائمہ نے صحن میں آتی دراج کو دیکھا تھا۔

''یہ دراج ہے، آپ تو اسے پہچان بھی نہیں پا رہے ہوں گے۔'' زرکاش کی حیران نظروں پر رائمہ مسکرائی تھی اور پھر دراج کی طرف بڑھی تھی۔

''بھائی تمہارا پوچھ رہے تھے اور پتا ہے بھائی کہہ رہے ہیں وہ اس گھر کو بالکل فروخت نہیں کریں گے۔

ہمیں اس گھر سے کوئی بے دخل نہیں کر سکتا۔'' رائمہ کے دبے دبے لہجے میں خوشی نمایاں تھی۔ اس کی نم آنکھوں سے نظر ہٹا کر دراج نے پھر اسے دیکھا تھا جو قریب آ گیا تھا۔

''تم اب فیکٹری نہیں جاؤ گی۔ تمہیں پڑھنا ہے۔'' دراج کے چہرے کی معصومیت اور سنجیدگی نے زرکاش کے دل کو جھنجھوڑ دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے باپ اور چچا کے چہرے آ گئے تھے۔

''جو کچھ ہو چکا ہے اور جو غفلت برتی گئی ہے اس کے لیے میں تم دونوں سے معافی مانگتا ہوں۔ میں اب تم دونوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔'' بھنچے لہجے میں زرکاش نے کہا تھا اور خاموشی سے ایک ٹک اپنی جانب دیکھتی دراج کو اس نے سینے سے لگا لیا تھا۔

''جب تک میں زندہ ہوں خود کو یتیم مت سمجھنا، تم دونوں میرا خون ہو۔ شزا اور شذرا سے کسی طور تم دونوں کی اہمیت کم نہیں۔'' بھاری لہجے میں وہ بول رہا تھا مگر دراج کا سارا دھیان اس کے لباس سے پھوٹتی مسحور کن قیمتی پرفیوم کی مہک پر تھا۔ رخسار کے نیچے دبا اس کے گریبان کے نفیس کپڑے کی قیمت کا اندازہ لگانا اس کے لیے مشکل تھا۔ دھیرے سے پیچھے ہٹتے ہوئے اس کی چمک اٹھنے والی تیز نگاہیں زرکاش کے ہاتھ میں موجود رسٹ واچ کا برانڈ پہچان گئی تھیں۔ وہ خواب وخیال میں بھی اس برانڈ ڈ رسٹ واچ کو چھونے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ زرکاش، رائمہ سے کیا کہہ رہا تھا اس نے نہیں سنا تھا، سر جھکائے وہ ان دونوں سے دور ہوتی کمرے میں چلی گئی تھی۔

''رواج شاید مجھ سے بھی ناراض ہے۔'' اس کا خاموشی سے چلے جانا زرکاش نے بہت محسوس کیا تھا۔

''ایسا نہیں ہے دراصل وہ پہلی بار آپ سے اس طرح ملی ہے تو بات کرتے ہوئے شرما رہی ہے ورنہ یہ بہت بولتی ہے۔'' رائمہ شرمندہ ہوتی صفائی دینے لگی تھی۔

''تم اسے سمجھا دینا اسے فیکٹری بالکل نہیں جانا ہے۔'' زرکاش کی تاکید پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''وہ بہت چھوٹی ہے اس کی عمر پڑھنے کی ہے نوکریاں کرنے کی نہیں۔'' وہ مزید بولا تھا تب ہی سیڑھیوں پر آتی شزا نے زرکاش کو پکارا تھا۔

''بھائی! امی بلا رہی ہیں، ماموں کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' بہن کے ناراض لہجے پر وہ رائمہ سے اجازت لیتا سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا تھا۔



گیٹ کھولتے ہوئے ندا خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئی تھیں۔

''حاذق! تم اتنی اچانک یہاں......!''

''بھابی! حاذق نام کی خوشی اچانک ہی آتی ہے اور قسمت والوں کے لیے آتی ہے۔'' شوخی سے بولتے ہوئے اس نے سر جھکایا تھا۔

''جیتے رہو۔'' اس کے سر پر ہاتھ پھیرتیں ندا کھلکھلائی تھیں۔

''میں نے سوچا خود ہی جا کر آپ سے دعائیں لے لوں اور بھائی جان کو ایک بار پھر ترقی مل جانے پر مبارکباد دے دوں۔'' اس کے شرارتی لہجے پر ندا مزید ہنسی تھیں۔

''وہ ابھی بینک سے نہیں آئے۔ تھوڑا انتظار کر لو اور یہ بتاؤ تم اکیلے آ گئے ہو ہم تو یہی سمجھے تھے کسی انگریز دلہن کو ساتھ لاؤ گے۔''

''فکر مت کریں، تنہا آیا ہوں مگر تنہا جاؤں گا نہیں۔'' ان کے ہمراہ گھر کے اندر جاتا وہ بولا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہاری شادی ہو جائے گی تو تایا جان اور تائی جان اس آخری ذمہ داری سے فارغ ہو جائیں گے۔ حاذق! تم ذرا جا کر بیٹھو میں بس دو منٹ میں آتی ہوں۔ رومیل مدرسے سے آنے والا ہے اس کے لیے پراٹھا تیار کر رہی تھی۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی۔"

"ہاں ضرور، آپ اپنا کام کر لیں۔ میری فکر نہ کریں۔" حاذق نے فوراً ہی کہا تھا جب کہ ندا تیز قدموں سے کچن کی طرف چلی گئی تھیں۔

وہ ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا جہاں ملگجا اندھیرا پھیلا تھا۔ دروازے کے ساتھ ہی سوئچ بورڈ پر ہاتھ بڑھا کر اس نے لائٹس آن کر دی تھیں۔ بے خیالی میں صوفوں کی جانب بڑھتا وہ ٹھٹک کر رکا تھا۔ آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں۔ آف وہائٹ لبادے میں نمایاں ہوتا اس کا دودھیا وجود سرخ کارپٹ پر بے سدھ نظر آ رہا تھا۔ سرخ رنگ کے فلور کشن پر اس کے ریشمی چمکتے بال بکھرے ہوئے کچھ شریر لٹیں اس کی گردن سے لپٹی تھیں اور کچھ شانے پر اور اس کا خوابیدہ چہرہ...... حاذق پلکیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ دل کی دنیا درہم برہم ہوتی چلی جا رہی تھی۔ لانبی گھنی پلکوں پر اس کا دل ٹھہر گیا تھا۔ گلابی چہرے کی شفاف جلد پر اس خواب کا سحر چمک رہا تھا جو گھنی پلکوں تلے گزر رہا تھا۔ نازک سی کھڑی ناک کے نیچے ترشے لب گلاب کی نازک پنکھڑیوں جیسے کھلے تھے، گہری سانسوں کے زیر و بم حاذق کی سانسوں کو روک گئے تھے۔ وہ اس حسین ساحرہ کے سحر میں قید ہوتا جا رہا تھا جو اپنے آپ سے بھی غافل تھی۔ قدم قدم پر اس نے حسین چہرے دیکھے تھے مگر یہ چہرہ اس کے جسم و جان کو اپنے طلسم میں جکڑ گیا تھا۔ اس کے نازک وجود میں پورے چاند کی چاندنی گھلی ہوئی تھی۔ سنگِ مرمر جیسے حسین تراشے وجود کے پیچ و خم دنیا سے غافل کر رہے تھے۔ اسے چھونے کی محسوس کرنے کی خواہش شدت سے دل میں جاگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ رہے سہے حواس بھی کھو بیٹھتا ندا کی تیز آواز نے اس پر طاری سحر کو توڑ دیا تھا۔

"رجاب! اٹھو یہاں سے، جہاں دل چاہتا ہے پڑ کر سو جاتی ہو۔ اٹھو فوراً......!" غصے کو بمشکل روکنے کے باوجود انہوں نے انتہائی سخت لہجے میں رجاب کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ عجلت میں انہوں نے رجاب کو نیند سے ٹھیک طرح بیدار ہونے کا موقع بھی نہیں دیا تھا۔ وہ نیند میں ڈول رہی تھی۔ جب ندا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔ حاذق کی آنکھیں اس پر ساکت تھیں۔ جس کی نیم وا سبز آنکھیں بس ایک لمحے کے لیے حاذق کی جانب اٹھی تھیں۔ سوئی سوئی آنکھوں کے گلابی ڈورے حاذق کا دل سینے سے کھینچ لے گئے تھے۔ وہ ٹھیک طرح اس کے سحر سے آزاد بھی نہیں ہو پایا تھا باوجود اس کے کہ ندا اسے ڈرائنگ روم سے لے جا چکی تھیں۔ وہ اپنے حواسوں میں ہوتا تو یقیناً سمجھ جاتا کہ ندا اسے رجاب کے پاس یوں کھڑا دیکھ کر شدید ناگواری میں مبتلا ہوئی ہیں۔

"معاف کرنا حاذق! مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ بے وقوف لڑکی اپنے کمرے سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئی ہے ورنہ میں پہلے ہی اسے جگا دیتی۔" کچھ دیر بعد ڈرائنگ روم میں آتیں ندا نے نہ چاہتے ہوئے بھی معذرت کی تھی مگر حاذق نے جیسے سنا ہی نہ تھا۔

"بھابی! یہ رجاب پانچ سال میں اتنی بڑی ہو گئی ہے۔ میں بالکل بھی اسے پہچان نہیں سکا۔" حاذق کو اپنی ہی آواز اجنبی لگی تھی۔

"لڑکیوں کا پتا ہی کہاں چلتا ہے۔ اچانک ہی قد نکال لیتی ہیں۔" زبردستی مسکراہٹ چہرے پر لا کر ندا ٹالنے والے انداز میں بولی تھیں اور پھر فوراً ہی باتوں کا رخ بدل دیا تھا۔ کچھ دیر بعد راسب بھی آ گئے تھے۔ ان سے باتیں کرتا وہ بالکل غائب دماغ تھا۔ آنکھیں بس دوبارہ اسے سامنے دیکھنے کی منتظر تھیں۔ شدت سے وہ

پھر اس کے دیدار کا منتظر تھا۔ جانے کا دور چل رہا تھا۔ جب اس کے بے چین دل کی خواہش پوری ہوئی۔ ڈرائنگ روم میں وہ جھجکتی ہوئی داخل ہوئی تھی۔ شرمیلی سی مسکان لبوں پر سجائے اس نے حاذق کو سلام کیا تھا اور ندا کے پہلو میں جا چھپی تھی۔ حاذق کے تو دل پر ایک بار پھر قیامت گزر گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے اس کے تو بہ شکن جلوے حواس گم کر گئے تھے مگر اب...... ہلکے آسمانی رنگ کے لباس میں سر پر سلیقے سے دوپٹہ جمائے جھکی نظروں سے سامنے آئی وہ جنت کی حور لگ رہی تھی۔ اس کی آواز سماعتوں میں رس گھول گئی تھی۔ حاذق کے لیے بہت مشکل تھا اس کے چہرے سے نظر ہٹانا یا اس سے لاتعلق رہنا، اس کی جھجک اور حیا کو محسوس کرنے کے باوجود وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا سو راسب اور ندا سے باتوں کے دوران وہ اسے بھی مخاطب کرتا رہا تھا۔ اس کی اسٹڈیز کے حوالے سے چھوٹے چھوٹے سے سوال، جس کے جواب وہ بہت مختصراً اور جھینپے انداز میں دیتی اس کی کیفیات اور جذبات سے قطعی انجان اور بے نیاز تھی۔

☆......☆

آج رات بھی سردی کڑاکے کی تھی مگر پتا نہیں وہ کس مٹی سے بنا تھا، سرد ہواؤں سے بے نیاز معمول کی طرح پول سے پشت لگائے اطمینان سے کھڑا تھا۔

سگریٹ کا آخری کش لے کر بجا سگریٹ کا ٹکڑا پھینکتے ہوئے اس کی نظر سڑک کی طرف اٹھی تھی اور اگلے ہی پل ناگواری سے اس کی ابرو تن گئی تھیں۔ دوسری جانب کچھ فاصلے پر رکتی لڑکی احتیاطاً اس کے تیوروں کا اندازہ لگاتی رہی تھی اور پھر ہاتھ میں موجود ایک تہہ گرم چادر اس کی جانب بڑھا دی تھی۔

"یہ چادر لے لو، بہت سردی ہو رہی ہے۔" لڑکی کے نرم لہجے نے اسے ایک پل کے لیے حیران کیا تھا۔

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔" اگلے ہی پل وہ اکھڑے انداز میں بولا تھا۔

"کیوں؟ کیا تم انسان نہیں ہو؟"

"نہیں۔" وہ اتنا ہی بولا تھا۔

"مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔" لڑکی بے اختیار بول گئی تھی۔

"تم یہاں سے جاتی ہو یا نہیں؟" وہ بگڑے تیوروں سے بولا تھا۔ لڑکی چند لمحوں تک خاموشی سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"وہ کون لوگ ہوتے ہیں جو گاڑی میں آتے ہیں؟ تم ان کے ساتھ روز کہاں جاتے ہو؟"

"جہنم میں جاتا ہوں۔ تم ہوتی کون ہو مجھ سے یہ پوچھنے والی؟" وہ غرایا تھا۔

"کوئی نہیں۔" اس کے لباس کا دلچسپی سے جائزہ لیتی وہ سرسری لہجے میں بولی تھی۔

دوسری جانب وہ کچھ کہتے کہتے رک کر سڑک کی جانب متوجہ ہوا تھا جہاں سے ایک مریل سا شخص اسی جانب چلا آ رہا تھا۔

"آ گیا میرا خون چوسنے۔" لڑکی کے زہریلے لہجے پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا تھا مگر لڑکی اس شخص کو ہی گھور رہی تھی جس نے جھپٹنے والے انداز میں لڑکی کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"چھوڑ مجھے۔" لڑکی چیخی تھی۔

"گھر چل...... پیسے نکال کر دے مجھے کہاں چھپا کر رکھے ہیں۔" سرخ آنکھوں والا مریل شخص اسے ساتھ کھینچ لے جانا چاہتا تھا مگر لڑکی ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا چکی تھی۔

''نہیں ہے میرے پاس پیسے، کتنی دولت تو نے کما کر میرے ہاتھ پر رکھی ہے جسے چھپا کر رکھوں گی؟''

''جھوٹ بولتی ہے ـــــ عیار ـــــ!'' دھاڑتے ہوئے اس شخص نے لڑکی کو ایک تھپڑ بھی رسید کیا تھا۔

''میں عیار ہوں اور تو کون ہے؟ پہلے یہ تو معلوم کر، مرد ہے تو جا کر سڑکیں کھود، محنت مزدوری کر اور اگر مرد نہیں ہے تو ناچ کر، تالیاں پیٹ کر روپے کما۔'' لڑکی حلق کے بل چیخی تھی جس پر مریل شخص شدید اشتعال میں آ گیا تھا۔ مغلظات بکتے ہوئے اس نے لڑکی پر تھپڑوں اور لاتوں کی بارش کر دی تھی۔ دوسری طرف وہ جو پول سے ٹیک لگائے کھڑا تھا، بڑے اطمینان اور دلچسپی سے یہ مناظر دیکھتا نئی سگریٹ سلگا چکا تھا۔

مریل شخص اگر تابڑ توڑ تھپڑوں اور ٹھوکروں کی برسات کر رہا تھا تو لڑکی بھی مزاحمت کی پوری کوشش میں تھی مگر دوسری بار جب وہ زمین پر گری تو دوبارہ قدموں پر اٹھنے کا اسے موقع نہیں ملا تھا۔

''تو صرف یہی زبان سمجھتی ہے۔ دیکھتا ہوں کیسے مجھے روپے نہیں دے گی۔ چل ابھی میرے ساتھ۔'' مریل سے شخص کا سارا دم خم اس کی آواز میں ہی تھا سو دھاڑتے ہوئے وہ اس لڑکی کو گھسیٹ لے جانے کی کوشش میں تھا۔

''تو کون سی شرافت کی زبان سمجھتا ہے۔ مجھے بھی تیری اسی ماں نے جنم دیا ہے جسے صدمے دے دے کر تو نے کسی قابل نہیں چھوڑا اور اب میں بھگت رہی ہوں تجھے۔ تو مر کیوں نہیں جاتا۔'' لڑکی چلاتے ہوئے دوبارہ اس شخص کو بھڑکا گئی تھی۔ وہ پل پڑا تھا لڑکی پر۔ اس بار لڑکی نے اپنے بچاؤ کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ بس کراہتے ہوئے لاتیں، ٹھوکریں، مکے برداشت کرتی رہی تھی، کچھ دیر بعد ہی وہ مرنجان مرنج شخص تھک کر رکا اور بری طرح ہانپنے لگا تھا مگر سرخ ابلتی آنکھوں سے اسے گھور رہا تھا جو چہرہ ہاتھوں میں چھپائے زمین پر گٹھڑی بنی پڑی تھی۔

''میں پیسے لے کر جاؤں گا۔ چل میرے ساتھ۔'' وہ شخص پھولی سانسوں کے درمیان چیخا تھا۔ ''تو ایسے نہیں مانے گی۔'' لڑکی کی ڈھٹائی پر اس نے تلملا کر پیر سے چپل نکالی تھی۔

''چھوڑ دے اسے۔'' مداخلت کرتی اس آواز پر اس شخص نے رک کر پول کی طرف دیکھا تھا۔ ''یہ مر گئی تو سیدھا جیل جائے گا، وہاں اتنی آسانی سے نشے کی پڑیا نہیں ملنے والی۔ دو دن میں ہی ایڑیاں رگڑتا مر جائے گا۔'' اس تماشے سے وہ اکتا چکا تھا شاید اس لیے مداخلت کرتا اس شخص کو مشورہ دے دیا تھا۔

''تو کون ہے؟ کیا آشنا ہے اس کا؟'' وہ شخص بھڑک کر اس کی طرف بڑھا تھا۔

''میں کیا کہوں، سامنے پڑی ہے خود ہی پوچھ لے اس سے۔'' بے نیازی سے بولتا وہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تھا اور اگلے ہی پل سرعت سے اپنی جگہ سے ہٹا تھا اور بروقت ہٹا تھا کہ لڑکی کا پھینکا گیا پتھر زوردار طریقے سے پول سے ٹکرایا تھا۔ وہ بری طرح دنگ رہ گیا تھا جبکہ لڑکی خونخوار نظروں سے اسے دیکھتی دوسرا پتھر اٹھا رہی تھی۔

''اے رک......'' بلند آواز میں وہ اسے روک گیا تھا۔ ''یہ پتھر اپنے اس نشئی کو مار مجھے اگر مارا تو ہاتھ توڑ دوں گا۔ واپس وہیں رکھ پتھر......!'' اس کی کرخت انداز پر لڑکی پتھر ایک طرف ڈالتی مریل نشئی کو گھورنے لگی تھی۔

''آخری بار کہہ رہا ہوں اب روپے میرے حوالے کر دے ورنہ یہیں گڑھا کھود کر دفن کر دوں گا تجھے۔'' مریل آدمی کو پھر دورہ اٹھا تھا۔ جواباً وہ کچھ بھی بولے بغیر گھٹنوں میں چہرہ چھپا گئی تھی۔

''ڈرامہ کرتی ہے میرے سامنے۔''

(جاری ہے)

مکمل ناول

جنونِ عشق

عورت کیا ہے؟ یہ سوال بہت مرتبہ پوچھا جاتا ہے اور دھڑلے سے اس سوال کا جواب دیا جاتا ہے کہ عورت وفا کی مورت ہے، پیار ومحبت کی گندھی مٹی ہے، صبر کی دیوی ہے۔ مگر جب یہ پوچھا جائے کہ معاشرے میں



عورت کا کیا مقام ہے تو ہر طرف سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں اور بس سوال پوچھنے والے کی طرف گھور گھور دیکھا جاتا ہے جیسے اس نے بہت عجیب و غریب نہ سمجھ میں آنے والا سوال پوچھ لیا ہو۔ یعنی اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں ہے۔ سوال پوچھنے والے کو لوگ پاگل سودائی سمجھتے ہیں۔ ہونہہ عورت کا مقام' یہ کیسا' سوال ہے اور دوسری بات کیا مرد عورت سے ایک جیسا انصاف کر پاتے ہیں؟ کیا بیوی کو ماں، بہن، بیٹی جیسا انصاف مل پاتا ہے۔ اس سوال کا جواب بس ایسا ہی ہے کہ جیسے ایک بہت بڑے ویران صحرا میں ایک سوئی گر کر کہیں گم ہو جائے اور اس کے ملنے کا پتہ کیا نام و نشان تک نہ رہے۔ عورت آج بھی مقام کی تلاش میں ہے انصاف کی تلاش میں ہے کہ شاید مل جائے۔

☆..........☆..........☆

''مے آئی کم ان سر؟'' اس نے ہلکے سے دروازہ کھول کر اندر آنے کی اجازت مانگی تھی۔

''یس کم ان''۔ وہ ہلکے ہلکے قدم اٹھاتی اس شاندار شخصیت کے مقابل کھڑی ہوگئی۔ اب کے شاندار شخصیت



نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا۔
''جی مس رطابہ! فرمائیں کیسے آنا ہوا؟'' اس شاندار شخصیت کے حامل شخص نے جواباً پوچھا تھا۔ وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔
''سر! فرقان انڈسٹری کی فائل مکمل ہو چکی ہے، آپ دیکھ لیں تا کہ پھر ان کو بھجوائی جا سکے''۔ اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ یہی اعتماد تو اس کا خاصا تھا۔
''ہوں... ٹھیک ہے میں کرلوں گا''۔ شاندار شخصیت نے مصروف سے انداز میں کہا تھا۔
''ٹھیک ہے سر!'' اس نے فائل اس کی جانب بڑھائی جسے اُس نے مسکرا کر تھام لیا تھا۔
''اور کچھ؟'' وہ دوبارہ مسکرایا۔
''نہیں سر!'' کہہ کر وہ بیرونی دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ شاندار شخصیت پھر کسی کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے یکدم پیچھے مڑ کر دیکھا، ایسا کرتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھوں میں بلا کی وحشت اور سفا کی تھی۔

☆..........☆..........☆

وہ آفس سے آئی ہی تھی کہ آگے اس کی روم میٹ عیشاء نے اس کو آنے والے فون کے بارے میں بتایا تھا۔
''کیا کہہ رہی تھیں اماں؟'' اس نے ہینڈ بیگ بیڈ پر پھینکا اور واش روم میں گھس گئی تھی۔
''یہی کہ رُطابہ آئے تو اسے کہنا فون کرلے''۔ وہ فریش ہو کر باہر نکلی تو عیشاء نے بتایا۔
''اچھا کرلوں گی''۔ وہ بولی۔
''اب جلدی سے آؤ، پیزا برف ہو جائے گا''۔ عیشاء نے مائیکرو سے پیزا نکال کر ٹرے میں سجایا اور بوتل گلاس لئے روم ریفریجریٹر کی جانب بڑھ گئی۔
''آج پھر فاسٹ فوڈ''۔ رطابہ نے بیزار دیکھ کر منہ چڑھایا تھا۔ عیشاء نے جواباً اسے غصے سے دیکھا۔
''ہاں یہاں نوکروں کی فوج ہے ناں جو گھر کے کھانے پکانے میں ہمہ وقت تیار رہتی ہے، کھانا ہے تو کھاؤ ورنہ کسی دیسی ہوٹل میں چلی جاؤ''۔ یہ کہہ کر عیشاء نے بے فکری سے پیزا کا پہلا پیس اٹھایا اور کھانے لگی جبکہ رطابہ نے بھی برے برے منہ بناتے یہی کام سرانجام دیا تھا۔

☆..........☆..........☆

''السلام علیکم اماں! کیسی ہیں آپ؟'' فون کی دوسری جانب اماں تھیں۔
''وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں میں نے پہلے فون کیا تھا تو تمہاری کوئی دوست کہہ رہی تھی کہ آفس گئی ہے''۔ اماں نے اسے پچھلے فون کی بابت آگاہ کیا تھا۔
''جی عیشاء نے بتایا تھا''۔ وہ بولی۔
''رُطابہ! تم واپس آ جاؤ، چھوڑ دو وہ سب میں بھلا چکی ہوں تم بھی بھلا دو، آ جاؤ رطابہ''۔ اماں نے بے بسی سے کہا۔
''اماں! اس بات کے علاوہ کوئی اور بات کریں''۔ اس نے بات کو ٹالا۔
''رطابہ! تم کیوں نہیں سمجھتی''۔ اماں نے اسے قائل کرنے کی ایک مرتبہ پھر کوشش کی تھی۔
''میں نہیں سمجھوں گی، میری اتنے برس کی محنت پر پانی پھر جائے، قطعی نہیں، میں اس شخص کو برباد کر دوں

گی''۔ اس کے ارادے جان کر اماں کا دل کمزور پتے کی طرح لرز اٹھا تھا۔

''میں نے معاف کر دیا، تم بھی معاف کر دو''۔

''میں ہرگز معاف نہیں کروں گی، آئندہ آپ اس حوالے سے کوئی بات مت کیجئے گا''۔ اس کا ارادہ اٹل تھا، اماں جان چکی تھیں۔ انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے فون کاٹ دیا تھا۔

''اماں! میں اس شخص کو کہیں کا نہیں چھوڑوں گی''۔ یہ کہتے ہوئے اس کا خوبصورت چہرہ کوئلے کی طرح سیاہ اور ہیبت ناک ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

پورے گاؤں میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی کہ دتا کمہار کی بیٹی کا رشتہ رحیم چوہدری نے اپنے بیٹے کے لئے مانگا ہے، دتا کمہار کے لئے تو یہ بڑی خوش نصیبی والی بات تھی کہ بیٹھے بٹھائے اس کی بیٹی کی قسمت کھل گئی تھی۔ وہ ذات کا کمہار اور بیٹی کا رشتہ چوہدریوں میں، بڑی بات تھی۔ مہرو تو یہ سب جان کر ساکت بیٹھی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی اس رشتے کا مقصد کو اور رحیم چوہدری کو۔ ہوا دراصل یوں تھا کہ مہرو اپنی چند سہیلیوں کے ساتھ کنوئیں پر پانی بھرنے گئی تھی اور وہاں آفاق چوہدری اپنے چند غنڈوں کے ساتھ آ دھمکا تھا اور اس کی سہیلیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے لگا تھا۔ مہرو کی سہیلیاں تو ڈر کے مارے خاموش ہو گئی تھیں لیکن مہرو نے خوب شور مچایا تھا۔ شور مچانے پر آفاق اور اس کے غنڈے فوراً رفوچکر ہو گئے تھے لیکن جاتے جاتے آفاق چوہدری اسے دھمکا گیا تھا کہ وہ اسے کہیں کا نہیں چھوڑے گا اور اس کا عملی ثبوت وہ رشتے کی صورت میں دے چکا تھا۔ مہرو تو آنے والے حالات کے بارے میں سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی۔ پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا ہونا تھا۔ آفاق چوہدری کے عزائم خطرناک ہی لگ رہے تھے۔ یہ سوچیں اسے لرزا دیتی تھیں۔

☆......☆......☆

''جی سر! او کے میں آتی ہوں''۔ وہ اپنے کیبن میں بیٹھی کسی فائل پر کام کر رہی تھی جب شاندار شخصیت کے حامل شخص نے اسے اپنے آفس آنے کو کہا تھا۔ اپنا کام نمٹا کر اگلے دو منٹ میں وہ آفس میں موجود تھی۔

''آیئے مس رطابہ، بیٹھئے''۔ شاندار شخصیت نے سامنے لگی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

''جی سر! کوئی کام تھا''۔ اس نے بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

''صرف کام نہیں، بہت ضروری کام مس رطابہ''۔ وہ زیر لب مسکرایا تھا۔

''جی سر کہیے''۔ وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

''مس رطابہ! میں نے آپ کو اپنے آفس میں صرف آپ کی تعلیمی قابلیت کی بنا پر نہیں رکھا بلکہ آپ کا اعتماد، محنت، لگن ان سب چیزوں نے مجھے inspire کیا ہے اور یہی چیزیں کسی کاروبار کو چلانے میں اہم ہوتی ہیں''۔ وہ جواباً بولا تھا۔

''جی سر! میں سمجھتی ہوں''۔ اس نے کہا۔

''اور آج میں نے آپ کو اسی سلسلے میں بلایا ہے''۔ ''کیا مطلب سر میں سمجھی نہیں''۔ وہ گویا ہوئی۔

''ہماری کمپنی کو ایک بہت بڑا Project ملا ہے اور میں چاہتا ہوں اسے آپ ہینڈل کریں''۔ شاندار شخصیت نے جس کام کے لئے اسے بلایا تھا اس کی بابت آگاہ کیا تھا۔

''پر سر میں کیسے ....؟'' وہ ہڑبڑا کر بولی تھی۔

''دیکھیے مس رطابہ! ایک بہت بڑا پروجیکٹ ہے اگر اسے ہماری کمپنی نے کرلیا تو شہرت کی بلندیوں پر اور اگر نا کام رہے تو ایک دم Letdown ہو جائیں گے کیونکہ میں اس پروجیکٹ میں اپنا سارا سرمایہ لگا چکا ہوں'' ۔اب کے اس نے پوری بات تفصیلاً بیان کی تھی۔

''سر! یہ تو بہت بڑی ذمہ داری آپ مجھے سونپ رہے ہیں''۔

''ہاں مجھے پتہ ہے'' ۔وہ دلکشی سے مسکرایا تھا۔

''ٹھیک ہے سر! میں پوری کوشش کروں گی'' ۔وہ بھی جواباً پراسراری مسکراہٹ لبوں پر سجائے بولی تھی۔

☆............☆............☆

مہر دنہ کچھ کہہ سکتی تھی نہ کرسکتی تھی۔ وہ پوری طرح آفاق چوہدری کے شکنجے میں جکڑ چکی تھی۔ اس لئے بس فقط خاموشی اختیار کرلی تھی، گہری جامد خاموشی۔ بس اسے اتنا بتایا گیا تھا کہ اس دن اس کی شادی ہے وہ تیار رہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے باپ اور چوہدری رحیم کے مابین کیا معاہدے ہوئے تھے۔ اس کے باپ نے کتنے پیسے اس کے عوض لئے تھے۔ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس اسے صرف اتنا پتہ تھا کہ اسے آگ کے دریا میں اتارا جارہا ہے اور چوہدری رحیم اور اس کا باپ اسے اتارنے میں پیش پیش ہیں۔

☆............☆............☆

شام کا وقت تھا۔ آفس کا اسٹاف آہستہ آہستہ گھر کی جانب رواں دواں تھا کیونکہ ورکنگ آورز کلوز ہو چکے تھے اس لئے لوگ اپنے اپنے کام نمٹا کر تقریباً آفس سے نکل ہی چکے تھے لیکن وہ ابھی تک اپنے کیبن میں موجود تھی، گارڈ نے ایک دو دفعہ اس کے کیبن میں جھانکا لیکن اسے کام میں مصروف دیکھ کر واپس پلٹ گیا تھا کیونکہ رطابہ جاتی تو آفس بند ہوتا اس لئے گارڈ نا چاہتے ہوئے بھی انتظار کرنے پر مجبور تھا اور وہ کیبن میں کیوں موجود تھی اس کا راز بھی جلد کھل گیا تھا۔

''ہیلو جی مسٹر رضا! کیسے ہیں آپ؟'' فون کی پہلی گھنٹی پر ہی اس نے فون اٹھالیا تھا جیسے وہ اسی کام کے لئے محوانتظار تھی۔

''میں ٹھیک ہوں مس رطابہ! سوری کسی کام میں بزی تھا اس لئے تھوڑا لیٹ ہوگیا'' ۔اس کا اشارہ فون کی جانب تھا۔

''Its ok مسٹر رضا! کوئی بات نہیں'' ۔وہ دھیمے سے مسکرائی تھی۔

''مس رطابہ! یہ کام کافی رسکی ہے سوچ لیں'' ۔مسٹر رضا اصل بات کی جانب پلٹا تھا۔ وہ یہ سن کر ہنسی تھی۔

''مسٹر رضا! رسکی کام کا اپنا ہی مزہ ہے'' ۔اس کا لہجہ لاپرواہی لئے ہوئے تھا۔

''پر مس رطابہ ....'' مسٹر رضا جواباً بولا تھا۔

''مسٹر رضا! سوچ لیں پورا پورا Profit ملے گا اور وہ شیئرز بھی گھاٹے کا سودا تو نہیں ہے'' اس نے ترپ کا پہلا پتا پھینکا تھا۔

''وہ تو ہے پر مس رطابہ! آپ ایسا کیوں چاہتی ہیں؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''مسٹر رضا! آپ آم کھائیں، پیڑ مت گنیں، کچھ باتیں سیکرٹ میں رہتی ہیں'' ۔وہ بولی تھی۔ پھر چند ضروری باتوں کے بعد فون ڈسکنیکٹ ہوگیا تھا۔

وہ آفس سے نکل آئی تھی۔ گارڈ نے اس کے جانے پر فوراً آفس بند کیا تھا کیونکہ اسے بھی گھر جانے کی جلدی تھی۔

☆............☆............☆

''اری او مہرو، نی مہرو''۔ ابا نے گھر میں داخل ہوتے ہی اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ وہ آوازیں سن کر باہر نکل آئی تھی۔

''جی ابا!'' وہ مودب سی بولی۔

''یہ دیکھ، چوہدری صاحب نے چیزیں بھجوائی ہیں تیرے لئے''۔ ابا نے بڑا سا شاپر اسے دکھایا جس میں ضرورت کی تمام چیزیں تھیں لیکن اس کا اشتیاق مدہم تھا۔ اس نے بے دلی سے شاپر تھام لیا۔

''ارے صحیح سے پکڑ نا، قیمتی چیزیں ہیں کہیں ٹوٹ نہ جائیں''۔ ابا نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا تھا۔

''ابا! انسانوں سے قیمتی کوئی شے نہیں جب ان کی کوئی اوقات نہیں تو پھر ان بے جان چیزوں کی کیا اوقات، انسانوں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں پھر اگر یہ ٹوٹ جائیں گی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا''۔ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ اگر رک جاتی تو آنسو اپنی بے وقعتی پر چیخ و پکار کرتے۔ ابا نے آنکھیں گھما کر اسے دیکھا تھا جیسے اس کی ذہنی حالت کو مشکوک سمجھ رہے ہوں۔

''جھلی نہ ہو تو''۔ دتا کمہار نے بڑے بے ڈھنگے انداز سے قہقہہ لگایا تھا۔

اس نے کمرے میں آتے ہی شاپر زور سے چارپائی پر پھینکا۔ رنگ برنگی چیزیں شاپر سے نکل کر بڑی دور دور تک پھیلی تھیں اور آنسو ہاں آنسو بھی بڑی دور تک پھیلے تھے۔

☆............☆............☆

وہ آج معمول سے پہلے ہی آفس آ گئی تھی، آفس نو بجے کھلتا تھا اس لئے ابھی کافی ٹائم تھا، آفس میں اکا دکا ہی اسٹاف موجود تھا کیونکہ کچھ لوگوں کی کام کے حساب سے صبح کی ڈیوٹی تھی اس لئے وہ سب صبح صبح ہی آ جاتے تھے۔ وہ بنا ادھر ادھر دیکھے سیدھی اپنے کیبن کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اسے آج دو اہم کام نمٹانے تھے جس کے لئے اس کی کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔

☆............☆............☆

وہ مہربانو سے آج مہر آفاق بن گئی تھی۔ اس کا صرف نام ہی تبدیل نہیں ہوا تھا پوری شخصیت ہی بدل گئی تھی، آفاق کی طرف سے صرف وہ اور اس کی ماں شہلا چوہدری نے ہی بارات میں شمولیت اختیار کی تھی۔ رحیم چوہدری نے کسی ضروری کام کا بہانہ کر کے آنے سے معذرت کر لی تھی۔ غریبوں کی بیٹی بارات کے بغیر بھی آ جاتی تو کوئی نہ پوچھتا، یہ سب تو امیروں کا وطیرہ ہے۔ حسب نسب کی ہوا غریبوں کو چھو کر بھی نہیں گزری۔ یہ امیر اس کے ہنڈولے میں جھولتے رہتے ہیں۔ مہرو کسی روبوٹ کی طرح بیٹھی تھی بالکل ساکت پر جب کسی نے چابی گھمائی تو حرکت شروع ہو گئی۔ نکاح سے رخصتی تک وہ کسی روبوٹ کی طرح ہی حرکت کرتی رہی جس کی چابی پہلے دتا کمہار کے لیکن اب آفاق چوہدری کے ہاتھ لگ چکی تھی۔

☆............☆............☆

''السلام علیکم مسٹر رضا!'' فون اٹھانے پر اس نے کہا تھا۔

''وعلیکم السلام مس رطابہ! جی کہیے کیسے یاد کیا''۔ مسٹر رضا نے پیشہ وارانہ انداز اپناتے پوچھا تھا۔

''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں'' ۔وہ جواباً بولی۔
''کب، کہاں؟'' مسٹر رضا نے پوچھا تھا۔
''فائیو اسٹار ہوٹل آج شام پانچ بجے'' ۔اس نے جگہ اور وقت ایک ساتھ بتایا۔
''جی ٹھیک ہے میں پہنچ جاؤں گا''۔
''پر مکمل راز داری سے آیئے گا کسی کو بھی بھنک نہیں پڑنی چاہئے'' ۔اس نے یاددہانی کرائی تھی۔
''آپ فکر نہ کیجئے کسی کو کچھ علم نہ ہوگا'' ۔مسٹر رضا نے یقین دلاتے ہوئے کہا تھا۔
''او کے اللہ حافظ'' ۔اس نے فون ڈسکنیکٹ کر دیا تھا۔وہ اپنے پہلے اہم کام کا آغاز شروع کر چکی تھی۔اس کے لبوں پر پراسراری مسکراہٹ نے احاطہ کر لیا تھا۔

☆..........☆..........☆

حویلی میں مہرو کا کوئی استقبال نہ کیا گیا تھا، شہلا چوہدری ملازمہ کو ہدایت دیتی چلی بنی تھیں جبکہ وہ ایک جگہ سرخ چادر میں لپٹی سمٹی سمٹائی سی کھڑی تھی۔
''چلو اندر کسی نے پھولوں سے استقبال نہیں کرنا'' ۔ملازمہ نے کرخت لہجے میں کہہ کر اس کا بازو کھینچا تھا۔وہ اس حملے کے لئے تیار نہ تھی اسی لئے بڑے زور سے لڑکھڑائی تھی۔
''ابھی اتنے سے جھٹکے سے لڑکھڑا گئی ہے آگے تو ابھی بڑا کچھ سہنا ہے، تیار کر لے اپنے آپ کو'' ۔ملازمہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔اس کی چپ اب بھی نہ ٹوٹی تھی۔

☆..........☆..........☆

''مس رطابہ! آج آپ کو میرے ساتھ مسٹر واسطی کے ہاں چلنا ہے، تیار رہیے گا'' ۔شاندار شخصیت نے اسے آگاہ کیا تھا۔
''کیا سر؟'' وہ گڑبڑا گئی۔
''کیوں کیا ہوا مس رطابہ؟'' شاندار شخصیت نے بغیر کسی تاثر کے اس سے پوچھا تھا۔
''کچھ نہیں سر! میں تیار رہوں گی'' وہ سنبھل گئی تھی۔
''مس رطابہ! اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتایئے''۔
''نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں، وہ دراصل مجھے پرسنل کام سے کہیں جانا تھا''۔
''ہماری میٹنگ پانچ بجے ہے، ابھی کافی ٹائم ہے آپ اپنا کام کر سکتی ہیں'' ۔وہ بری طرح پھنس گئی تھی۔
''جی سر!'' وہ اثبات میں ہی سر ہلا سکی تھی۔
''ٹھیک ہے آپ جا سکتی ہیں'' ۔وہ جواباً سوچوں میں ڈوبی باہر نکل آئی تھی۔

☆..........☆..........☆

اپنے کیبن میں جا کر فوراً مسٹر رضا کو فون ملایا تھا۔
''مسٹر رضا! تھوڑی گڑبڑ ہو گئی ہے، آپ ایسا کیجئے چار بجے آجائیں''۔
''پر مس رطابہ پانچ...'' رضا جواباً بولا۔
''بس کچھ پرابلم ہو گئی ہے آپ آجایئے گا'' ۔یہ کہہ کر اس نے فون فوراً کاٹ دیا تھا۔
''کہاں تک بچو گے میرا شکنجہ تمہارے تعاقب میں ہے'' ۔وہ زہریلی ہنسی ہنس رہی تھی جس کے زہر نے

اس کا چہرہ تک نیلا کر دیا تھا۔



اسے آفاق کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا، وہ ابھی تک حیران تھی کہ چوہدری خاندان کی اتنی عنایتیں اس پر، دتا کمہار کی بیٹی پر، کچھ تو گڑبڑ تھی۔ ورنہ رحیم چوہدری اتنا اچھائی کا ڈرامہ نہ رچاتا۔ پر کچھ تو تھا جو مہرو سے چھپا تھا۔
دراصل ہوا یوں تھا کہ آفاق چوہدری ڈرگ کے دھندے میں ملوث تھا۔ جس دن مہرو کی سہیلیوں سے اس کے غنڈوں نے چھیڑ چھاڑ کی تھی اس دن آفاق چوہدری اپنی اسی جیب میں وافر مقدار میں ڈرگز لے کر آیا تھا۔ آفاق اور غنڈوں نے جب اس کی سہیلیوں کے ساتھ بدتمیزی کی مہرو اس جیپ کے پیچھے بھاگی تھی اور شور مچانا شروع کر دیا تھا حالانکہ وہ قطعی انجان تھی کہ اس جیپ میں ڈرگز ہے پر آفاق چوہدری یہی سمجھا تھا کہ مہرو نے ڈرگز کے پیکٹ دیکھ کر شور مچایا ہے اور اسی بات کے ڈر سے رحیم چوہدری نے دتا کمہار سے پیسوں کے عوض مہرو کا رشتہ مانگا کیونکہ ایک دفعہ مہرو حویلی آ جاتی تو پھر اس کی زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی پر مہرو بے خبری میں ماری گئی تھی، اسے اب بھی اصل معاملے کا کچھ علم نہ تھا۔



''مس رطابہ! کہیں کیوں اتنی ایمرجنسی میں بلایا ہے؟'' وہ دونوں اس وقت فائیو اسٹار ہوٹل میں موجود تھے۔
''مجھے اس کانٹریکٹ کی کاپی چاہئے''۔
''واٹ... آپ کا دماغ تو درست ہے مس رطابہ''۔ مسٹر رضا نے حیران ہو کر کہا تھا۔
''کیوں مسٹر رضا! حیرانی کے غوطے مت کھائیں، میں نے ناقابل یقین بات کہہ دی ہے کیا؟'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔
''مس رطابہ! شاید آپ مرنے یا مارنے والی اسٹیج پر پہنچ چکی ہیں، پر میرے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے، میری فیملی کو میری ضرورت ہے ابھی اور آپ جانتی ہیں آپ کن لوگوں کے ساتھ الجھ رہی ہیں''۔ مسٹر رضا رسانیت سے بولے۔
''میں بہت اچھے طریقے سے جانتی ہوں مسٹر رضا! آپ صرف اتنا بتائیں مجھے کانٹریکٹ کی کاپی دیں گے یا نہیں''۔ اب کے اس کا لہجہ درشتی لئے ہوئے تھا۔
''اس کاپی کو حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا آپ سمجھ رہی ہیں''۔
''کیا مطلب؟'' وہ چونکی تھی۔
''مطلب یہ مس رطابہ! کہ یہ کانٹریکٹ صرف ہم چار لوگوں کے کمپیوٹر میں mail کی صورت موجود ہے اور یہ میل پاس ورڈ لگی ہوئی ہے، بالفرض اگر میں میل آپ کو send کر بھی دیتا ہوں تو بغیر پاس ورڈ کے یہ open نہیں ہو سکے گی''۔ مسٹر رضا نے تفصیلاً ساری بات گوش گزار کی تھی۔
''مجھے پاس ورڈ کا پتا ہے''۔ وہ جواباً فقط مسکرائی تھی پر مسٹر رضا کا منہ حیرت کے مارے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔



آفاق چوہدری حجلہ عروسی میں نشے میں دھت داخل ہوا تھا۔ گرتا لڑکھڑاتا اس کے قریب آیا، وہ سمٹ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہونے والا تھا، اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

''اب بتا، کہاں بھاگ کے جانے لگی تھی مجھ سے''۔ اس نے ایک گندی گالی کے ساتھ مخاطب کیا تھا اور پھر یکدم اس پر پل پڑا تھا۔ تھپڑ، لاتیں، گھونسے برساتا مغلظات بک رہا تھا اور وہ خاموشی سے مار کھاتی جا رہی تھی۔

''کمینی تیرا میں برا حشر کردوں گا''۔ اس نے اس کے بالوں کو زور کا جھٹکا دیا تھا، اب کے وہ بلبلا اٹھی تھی اور پھر شادی کی پہلی رات اس کی مار کھاتے ہی گزری تھی، انگ انگ جوڑ جوڑ دہائی دے رہا تھا، پر وہ کمال ضبط سے برداشت کیے سب کچھ سہتی جا رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

فائیو اسٹار ہوٹل سے وہ سوا چار نکل آئی تھی۔ آفس ہوٹل سے پندرہ منٹ کی مسافت پر تھا۔ یعنی وہ ساڑھے چار بجے ٹائم پر آفس پہنچ سکتی تھی۔ باہر آتے ہی اس نے ٹیکسی روکی۔

''بھائی صاحب! F4 میں اتاریئے گا''۔ یہ کہہ کر وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کا آفس F3 میں تھا پر وہ کوئی رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ یہ چھوٹی سی غلطی بھی اس کا بنا بنایا کھیل بگاڑ سکتی تھی۔ ایف فور آکر وہ پیدل چلتی آفس کی عمارت کی جانب بڑھ گئی تھی۔ اس کا دوسرا اہم کام بھی خاموشی اور سکون سے ہوگیا تھا۔

☆..........☆..........☆

''اری او بنورانی! ابھی تک تیری صبح نہیں ہوئی کیا''۔ وہ پوری رات زمین پر پڑی رہی تھی اس لئے اٹھنے میں دقت ہو رہی تھی۔

''تجھے چوہدرائن بلا رہی ہیں''۔ اس دن والی ملازمہ دروازے پر کھڑی پیغام دے کر چلتی بنی تھی۔ وہ بمشکل زمین سے اٹھی، اس کے جسم سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ آفاق صبح صبح ہی کہیں جا چکا تھا، بیڈ خالی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی واش روم کی جانب بڑھ گئی تھی، منہ پر دو تین پانی کے چھپکے مارتے ہوئے اپنی شکل کو دیکھا، چہرہ نیلو نیل تھا، بے اختیار اس کا دل دھاڑیں مارنے کو چاہا پر اب بھی ضبط کر گئی تھی کیونکہ اب اسے شہلا چوہدری کی عدالت میں پیش ہونا تھا۔

☆..........☆..........☆

وہ آفس کی راہداری میں چلتی اپنے کیبن کی طرف جانے والے راستے پر مڑنے ہی والی تھی کہ شاندار شخصیت کی پکار نے اس کا دل دہلا دیا تھا، وہ یکدم ہڑبڑا کر پلٹی تھی۔

''سر! آپ یہاں''۔ فوراً اس کے منہ سے نکلا۔

''جی مس رطابہ! آپ کہاں سے آرہی ہیں؟'' اس سوال نے اس کے چھکے چھڑا دیئے تھے۔

''سر! میں نے آپ کو بتایا تھا ناں مجھے کسی رشتہ دار کے ہاں جانا تھا''۔ وہ سنبھل کر بولی۔

''پر آپ تو F4 میں دیکھی گئی ہیں جبکہ آپ کو میرے خیال میں B2 جانا تھا، آپ نے یہی بتایا تھا ناں''۔ اس کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے، وہ اتنی بڑی غلطی کر چکی تھی۔

''جی سر! پر ٹیکسی والے کو F4 میں کچھ کام تھا، شاید اس نے کسی سواری کو اٹھانا تھا۔ میں وہاں ہی اتر گئی تھی''۔ اس نے جواباً اعتماد سے جواب دیا۔

''ہوں... ٹھیک ہے، آپ میٹنگ میں جانے کی تیاری کیجئے''۔ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا تھا جبکہ رطابہ سوچ رہی تھی کہ اسے منصوبہ کچھ اور مضبوط بنانے پڑے گا۔

☆..........☆..........☆

''لڑکی بس بہت ہو گیا ڈرامہ، اب اپنی اوقات پر آجاؤ''۔ شہلا چوہدری نے اس کی جانب تنفر بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔

''جی...'' وہ حیرانی سے بولی۔

''کل سے اسے بھی اپنے ساتھ کام پر لگاؤ، مفت کی روٹیاں توڑنے نہیں لائی اسے''۔ وہ ملازمہ کو تنبیہ کرتی کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

''اری بنو تیرے ساتھ یہی سلوک ہونا ہے، اچھی امیدیں مت پال تو کمیوں کی بیٹی ہے، ان چوہدریوں میں تیری کوئی جگہ نہیں''۔ ملازمہ نے اسے اپنی طرف سے سمجھایا تھا، وہ بت بنی کھڑی تھی، ساکت و جامد۔

☆..........☆..........☆

میٹنگ کامیاب رہی تھی۔ دوسری پارٹی کو ان کا کام کافی پسند آیا تھا۔ شاندار شخصیت کے چہرے پر خوشی چمک رہی تھی اور رطابہ کے سینے پر یہ دیکھ کر سانپ لوٹ رہے تھے۔

''مسکرا لو، خوشی منالو پر کب تک مناؤ گے''۔ اس کے لہجے میں زہر بھرا تھا۔

''ارے مس رطابہ! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں''۔ وہ پاس آیا تو وہ چونک کر پلٹی۔

''آیئے مسٹر واسطی سے آپ کو ملاتا ہوں''۔ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا تھا جبکہ اس نے بھی اسی جانب قدم بڑھا دیئے۔

☆..........☆..........☆

عورت آج بھی انصاف کی تلاش میں ہے، مقام کی تلاش میں ہے کہ شاید مل جائے۔ کچھ عورتیں بے بسی کی چادر اوڑھ لیتی ہیں حالات سے سمجھوتہ کر لیتی ہیں، جو جیسا ہے چلنے دیتی ہیں۔ پر کچھ عورتیں ایسا نہیں کرتیں، وہ اپنے آپ کو حالات کے تابع نہیں کرتیں۔ وہ اپنے مقام کو پانے کے لئے سب کچھ کر جاتی ہیں، جائز، ناجائز، اچھا، برا پر اصل میں انہیں مقام پھر بھی حاصل نہیں ہوتا، بلکہ وہ اپنے مقام سے اور نیچے گر جاتی ہیں، عورت ایک بڑی عجیب شے ہے، محبت کرے تو اپنا سب کچھ نچھاور کر دے پر جب نفرت کرے تو انتقام کی آگ میں جلا کر راکھ کر دے۔

☆..........☆..........☆

مہرو پر ظلم و ستم ڈھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، پورا دن اس سے گدھوں کی طرح حویلی کا کام لیا جاتا اور رات کو آفاق کے حوالے کر دیا جاتا۔ پورے دن کی تھکاوٹ اور رات کو آفاق کی مار اسے کہیں کا نہ چھوڑتی۔ پر اگلی صبح وہ پھر شروع ہو جاتی۔ بس صرف اس پر اتنا رحم کیا جاتا کہ دو وقت کی روٹی پتلے شوربے کے ساتھ دے دی جاتی۔ اس کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ رحیم چوہدری کے پالتو کتے گوشت، دودھ، انواع و اقسام کی اشیا سے سیر ہوتے تھے پر اسے وہ درجہ بھی نہ مل سکا تھا کہ دو وقت کا کھانا ہی اچھا دے دیا جاتا۔ پر اب بھی صبر کا مادہ اس میں وافر مقدار میں موجود تھا، اب وہ تکلیفوں اذیتوں پر روتی نہ تھی، بس اپنے اللہ سے معافی اور مدد مانگتی تھی اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ اللہ اسے تنہا چھوڑ دیتا، اللہ اپنے بندوں سے ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے، اللہ نے مہرو کی سن لی تھی۔

☆..........☆..........☆

رات کو وہ کمرے میں آئی تو آفاق حسب معمول بیڈ پر موجود تھا، وہ دستک دے کر کمرے میں آگئی تھی،

اسے اب آفاق سے ڈر نہیں لگتا تھا، کچھ دن سے اس کی طبیعت گری گری رہنے لگی تھی، پر کام اتنا ہوتا تھا وہ دھیان نہ دیتی تھی۔

''مہر! ادھر آؤ''۔ وہ اس کے کپڑے پریس کرنے کے لئے نکال رہی تھی جب آفاق نے اسے پکارا تھا، وہ حیران ہو کر پلٹی، کیونکہ وہ اس لہجے کی عادی نہ تھی، آفاق ہمیشہ ہی اسے گالی دے کر مخاطب کرتا تھا، اس لئے اس کا حیران ہونا بجا تھا۔

''جی''۔ وہ پاس آ گئی۔

''بیٹھو یہاں''۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔

''صبح میں آیا تھا تم دکھائی نہیں دیں''۔ اسے ایک اور حیرانی کا شاک لگا تھا۔ وہ بس گم صم اس کے چہرے کی جانب دیکھتی جا رہی تھی۔

''مہر کیا ہوا؟'' آفاق نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''میں آپ کے اس لہجے کی عادی نہیں ہوں اس لئے''۔ وہ سادگی سے بولی تھی اور آفاق نے جواباً نگاہیں شرمندگی سے جھکا لی تھیں۔

''مہر! مجھے معاف کر دو''۔ وہ اس کے ہاتھ تھام کر التجائیہ لہجے میں بولا تھا۔

''نہیں آپ ایسا مت کہیں، آپ جیسے بھی ہیں میرے شوہر ہیں، میں نے کبھی آپ کے بارے میں کچھ غلط نہیں سوچا، بس اللہ سے یہی دعا کرتی رہی کہ وہ آپ کو نیکی اور ہدایت کے رستے پر چلائے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں، بلکہ میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے ساتھ جا کر رشتے میں باندھا ورنہ آپ دوسرا طریقہ بھی اپنا سکتے تھے۔ آپ شرمندہ مت ہوں مجھے تکلیف ہوتی ہے''۔ وہ اس کے ہاتھ تھامے کہتی جا رہی تھی اور آفاق دم بخود سا اسے سنے جا رہا تھا، کیا وہ اتنا نیک تھا کہ اسے پاکیزہ نیک عورت ملتی، اسے اپنی خوش نصیبی پر ناز ہو رہا تھا اور خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔

☆............☆............☆

وہ اس وقت اپنے روم میں موجود تھی اور اس کے آگے اس کا لیپ ٹاپ پڑا ہوا تھا۔ لیپ ٹاپ پر email والا صفحہ اوپن تھا، اس نے inbox میں سے مسٹر رضا کو کلک کیا، اس کا میسج اوپن ہو گیا تھا۔ کانٹریکٹ کی کاپی اس کے سامنے تھی۔ بس کامیابی اس سے چند قدم دور تھی، بس صرف پاس ورڈ ڈالنا تھا، پاس ورڈ کس کے نام تھا وہ یہ نام اچھے طریقے سے جانتی تھی اور وہ نام تھا...

☆............☆............☆

سب اس کایا پلٹ پر حیران تھے، آفاق چوہدری کیسے سدھر گیا۔ پر اللہ جسے چاہے نیکی کی ہدایت دے، آفاق چوہدری بھی ہدایت کے رستے پر آ گیا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ آفاق اور اس کے غنڈے آج پھر کسی کا شکار کرنے نکلے تھے اور ان کی نظر دوسرے گاؤں کی الھڑ مٹیار گوری پر پڑ گئی تھی۔ گوری اسی گاؤں میں رہائش پذیر تھی۔ باپ گاؤں کا لوہار تھا۔ زندگی غربت بھری گزر رہی تھی پر پھر بھی وہ سب مطمئن تھے۔

آفاق نے گوری کو اٹھوا لیا تھا اور اسے اپنے اڈے پر لے گیا تھا۔ گوری چلا رہی تھی معافیاں مانگ رہی تھی پر آفاق چوہدری پر شیطان غالب آ چکا تھا، اگلا لمحہ تھا کہ وہ اس کی عزت کی چادر اتار کر پھینکتا، اس وقت، گوری

نے ایک ایسی بات کہی تھی کہ آفاق چوہدری وہیں کا وہیں ساکت رہ گیا تھا۔

☆............☆............☆

''ارے بہن کچھ رطابہ کا سناؤ، خیریت سے ہے ناں، کوئی فون شون آیا گیا''۔ پڑوس والی زینت نے پوچھا تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے، کرتی رہتی ہے''۔ وہ دھیمے سے بولی تھیں۔

''پر بہن ایک بات سمجھ نہیں آئی، لاہور شہر کو چھوڑ کر وہ کراچی اتنی دور کون سی نوکری کرنے گئی ہے''۔ زینت بھی بال کی کھال نکالنے میں ماہر تھی۔

''انتقام کی نوکری''۔ وہ جواباً ہلکے سے بڑبڑائیں۔

''ہیں... کیا کہا؟'' زینت نے اسے بڑبڑاتے دیکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں، وہاں اسے اچھی نوکری مل گئی ہے''۔ وہ سنبھل کر بولی تھیں اور زینت محض سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

''رطابہ! معاف کردے انہیں، میں نے معاف کردیا تو بھی کردے''۔ انہوں نے دل میں ایک مرتبہ پھر دہرایا تھا۔

☆............☆............☆

''میں دعا کروں گی اگر تمہاری کوئی بیٹی ہو تو وہ میرے جیسی ہو''۔ یہ الفاظ نہیں تھے پگھلا سیسہ تھے جو گوری نے اس کے کانوں میں انڈیلے تھے، وہ یکدم لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا تھا اور کمرے سے فوراً باہر نکل گیا تھا۔ اس کا وجود آندھیوں کی زد میں تھا۔ گوری کے لفظوں کی بازگشت ابھی بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

''نہیں میری بیٹی نہیں''۔ اس نے اپنے بال مٹھیوں میں بھینچ لیے تھے۔

''کیا ہوا آفاق چوہدری، اپنے پر باری آئی تو عزت کے لالے پڑ گئے''۔ اس کا ضمیر تن کر بولا تھا۔

''گوری نے کچھ غلط کہا کیا؟ نہیں ٹھیک کہا، ذرا فرض تو کرو آج اس جگہ پر اگر تمہاری بیٹی ہوتی تو...''

''نہیں ایسا نہیں''۔ وہ چیخا تھا، ضمیر زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

''آفاق چوہدری! اس دنیا میں جیسا کرو ویسا بھرو ہوتا ہے، آج اگر تم لوگوں کی بیٹیوں کی عزتیں تار تار کرو گے تو یاد رکھنا کل کو تمہاری بیٹیاں بھی ہوں گی''۔ وہ پسینے سے تر تھا۔

''میرے اللہ! مجھے معاف کردے، مجھے معاف کردے''۔ وہ سجدے کے بل زمین پر گر گیا تھا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

☆............☆............☆

''مہرو! آج سے میری بیوی کی حیثیت سے یہاں رہے گی''۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے دونوں نفوس پر اس نے جیسے بم گرایا تھا۔

''آفاق! تمہاری جرات کیسے ہوئی یہ کہنے کی''۔ رحیم چوہدری اٹھ کر گرجے اور پاس کھڑی مہرو کا دل دہل کر رہ گیا تھا۔

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے''۔ شہلا چوہدری بھی یہ سن کر اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

''مہرو میری بیوی ہے''۔ وہ ایک مرتبہ پھر بولا۔

''آفاق...'' رحیم چوہدری دھاڑے تھے۔

''تم جانتے ہو، ہم نے تمہاری شادی اس دو ٹکے کی لڑکی کے ساتھ کیوں کی، اگر نہ کرتے تو تم آج جیل میں سڑتے''۔ آفاق جواباً مسکرایا تھا۔

''پر ابا جان! مہرو تو اس بات سے سرے سے ہی لاعلم ہے''۔ یہ سن کر رحیم اور شہلا چونکے۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ مہرو نے ڈرگ کو دیکھ کر شور نہیں مچایا تھا بلکہ اپنی عزت بچانے کے لئے سب کیا تھا''۔ رحیم چوہدری کے سر پر پہاڑ گرا تھا۔

''اور دوسری بات، مہرو میرے بچے کی ماں بننے والی ہے''۔ اور یہ سن کر شہلا لڑکھڑائی تھیں، مہرو اب بھی وہاں کھڑی تھی ساکت و جامد۔

☆..........☆..........☆

''تمہیں اس بچے کو ختم کرنا ہے''۔ شہلا چوہدری تنتناتی ہوئی اس کے کمرے میں آئی تھیں۔

''آفاق ایسا کچھ نہیں ہونے دیں گے''۔ پتہ نہیں اس میں اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی کہ وہ شہلا چوہدری کے سامنے بول پڑی تھی۔

''تم دو ٹکے کی لڑکی، نیچ ذات میرے سامنے زبان چلاتی ہے''۔ شہلا چوہدری نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر بیڈ پر جا گری تھی۔

''دیکھتی ہوں تمہیں، کیسے اس بچے کو جنم دیتی ہو''۔ وہ دھمکی دیتی کمرے سے باہر نکل گئی تھیں جبکہ وہ اس دھمکی پر لرز اٹھی تھی۔

☆..........☆..........☆

''مس رطابہ کو میرے روم میں بھیجیں''۔ شاندار شخصیت نے پیون کو پیغام بھجوایا تھا۔

''سر! وہ دو دن کی لیو پر ہیں''۔ پیون جواباً بولا تھا۔

''کیا مطلب؟''

''سر! ان کو اپنے گاؤں جانا تھا، وہ یہی کہہ کر گئی ہیں''۔ پیون نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

''او کے''۔ پرسوں ان کا پروجیکٹ باقاعدہ شروع ہونا تھا اور رطابہ غائب تھی۔

☆..........☆..........☆

وہ نام کوئی اور نہیں رحیم چوہدری کا تھا، ہاں رطابہ کا دادا، آفاق کا باپ مہرو کا سسر''۔ جس نے مہرو اور رطابہ کی زندگیوں میں بھونچال لایا تھا۔ رطابہ کو بے نشان کیا تھا، اس کے باپ کو اس سے چھینا تھا، اس کی ماں کا سہاگ چھینا تھا، ان کو گھر بدر کیا تھا، رطابہ آج انتقام لینے آگئی تھی۔ وہ رحیم چوہدری کو برباد کرنے آگئی تھی کیونکہ شاندار شخصیت کا حامل شخص کوئی اور نہیں رحیم چوہدری ہی تھا۔

☆..........☆..........☆

''آفاق! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے کہیں یہ لوگ ہمارے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں''۔ شہلا چوہدری جس وقت سے دھمکی دے کر گئی تھیں مہرو کی جان سولی پر اٹکی ہوئی تھی، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ شہلا چوہدری کچھ نہ کچھ ضرور کرے گی، اس نے اپنے انجانے خدشوں کا اظہار جلد ہی آفاق کے سامنے کر دیا تھا۔

''تم گھبراؤ نہیں مہر! میں تمہارے ساتھ ہوں تمہیں یا ہمارے بچے کو کچھ نہیں ہونے دوں گا''۔ آفاق کا لہجہ

پر یقین تھا۔ یہ سن کر مہرو کے دل کو ڈھارس ملی تھی۔

''تم پریشان مت ہو''۔ آفاق نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا اور وہ پرسکون ہوگئی تھی۔

☆..........☆..........☆

''رطابہ! پک اپ دی فون''۔ رحیم چوہدری بار بار رطابہ کے سیل پر فون کررہا تھا۔ پر رطابہ کا فون سوئچ آف تھا۔ وہ جھلاتا ہوا کمرے میں ایک جگہ سے دوسری جگہ گھوم رہا تھا۔ پریشانی حد سے سوا تھی، کیونکہ کل ان کا کانٹریکٹ منظور کیا جانا تھا اور اس کانٹریکٹ کی فائل رطابہ کے پاس تھی، اگر رطابہ کل نہ آئی تو رحیم چوہدری سڑک پر آجاتا کیونکہ وہ اپنا سب کچھ لٹا چکا تھا، وہ دو دفعہ خود رطابہ کے ہوسٹل بھی ہو آیا تھا پر وہاں نہ وہ تھی اور نہ اس کی دوست عیشاء۔ آس پڑوس کی لڑکیوں نے بتایا تھا کہ وہ پرسوں ہی بنا بتائے چلی گئی تھیں۔ اب پریشانی اور بڑھ گئی تھی، پر حیرت انگیز طور پر میٹنگ سے آدھا گھنٹہ پہلے رطابہ واپس آچکی تھی، حیران کن بات تھی۔

☆..........☆..........☆

''مجھے ہر حالت میں وہ لڑکی یہاں سے غائب چاہئے پر بنا کسی بھی شک و شبے کے''۔ رحیم چوہدری کی آواز اس تاریک کمرے میں گونج رہی تھی اور گونج کر ہیبت ناک لگ رہی تھی۔

''ہاں ہر کام صفائی سے ہونا چاہئے''۔ اب کے شہلا چوہدری بولی تھیں۔

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب! آپ فکر نہ کریں، ہر کام صفائی سے ہی ہوگا''۔ آدمی مودب سا بولا تھا۔

''یہ لو رقم، کام پورا ہونے پر پوری ملے گی''۔ چوہدری رحیم نے رقم والا لفافہ آدمی کی طرف پھینکا تھا جسے اس نے کمال مہارت سے پکڑ لیا تھا۔

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب''۔ وہ بولا تھا۔

''تم جاسکتے ہو''۔ کمرہ اور تاریک ہوگیا تھا۔

☆..........☆..........☆

''مس رطابہ! مجھے آپ سے ایسی لاپرواہی کی امید نہ تھی''۔ رطابہ اس وقت رحیم چوہدری کے آفس میں موجود تھی۔

''سوری سر! ایمرجنسی میں جانا پڑا اور فائل اتنی قیمتی تھی کہ میں کسی کو دے نہیں سکتی تھی''۔

''ایسی کیا ایمرجنسی تھی؟''

''سر! میری اماں بیمار تھیں اسی لئے مجھے فوراً جانا پڑا''۔ اس کا لہجہ دھیما تھا۔

''اوہ... اب کیسی ہیں وہ؟'' رحیم چوہدری نے پوچھا۔

''جلد ہی ٹھیک ہوجائیں گی''۔ وہ ہلکے سے بڑبڑائی تھی۔

''کیا ہوا مس رطابہ!'' وہ چونک گئی۔

''سر! اب ٹھیک ہیں''۔

''اوکے آپ سب کو آرڈر دیں کہ سب کانفرنس ہال میں جمع ہوجائیں، میں وہیں جارہا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ کسی آنے والے فون کی جانب متوجہ ہوگئے جبکہ وہ تیزی سے باہر نکل آئی تھی۔ کامیابی اب چند ساعت پر تھی۔

☆..........☆..........☆

''آفاق بیٹے! تمہاری خالہ نے شہر بلایا ہے ایک رات کے لئے''۔ شہلا چوہدری اس وقت ڈرائنگ روم

میں آفاق کے سامنے والے صوفے پر براجمان تھیں۔

''کیوں بلایا ہے؟'' وہ رکھائی سے بولا تھا۔

''ثانی کا رشتہ آیا ہے اسی سلسلے میں''۔ یہ کہتے ہوئے ان کے لہجے میں دکھ جھلک رہا تھا۔

شہلا چوہدری کی خواہش تھی کہ ثانی کا رشتہ آفاق کے ساتھ طے ہوتا پر ایسی نوبت ہی نہ آئی تھی، آفاق خود مہرو کو بیاہ لے آیا تھا۔

''تو آپ اور ابا جان کا جانا بنتا ہے میرا کیا کام''۔ وہ ہنوز لاپرواہی سے بولا تھا۔

''بیٹا! تمہارے ابا کو کل اپنے کسی پرسنل کام سے جانا ہے وہ نہیں جاسکیں گے''۔ انہوں نے بہانہ بنایا۔

''کون سا پرسنل کام جو مجھے نہیں معلوم''۔ وہ بھی آفاق تھا۔

''اف... کبھی کبھی جھوٹ بولنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے''۔ انہوں نے دل میں سوچا تھا۔

''کوئی سیاسی کام تھا، اگر نہیں جانا تو صاف صاف بتا دو، میں آپا کو منع کر دیتی ہوں''۔ ان کا لہجہ اب کے سخت ہو گیا تھا، آفاق نے جواباً ایک نظر ان کے چہرے پر ڈالی۔

''ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا''۔ کہہ کر اٹھ گیا تھا۔ پیچھے شہلا اپنی کامیابی پر مسکرا رہی تھیں۔

☆..........☆..........☆

آفاق نے اپنے جانے کا اسے بتایا تو وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کا دل کسی خدشے کے تحت دھڑک اٹھا تھا۔

''آفاق! آپ مت جائیں''۔ وہ رو پڑی تھی۔

''ارے مہرو! کیا بچوں کی طرح Behave کر رہی ہو، ایک دن کی ہی تو بات ہے''۔ آفاق نے اسے حوصلہ دیا تھا۔

''آفاق مجھے لگتا ہے جیسے کچھ ہمارے ساتھ برا ہونے والا ہے''۔ وہ اپنے واہموں کو اب زبان پر لے آئی تھی۔

''کچھ نہیں ہو گا ڈیئر! بس اپنا خیال رکھنا اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں، گھر میں ملازم عورتوں کا انبار ہے، دو تین کو اپنے ساتھ سلا لینا''۔ آخر میں وہ مسکرایا تھا۔ مہرو کا دل اب بھی بے چین تھا، کسی پل قرار نہ تھا، بری سوچیں اسے کسی آکٹوپس کی طرح اپنے جال میں جکڑے ہوئے تھیں، وہ جتنا سوچتی یہ جال اسے اور مضبوط جکڑے جاتا، آخر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

☆..........☆..........☆

''تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو؟'' یہ رطابہ کے غائب ہونے سے ایک دن پہلے کا وقت تھا، جب وہ اور مسٹر رضا فائیو اسٹار ہوٹل میں بیٹھے تھے۔

''یہی سمجھ لیں''۔ وہ شاطر سا مسکرایا تھا۔

''رطابہ کو ابھی بلیک میل کرنے والا کوئی پیدا نہیں ہوا، سمجھے''۔ وہ پھنکاری تھی۔

''پر رضا ہے جو سب جانتا ہے''۔ رضا نے فخریہ کالر کھڑے کیے تھے۔

''یو بلڈی چیپ''۔ وہ اسے خونخوار نظروں سے گھورتی ہوئی بولی۔

''اے میڈم! شرافت کی زبان استعمال کرو ورنہ جانتی ہو تم مجھے''۔ رضا نے بھی شرافت کا چولا اتار پھینکا تھا۔

''دو کروڑ''۔ اس نے مطالبہ کیا۔

''بس یا کچھ اور''۔ وہ جواباً سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔
''بس مس رطابہ جی!'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور رطابہ کا ٹیبل کے نیچے رکھا ہاتھ بڑی تیزی سے کوئی msg کر رہا تھا۔

☆.........☆.........☆

''گوری پتر وہ بابو اب نہیں آیا کیا''۔ اچھو لوہار نے آفاق کی بابت دریافت کیا تھا۔
''نہیں ابا! کافی دن سے نہیں آیا''۔ گوری نے جواب دیا۔
''بڑا ہی نیک بچہ ہے، اللہ صحت اور تندرستی دے اور اسے ہمیشہ خوش رکھے''۔ وہ دعائیں دیتا جا رہا تھا۔
''ہاں ابا! ہر کوئی بدی سے نیکی کی طرف پلٹنے والا نہیں ہوتا پر اللہ جسے چاہے ہدایت دے''۔ وہ مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی۔
آفاق چوہدری کے گوری پر بڑے احسان تھے، پر وہ اب بھی یہی کہتا گوری نے جو احسان اس پر کیا ہے وہ بہت بڑا ہے، وہ گوری کی ہر لحاظ سے مالی امداد کر رہا تھا، اس کے باپ کا شہر کے مہنگے اسپتال میں علاج کروا رہا تھا، گوری نے پھر سے تعلیم سے رشتہ جوڑ لیا تھا، میٹرک کے بعد وہ اسکول چھوڑ چکی تھی، پر اب پھر تعلیم کا سلسلہ بحال ہو گیا تھا، ایسے میں وہ دعائیں نہ سمیٹتا تو اور کیا کرتا۔

☆.........☆.........☆

آفاق اور شہلا چوہدری شہر پہنچ چکے تھے۔
آپا اور نانی نے ان کا بھرپور استقبال کیا تھا، آپا کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بیٹے امریکہ میں مقیم تھے اور شوہر بھی آج کل وہاں تھے اسی لئے انہوں نے آفاق کو بلوایا تھا۔ آفاق کو یہاں آ کر کچھ گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا، بقول شہلا چوہدری کے آج کچھ لوگ ثانی کا رشتہ پکا کرنے آ رہے ہیں، پر یہاں ایسا کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے بار بار خبردار کر رہی تھی۔ اور اس کا یہ خدشہ بھی جلد صحیح ثابت ہو گیا تھا۔

☆.........☆.........☆

ہجر کی رات ہم اکیلے کیسے
کاٹیں گے، تم نے دل کا
دیا جلائے نہیں رکھا
نہ کوئی امید دی تم نے
نہ کوئی آس بندھائی تم نے
پر پھر بھی ہم تیرے انتظار میں ہیں
اب دیکھتے ہیں
ہمارا انتظار حاصل
رہتا ہے یا
لاحاصل رہتا ہے

آفاق کے شہر جانے سے مہرو کو بے چینی لاحق ہو گئی تھی۔ دن کا کچھ وقت تو وہ ملازمین کے ساتھ کاٹ گئی۔ پر رات کا سوچ سوچ کر وہ ہلکان ہو رہی تھی۔ ملازموں کے سوا گھر میں کوئی موجود نہ تھا۔ آفاق نے شہر جا کر اس کو

دو مرتبہ فون کیا تھا، وہ اسے تسلیاں ہی دیتا رہا تھا کہ بس وہ صبح آ جائے گا، رات کی ہی بات ہے۔ پر وہ یہ نہیں جانتا تھا اکثر گناہ رات کے اندھیرے میں ہی ہوتے ہیں۔

☆..........☆..........☆

''مجھے منظور ہے، تمہیں کل پیسے مل جائیں گے''۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور رضا بھی اس کے ساتھ چلتا باہر آ گیا تھا۔

''اوکے مسٹر رضا! good bye''۔ وہ ہلکا سا مسکرائی تھی، گہری پراسرار مسکراہٹ۔

''اوکے''۔ یہ کہہ کر رضا اپنی کار کی جانب بڑھ گیا تھا جبکہ وہ دوسری طرف اپنی کار کی جانب بڑھی تھی، ڈرائیور آگے تیار تھا، اس کے بیٹھتے ہی گاڑی آگے بڑھ گئی تھی، پر اچانک فائر کی آواز بڑے زور سے گونجی تھی۔

''مسٹر رضا good bye''۔ وہ اب بھی ہلکا سا مسکرائی تھی، پراسراری مسکراہٹ۔

☆..........☆..........☆

آج رات کالی سیاہ تھی۔ آسمان پر بادلوں نے ڈیرہ جمایا ہوا تھا، چاند بھی نہ نکلا تھا۔ مہرو کے دل میں اک بے چینی سی لاحق تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ اس کی چھٹی حس بار بار بیدار ہو رہی تھی۔ اس کے پاس جو ملازمہ سوتی تھی وہ آج صبح ہی گاؤں چلی گئی تھی، اس کی والدہ بیمار تھی، باقی ملازم بھی اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے، اس ویران حویلی میں صرف مہرو اور دو چوکیدار ہی بچے تھے۔ ملازموں کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور دروازے کھڑکیاں اچھی طرح بند کر لئے تھے۔ آفاق نے آج واپس آنا تھا پر شہلا چوہدری کو اچانک ایک کام یاد آ گیا تھا جس کی بنا پر آفاق کو بھی مجبوراً رکنا پڑا تھا۔ نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے دل کو بس ایک خدشہ لاحق تھا اور ایسا کچھ غلط بھی نہ تھا۔

☆..........☆..........☆

یہ دبئی میں بنے ایک لگژری اپارٹمنٹ کا اندرونی منظر ہے۔

دو فلپائنی اور ایک چینی ملازمہ ایک شخص کو ویل چیئر سے بیڈ پر منتقل کر رہی ہیں، وہ شخص مسلسل ان کا ہاتھ جھٹک رہا ہے پر وہ بے بس ہے، اس کے ناتواں وجود میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ان کو پرے کر سکے، نہ وہ بول سکتا ہے کہ زبان سے ان کو روک سکے، وہ ہر معاملے میں بے بس ہو چکا ہے اور بے بسی سے اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو بڑے واضح دکھائی دے رہے ہیں۔

☆..........☆..........☆

پاس ورڈ اس نے انٹر کر دیا تھا۔ Afaq/R یہ نام تو اس کی رگ رگ میں بسا تھا وہ کیسے اس کو بھول سکتی تھی۔

وہ اپنی منزل کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔ ہاں وہ بہت قریب پہنچ گئی تھی۔

اس نے document میں اپنی مرضی کا ردوبدل کر دیا تھا اور یہ سارا ردوبدل رحیم چوہدری کی بربادی سے منسلک تھا۔ اب کے اس کے لبوں پر ایک شاطرانہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

☆..........☆..........☆

اک تم نے چال چلی تھی
اک ہم چال چلتے ہیں
اور

دیکھتے ہیں
جیت کس کی ہوتی ہے
کون
مقدر کا سکندر بنتا ہے
کس کی بازی پلٹتی ہے
اس شکست کے لئے
تیار رہنا
جو ہم تم کو دینے والے ہیں
تمہاری سب چالیں ناکام
ہونے والی ہیں
یہ جنون عشق کی
آگ ہے، جو اَب
بھڑک اٹھی ہے
اپنا بدلہ لینے
کے لئے
تڑپ اٹھی ہے
تم تیار رہنا
تم تیار رہنا
اک تم نے چال چلی تھی
اک چال ہم چلتے ہیں

''ہیلو رطابہ! آپ تین دن سے کہاں تھیں؟'' وہ چوتھے دن آفس آئی تھی جب رحیم چوہدری نے پوچھا تھا۔

''بس سر! گاؤں جانا پڑ گیا تھا''۔ وہ سنجیدہ سی بولی تھی۔

''اوہ... پر بندہ کم از کم اطلاع دے کر تو جاتا ہے''۔ رحیم چوہدری اب کے نرم لہجے میں گویا ہوئے تھے۔

''او کے سر! آئندہ خیال رکھوں گی''۔ وہ تابعداری سے بولی تھی۔

''آپ تیار ہیں ناں میٹنگ شروع ہونے والی ہے، Document آپ کے پاس محفوظ ہے ناں''۔ وہ پوچھ رہے تھے۔

''سر! بے فکر رہئے یہ Project آپ کو ہی ملے گا''۔ وہ مسکرائی تھی، زہریلی مسکراہٹ۔

☆..........☆..........☆

''اف... توبہ، ایک تو بندہ غربت میں پس رہا ہے اور ایک قتل و غارت عام ہو رہا ہے''۔ وہ بیڈ پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی جب علیشاہ دھپ سے اس کے قریب آ بیٹھی تھی۔

''کیوں، کیا ہوا؟'' اس نے کتاب سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔

''مسٹر رضا، وہ جو چوہدری ٹیکسٹائل اور آفندی ٹیکسٹائل کا ایمپلائی تھا کسی نے اس کا مرڈر کر دیا ہے''۔

علیشاء نے اسے بتایا تھا۔

''اچھا... اوہ کب، مجھے تو نہیں پتا، کب ہوا یہ واقعہ''۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

''کل، ویسے حیرت ہے تمہیں نہیں پتا، وہ تو تمہارے آفس کا بھی ممبر تھا''۔ علیشاء نے سوالیہ پوچھا تھا۔ وہ گڑبڑا گئی تھی۔

''میں کل آفس نہیں گئی تھی چھٹی پر تھی، مجھے بھی ابھی سلمیٰ نے کال کر کے بتایا ہے''۔ اس نے بات بنائی تھی۔

''ہوں... چلو اچھا کافی پیو گی، بنا لاؤں؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

''ہاں طلب ہو رہی ہے، بنا لاؤ''۔ اس نے کہا تھا، علیشاء کافی بنانے اٹھ گئی تھی۔

''جو مجھے بلیک میل کرتا ہے اس کا حشر ایسا ہی ہوتا ہے، چلا تھا مجھے پھنسانے، میرا راز کھولنے، اب بتائے راز''۔ وہ سفاکی کی انتہا پر تھی، دہشت اس کے انگ انگ سے ٹپک رہی تھی۔

☆.........☆.........☆

وہ بیڈ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی، نیند لگتا تھا آج آئے گی نہیں، ڈر سے اس کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آفاق کا فون آیا تھا وہ شہر سے نکل چکے تھے۔ صبح تک حویلی پہنچ جائیں گے۔ اس نے دوبارہ فون کیا مگر فون پاور آف تھا۔ شاید چارج ختم ہو گئی ہو، اس نے سوچا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ پتہ نہیں کب اس کی آنکھ لگ گئی، اچانک بڑے زور کا کھٹکا ہوا، وہ یکدم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔

''کک، کون ہے؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور کھڑکی کا شیشہ چکنا چور ہو کر کمرے کے اندر اور گرد پھیل گیا، اس نے ایک زوردار چیخ ماری تھی اور دوڑ کر دروازے کی جانب بھاگی تھی۔ اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر دروازہ ہنوز مقفل تھا۔

''کھولو دروازہ''۔ وہ چیخی تھی، پر یہاں کوئی ہوتا تو دروازہ کھولتا۔

اسی ٹوٹی کھڑکی سے اچانک دو تین لمبے تڑنگے آدمی اس کے کمرے میں کودے، ان کو دیکھ کر اس کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا باہر رہ گیا تھا۔

☆.........☆.........☆

''رطابہ بی بی! آپ کا کام ہو گیا، اب مجھے میرا معاوضہ دے دیں''۔ فون کی دوسری جانب کوئی آدمی تھا۔

''ہاں ٹھیک ہے تم اپنا پیسہ لے جاؤ''۔ اس نے نپے تلے لہجے میں جواب دیا۔

''پر بی بی ایک مسئلہ ہو گیا ہے''۔ اس کی اگلی بات پر وہ پریشان ہو گئی۔

''کیا مطلب کھل کے بتاؤ''۔ اس نے جھنجھلا کر پوچھا تھا۔

''پولیس انکوائری کر رہی ہے اور انکوائری میں لاسٹ ٹائم یہی بتایا گیا ہے کہ مقتول قتل ہونے سے پہلے آپ کے ساتھ تھا''۔ یہ جملہ دھماکے کی طرح اس کے سر پر گرا تھا۔

''اوہ اچھا میں دیکھ لوں گی''۔ اس نے فوراً فون کاٹ دیا تھا۔ بہرحال رطابہ کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

☆.........☆.........☆

گوری کو اس کے چچازاد نے طلاق دے دی تھی۔ یہ خبر گوری کے لئے سخت صدمے کا باعث بنی تھی۔ جس شادی کو ابھی ہونا تھا وہ ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ گئی تھی۔ گوری کا چچازاد رشید سے صرف نکاح ہوا تھا، شادی اگلے

ماہ ہونا تھی لیکن بغیر کسی وجہ کے اسے طلاق دے دی گئی اور جب وجہ جاننے کی کوشش کی گئی تو یہ کہا گیا کہ گوری کے گاؤں کے چوہدری کے بیٹے کے ساتھ تعلقات ہیں، وہ ایک بدکردار لڑکی کو اپنی بہو نہیں بنا سکتے۔

گوری تو اس الزام پر تڑپ اٹھی تھی پر اپنی صفائی میں کچھ نہ کہہ سکی تھی اور پھر ایک ایسا واقعہ ہوا تھا کہ گوری کی پوری زندگی کو بدل گیا تھا۔

☆..........☆..........☆

''کک کون ہو، تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' مہرو گھٹی گھٹی آواز میں بڑبڑائی تھی۔

''چلو ہمارے ساتھ''۔ ایک آدمی نے درشتی سے اسے کہا تھا، وہ خوف سے اور سمٹی تھی۔

''میں نہیں جاؤں گی، چھوڑ دو مجھے''۔ وہ دیوار کے ساتھ جا لگی تھی۔

''تمہارے تو اچھے بھی جائیں گے''۔ دوسرے آدمی نے فوراً اس کے منہ پر رومال رکھا اور وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتی ہوئی پہلے آدمی کی بانہوں میں جھول گئی تھی۔ دونوں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور کھڑکی سے لگی رسی سے باہر کود گئے، رحیم چوہدری کی چال کامیاب ہو چکی تھی۔

☆..........☆..........☆

پورے محلے میں گوری بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصوروار بن گئی تھی۔ لوگوں نے اس کی ذات پر طرح طرح کی باتیں کرنا شروع کر دی تھیں۔ گوری کے پورے گھر میں موت سا سناٹا ہر وقت طاری رہنے لگا تھا، نہ گھر کے اندر چین تھا نہ باہر لوگ چین لینے دیتے تھے۔

گوری کو ایسے وقت میں صرف ایک شخص یاد آیا تھا اور وہ شخص آفاق چوہدری کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔

☆..........☆..........☆

گاڑی اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھی، شہلا چوہدری اپنے کامیاب پلان پر شاداں و فرحاں تھیں اور دوسری طرف آفاق چوہدری مسلسل مہرو کے نمبر پر ٹرائی کر رہا تھا مگر فون مسلسل پاور آف تھا۔

''یہ مہرو فون کیوں نہیں اٹھا رہی''۔ اس نے جھنجھلا کر سوچا تھا۔ اس کے چہرے پر اب پریشانی کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔

''کیا ہوا بیٹا؟'' شہلا نے چونکنے کی ایکٹنگ کی۔

''کچھ نہیں، بس مہرو کو کب سے فون کر رہا ہوں فون pick نہیں کر رہی''۔ اس نے جواب دیا۔

''اوہ کہیں ہو گی مصروف''۔ شہلا نے مکھی اڑائی۔

''خیریت سے ہی ہو''۔ آفاق کی پر فکر آواز شہلا چوہدری کے تن بدن میں آگ لگا گئی تھی۔

☆..........☆..........☆

''میٹنگ کینسل ہو گئی''۔ یہ انکشاف رطابہ کی ہستی ہلا گیا تھا۔

''کیسے ہو گئی مس ناجیہ، ڈیڑھ گھنٹے میں تو پروجیکٹ سائن ہونا تھا''۔ اسے اپنا سر چکراتا محسوس ہو رہا تھا۔

''پتا نہیں مس رطابہ، ابھی ابھی جاوید (سیکریٹری) کی کال آئی کہ میٹنگ کینسل ہو گئی، اب next week ہو گی''۔ ناجیہ نے تو صحیح معنوں میں اس کا دل دہلا دیا تھا۔ اس کو اپنی ساری پلاننگ بھاڑ میں جاتی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں اب اور انتظار نہیں کر سکتی''۔ وہ بڑبڑائی تھی۔

''کچھ کہا مس رطابہ؟'' ناجیہ نے اسے بڑبڑاتے دیکھ کر پوچھا تھا۔
''نہیں، ہاں کچھ نہیں''۔ وہ یہ کہہ کر کیبن سے باہر نکل گئی۔ ناجیہ نے ناسمجھی سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

☆.........☆.........☆

''مجھے آفاق چوہدری سے ملنا ہے؟'' اس نے چادر کا پلو منہ کے اور آگے کرتے چوکیدار سے کہا تھا۔
''وہ گھر پر نہیں ہیں''۔ چوکیدار نے اسے سر سے پاؤں تک گھورتے ہوئے جواب دیا۔
''دیکھو میرا ان سے ملنا بہت ضروری ہے، پلیز مجھے ان سے ملوا دو''۔ اب کے وہ منت بھرے لہجے میں بولی تھی۔
''ارے لڑکی کہا ناں کہ آفاق نہیں ہے گھر پر، جاؤ یہاں سے''۔ وہ کرخت لہجے میں بول کر دوسری جانب مڑ گیا تھا کہ اچانک اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔
''ہیلو صاحب، جی اچھا صاحب''۔ فون کٹ گیا۔
''تمہیں اندر چوہدری رحیم نے بلایا ہے''۔ یہ سنتے ہی وہ بری طرح لڑکھڑائی تھی۔

☆.........☆.........☆

''سر! پلیز آپ یہ سوپ پی لیں آپ کی health کے لئے بہت ضروری ہے''۔ فلپائنی ملازمہ اس شخص کی منتیں کر رہی تھی پر وہ شخص اپنی ضد پر اڑا تھا۔
''نن نہی، ہٹ ہٹو''۔ وہ بمشکل دو لفظ بول پایا تھا۔ ملازمہ سر پکڑ کر رہ گئی۔
''مجھے فون کرنا پڑے گا''۔ اس نے سوچا اور ٹرے لے کر باہر نکل گئی۔ اس شخص نے نم آنکھوں سے اسے جاتے دیکھا تھا۔

☆.........☆.........☆

''بولو لڑکی تمہیں کیا کام ہے آفاق سے؟'' رحیم نے درشتی سے اس سے پوچھا تھا۔
''مجھے آفاق صاحب سے ملنا ہے''۔ اس نے سرسراتے لہجے میں جواباً کہا تھا۔
''وہ گھر نہیں ہے، ویسے تم کمہاروں کی بیٹی ہو ناں''۔ چوہدری رحیم نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا تھا۔
''جی میں دوسرے گاؤں سے آئی ہوں''۔
''اچھا لڑکی یہ بتاؤ تمہیں کیا کام ہے آفاق سے؟''
''وہ مجھے...'' وہ الف تا ے پوری کتھا سنا گئی، پر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ کتھا اس کے گلے کا پھندا بن جائے گی، اگر جان جاتی تو...

☆.........☆.........☆

''السلام علیکم اماں! کیسی ہیں آپ؟'' فون کی دوسری جانب اماں تھیں۔
''وعلیکم السلام! رطابہ کیسی ہو؟'' اماں نے حیرت انگیز طور پر اس مرتبہ کافی نرم و مطمئن لہجے میں حال احوال پوچھا تھا۔
''میں ٹھیک ہوں''۔ وہ یاس سے بولی تھی۔
''کب تک آ رہی ہو؟''
''بہت جلد ایک بہت بڑی خوشخبری لے کر''۔

''اچھا، کسی کی بربادی کو تم خوشخبری کہہ رہی ہو''۔ اماں طنزاً بولی تھیں۔

''اس خوشخبری کو پانے کے لیئے میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں، اب آرام وسکون تو سود سمیت حاصل کرنا ہے ناں یہ تو میرا حق ہے''۔ اس کے چہرے پر مخصوص زہریلی مسکراہٹ در آئی تھی۔

''پر ایک بات یاد رکھنا''۔ ادر یہ بات اسے ساکت کرگئی تھی۔ کبھی کبھی زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ ہم بہت کامیاب پلان بناتے ہیں ادر ان کو پورا کرنے لیئے ہر حد پار کر گزرتے ہیں، پر ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر دوسرا بندہ کوئی ایسی انجان، لاتعلق بات جو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہ ہو، کردے تو ہمارے پلان منصوبے سب دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

☆..........☆..........☆

''ہیلو سر! جی سر وہ بات نہیں مانتے اور کھانے پینے سے تو ہر وقت لاتعلق ہی رہتے ہیں، اگر زور زبردستی نہ کی جائے تو ایک گھونٹ پانی حلق سے اتارنے کو برا سمجھتے ہیں ادر غصہ کی تو آپ نہ ہی پوچھیے تو بہتر ہے سر، ہم ملازم ہیں آپ کے حکم کے تابع ہیں''۔ فلپائنی ملازمہ ٹورینا نے فون کی دوسری جانب بولتے شخص کو کہا تھا۔ فون کی دوسری جانب چند لمحے خاموشی چھا گئی تھی۔

''ہیلو سر!'' وہ دوبارہ مخاطب ہوئی۔

''ہوں''۔ اس شخص نے ہنکارا بھرا تھا۔

''تم جب تک میں وہاں نہیں آرہا جیسا چلتا ہے چلنے دو، میں پھر وہاں آکر خود دیکھ لوں گا''۔ وہ بولا تھا۔

''اوکے سر! جیسا آپ مناسب سمجھیں''۔ وہ تابعداری سے بولی تھی اور چند ادھر اُدھر کی باتوں کے ساتھ فون ڈسکنیکٹ ہوگیا تھا۔

☆..........☆..........☆

''مس رطابہ! آپ فکر مت کیجیے، آپ کا رضا کے کیس سے نام ہٹالیا گیا ہے''۔ مسٹر واسطی نے اسے فون پر اطلاع دی تھی۔ اس لیئے وہ ان کے پاس چلی آئی تھی۔

''کیسے؟'' وہ حیرت زدہ سی گویا ہوئی۔

''رحیم چوہدری نے سب معاملات حل کیئے ہیں''۔ مسٹر داسطی نے جواباً آگاہ کیا تھا۔

''اوہ اچھا''۔ وہ مطمئن سی بولی تھی۔

''پر مس رطابہ کیا آپ مسٹر رضا کے ساتھ وہاں تھیں؟'' مسٹر واسطی کا انداز کریدنے والا تھا، وہ بل کھا کر رہ گئی تھی۔

''دیکھیں مسٹر واسطی! میں وہاں اس سے ایک بزنس ایشو پر ملنے گئی تھی ادراس کا قتل میرے وہاں سے جانے کے بہت دیر بعد ہوا تھا''۔ اس کا انداز کوفت بھرا تھا۔

''اوہ اچھا''۔ وہ بھی اسی کے انداز میں بولا تھا۔ وہ بے دلی سے اس کے آفس سے نکل آئی تھی۔

☆..........☆..........☆

''اس سب کے بدلے میں تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہوگا''۔ آفاق چوہدری کا باپ کرخت لہجے میں بولا تھا۔

''ج ج جی کون سا کام؟'' وہ ہکلائی تھی۔

''بتادیں گے مگر اگر اس کام کی بابت کسی کو پتہ چلا تو سچ مچ تمہاری عزت کی چادر تار تار ہوجائے گی''۔ گوری

کواس لمحے وہ ایک ذلیل، ہوس زدہ بھیڑیا لگا تھا مگر وہ اس سب میں بری طرح پھنس چکی تھی۔
''اگر وہ یہاں نہ آتی تو یہ سب نہ ہوتا''۔ اس نے اپنے آپ کو ہزاروں مرتبہ کوسا تھا۔ پر وہ جانتی تھی اسے اب رحیم چوہدری کے اشاروں پر مجبوراً ناچنا تھا اور رحیم چوہدری کو اور کوئی تجربہ ہو یا نہ ہو دوسروں کو اپنے اشاروں پر نچانے کے تجربے پر کافی مہارت حاصل تھی۔

☆......☆......☆

''رطابہ! تمہارا باپ زندہ ہے؟'' یہ انجان لاتعلق بات جو اس نے وہم وگمان میں بھی نہ سوچی تھی اماں نے دومنٹ میں کہہ دی تھی۔
''کک کیا، ایسا کیسے ہوسکتا ہے''۔ اس کو لگا جیسے یہ کانوں کا دھوکہ ہو۔
''جو بھی کرنا، اب سوچ سمجھ کر کرنا، اسی بات کی وجہ سے میں ڈرتی تھی، چوہدری رحیم سے کوئی بعید نہیں وہ گھٹیا آدمی کچھ بھی کرسکتا ہے''۔ اماں کا لہجہ سپاٹ تھا۔
''مگر اماں! آپ کو کیسے پتہ چلا اور آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا''۔ آنسو بے اختیار چھلکنے کو بے تاب ہوئے تھے۔
''مجھے تو پتہ نہیں کتنے سالوں کا پتہ تھا''۔ اماں کھوئی کھوئی بولی تھیں۔
''کیا مطلب؟''
''کچھ نہیں، بس تم اب ذرا اور ہوشیار رہنا''۔ اماں نے یہ کہہ کر فوراً فون بند کردیا تھا۔
جبکہ رطابہ تو یہ سب جان کر ابھی تک بے یقین تھی کہ اس کا باپ زندہ ہے، اس کا دل یکدم پرسکون ہوگیا تھا۔

☆......☆......☆

''مس رطابہ! آپ کو پتا تو ہے یہ پولیس اور میڈیا والے رائی کا پہاڑ بنا لیتے ہیں، پر میں نے ان سب کا منہ بند کردیا''۔ وہ اس وقت چوہدری رحیم کے آفس میں موجود تھی۔
''جی سر! میں آپ کی بہت مشکور ہوں ورنہ میں کہاں کہاں تک خوار ہوتی''۔ اس کا لہجہ سنجیدگی سے پُر تھا۔
''ہوں، مس رطابہ! آپ کچھ کہنے آئی تھیں، آئی تھنک''۔
''جی سر! میں ایک بات پوچھ سکتی ہوں''۔ وہ بولی تھی۔
''جی مس رطابہ پوچھیں''۔ وہ مسکرایا تھا اور رطابہ کو اس کی یہ مسکراہٹ زہر لگی تھی۔
''سر آپ نے Project dealing کینسل کیوں کی؟'' اس نے پوچھتے وقت اپنے لہجے کو لاپرواہ بنانے کی ایک ہلکی سی کوشش کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہی تھی۔
''اوہ... مس رطابہ بس کچھ پرسنل میٹرز کی وجہ سے ایسا کرنا پڑا''۔
''پر سر! یہ میٹنگ آپ کے اختیار میں تو نہیں تھی کہ آپ ردوبدل کرتے''۔ اس نے دوٹوک لہجے میں جواباً پوچھا تھا، چوہدری رحیم مسکرایا تھا۔
''ہاں، بس کچھ باتیں راز ہی رہنی چاہئیں''۔ وہ اس انداز پر تلملا کر رہ گئی تھی۔
''اوکے سر''۔ وہ پھیکا سا مسکرائی اور اجازت لے کر باہر نکل آئی۔
''راز بکھرتے رہتے ہیں، تمہارے سارے راز میں ہی فاش کروں گی، ڈال لو جتنے اپنے کالے کرتوتوں پر پردے ڈالنے ہیں، بے نقاب تمہیں میں ہی کروں گی''۔ یہ کہتی وہ دوسری جانب بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''سر پلیز! تھوڑا سا سوپ ہی پی لیجیے، دیکھیں آپ کی صحت دن بدن ڈاؤن ہوتی جا رہی ہے، آپ کے لئے یہ بہت ضروری ہے، پلیز پی لیجیے''۔ فلپائنی ملازمہ نے سوپ کا بھرا پیالہ اس شخص کے آگے کیا تھا۔ پر وہ شخص چت لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔

''سر دیکھیں! یہ سوپ ہی آپ کی خوراک ہے، اگر آپ یہ نہیں پئیں گے تو ٹھیک کیسے ہوں گے''۔ ملازمہ نے ایک مرتبہ پھر اپنا سر پیٹا تھا۔ پر اگلے پر ان سب باتوں کا اثر ندارد تھا۔

''میں نے بڑے سر کو فون کیا ہے، وہی اب آپ کو پوچھیں گے''۔ اس مرتبہ اس شخص نے پلکیں جھپکائی تھیں اور بمشکل ایک لفظ بولا تھا۔ فلپائنی ملازمہ یہ لفظ سن کر ششدر رہ گئی تھی۔

☆..........☆..........☆

''رطابہ! اس مرتبہ کافی ٹائم ہو گیا تم اپنے گاؤں نہیں گئیں''۔ وہ حسب معمول بستر پر لیٹی مطالعہ میں مصروف تھی جب علیشاء کلینزنگ کریم اپنے ہاتھوں پر ملتے ہوئے اس کے قریب لیٹتے ہوئے بولی تھی۔

''اب ایک مرتبہ ہی جاؤں گی''۔ اس نے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا تھا۔

''کیا مطلب؟'' علیشاء کو اچنبھا ہوا۔

''کچھ نہیں''۔ وہ لاپرواہ سا بولی تھی۔

''یہ آج کل تم کن خیالوں میں رہ رہی ہو رطابہ، ہر بات کا ادھورا جواب، بے پرواہ انداز، یہ ہو کیا گیا ہے تمہیں''۔ علیشاء اس کے انداز پر جھنجھلا کر گویا ہوئی تھی۔

''کیا ہوا ہے مجھے، اچھی بھلی ایکٹو ہوں''۔ اس نے مذاق میں بات ٹالتے ہوئے کہا۔

''بات کو ٹالو مت، اچھا۔ تم بتانا نہیں چاہتی دوسری بات ہے پر کچھ ہے جو تم مجھ سے بھی چھپا رہی ہو، تم مانو یا نہ مانو''۔ علیشاء دوٹوک لہجے میں بولی تھی۔

''اف ایک تمہاری ابھی تک شک کرنے کی عادت نہیں گئی، ہر بات میں بیویوں کی طرح تفتیش شروع کر دیتی ہو''۔ رطابہ نے اس کا ذہن اس بات سے بھٹکایا تھا اور علیشاء واقعی اس بات سے بھٹک گئی تھی۔ رطابہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔

☆..........☆..........☆

''ہم تھوڑی دیر میں حویلی پہنچنے والے ہیں، اس ڈرامے کا اینڈ تیار رکھیں''۔ شہلا چوہدری نے میسج ٹائپ کر کے فوراً چوہدری رحیم کو سینڈ کیا تھا جبکہ دوسری طرف آفاق کی پریشانی حد سے سوا تھا۔ اس کے دل میں ابھرنے والے وسوسے کچھ غلط ہونے کا سگنل دے رہے تھے۔ وہ جلد از جلد مہرو کے پاس پہنچنا چاہتا تھا پر سفر تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ شہلا بیٹے کی بے چینی سے خوب لطف انداز ہو رہی تھیں اور اس وقت وہ ماں نہیں صرف بیوی بن چکی تھیں۔ ایک ظالم، جابر انسان کی بیوی...

گاڑی شہر کی حدود میں داخل ہو چکی تھی پر چوہدری آفاق کے دل کو بے چینی ابھی تک لاحق تھی۔

☆..........☆..........☆

''مہر بی بی دروازہ نہیں کھول رہیں صاحب''۔ سکینہ دوڑتی ہوئی چوہدری رحیم کے پاس آئی تھی۔

''واش روم میں ہو گی''۔ چوہدری رحیم کا انداز لاپرواہی لئے ہوئے تھا۔

''صاحب باہر کے دروازے پر بھی کنڈی لگی ہوئی ہے''۔ سکینہ نے ڈرتے ڈرتے پھر بتایا تھا۔

''سکینہ تمہیں پتہ ہے میں دو دن بعد آج گھر آ رہا ہوں، تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہو''۔ چوہدری رحیم دھاڑا تھا، سکینہ خوف سے سمٹ کر رہ گئی تھی۔

''صاحب مم میں تو''۔ وہ ہکلائی تھی۔

''گارڈز کو بلا کر دروازہ تڑواؤ''۔ چوہدری رحیم نے اگلا حکم صادر کیا تو سکینہ دوڑتی ہوئی باہر کی جانب بھاگی اور اگلے چند منٹ میں تمام گارڈز دروازہ توڑنے میں مصروف ہو چکے تھے، بھاری دیوہیکل دروازے کو توڑنا اتنی آسان بات تو نہ تھی، پر چند کوششوں کے بعد دروازہ ٹوٹ کر وا ہو گیا اور کمرے کا منظر سب ملازموں کا دل دہلا گیا تھا۔

☆..........☆..........☆

اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک اندھیری گھپ اندھیری کوٹھڑی میں پایا، وہ ہڑبڑا کر اٹھی تھی بے ہوشی کی وجہ سے ذہن ابھی بھی غنودگی میں تھا۔

''یہ میں کہاں ہوں''۔ وہ بڑبڑائی تھی اور چند لمحوں بعد وہ غنودگی سے نکل آئی تھی، یکدم دو دن پہلے ہوا واقعہ پوری فلم کی طرح اس کی آنکھوں میں گھومنے لگا تھا۔

''میں اغوا ہو گئی ہوں''۔ یہ سوچتے ہی اس کا دل بند ہو گیا تھا۔ وہ دروازے کی جانب بھاگی تھی لیکن گھپ اندھیرے میں دروازے کو ڈھونڈنا مشکل تھا، وہ دیواروں کو ٹٹولتی لڑکھڑاتی بالآخر دروازے تک پہنچ گئی تھی۔

''کوئی ہے خدا کے لئے میری مدد کرو، نکالو مجھے یہاں سے''۔ وہ زور زور سے چلاتی دروازے کو کھٹکھٹا رہی تھی لیکن دوسری جانب مکمل ساکت خاموشی ہنوز موجود تھی۔

''کوئی تو میری مدد کرو''۔ وہ روتے ہوئے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

☆..........☆..........☆

''مس رطابہ! اگلے ہفتے کو میٹنگ فائنل ہے، آپ وقت پر آفس میں موجود رہئے گا''۔ چوہدری رحیم نے اسے فون پر آگاہ کیا تھا۔

''جی سر! میں ضرور پہنچوں گی''۔ پچھلے دو دن سے موسمی اثرات کے باعث اس کی طبیعت تھوڑی ناساز تھی اس لئے وہ آفس سے چھٹی پر تھی۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' چوہدری رحیم نے رسماً پوچھا۔

''جی بہتر ہے سر''۔ وہ بولی۔

''او کے پھر اگلے ہفتے آفس میں ملاقات ہوتی ہے تب تک آپ چھٹیاں انجوائے کریں''۔ چوہدری رحیم نے مسکراتے ہوئے کہا اور چند رسمی باتوں کے بعد فون بند ہو گیا۔

''کون تھا؟'' علیشاء نے پوچھا۔

''سر تھے آفس سے''۔

''ہوں، آفس آنے کا کہہ رہے ہوں گے''۔

''ہاں یہی کہا ہے''۔

''ویسے رطابہ! تمہارے سر کافی ڈیشنگ ہیں''۔ اس نے دوسری بات چھیڑ دی تھی۔

''مطلب؟'' رطابہ بولی۔
''آئی مین تمہارے سر کی جتنی ایج ہے اتنے کے لگتے نہیں ہیں، خود کو کافی مین ٹین رکھا ہوا ہے انہوں نے''۔
علیشاء کے لہجے میں متاثر ہونے کی جھلک نمایاں تھی۔
''ہوں...'' وہ بے نیازی سی گویا ہوئی۔ علیشاء اس کے بیگانہ انداز کو ناسازی طبع کے باعث نظر انداز کر گئی تھی۔
''اچھا تم آرام کرو لگتا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے''۔ علیشاء لائٹ آف کر کے روم سے باہر نکل آئی تھی۔
''ارے علیشاء، مس فریحہ کے نوٹس ہوں گے تمہارے پاس''۔ اکنامکس ڈپارٹمنٹ کی زنیرا اسے دیکھتے ہی فوراً اس کی جانب آئی تھی۔
''ہاں ہیں پر ابھی نہیں دے سکتی''۔ علیشاء نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے نفی میں جواب دیا۔
''کیوں نہیں دے سکتیں؟'' زنیرا نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''روم میں رطابہ آرام کر رہی ہے، وہ جاگتی ہے تو تمہیں دے جاتی ہوں''۔
''اوہ اچھا، ویسے ایک بات پوچھوں؟'' زنیرا کا انداز سرگوشیانہ سا تھا۔
''پوچھو''۔ علیشاء بولی۔ وہ دونوں چلتے چلتے ہوسٹل سے ملحقہ باغ کی جانب نکل آئی تھیں۔
''یہ تمہاری فرینڈ رطابہ کچھ پراسرار عادتوں کی مالک لگتی ہے''۔ زنیرا نے دھیمی آواز میں گوہر افشانی کی تھی۔
''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' علیشاء کو تو یہ سن کر پتنگے ہی لگ گئے تھے۔
''مطلب یہ نہ وہ کسی سے ملتی ہے نہ بات کرتی ہے، چلو ہم مانتی ہیں وہ ہمارے ساتھ نہیں پڑھتی پر پھر بھی وہ تمہارے سوا ہوسٹل کی کسی لڑکی سے بات نہیں کرتی، آدم بیزار لگتی ہے''۔ زنیرا نے تفصیلاً اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔
''مس زنیرا! یہ باتیں تم اس کے سامنے جا کر کہو، پراسرار، آدم بیزار، وہ تمہارا منہ توڑ دے گی''۔
''کیوں توڑ دے گی، میں نے غلط تو نہیں کہا''۔ زنیرا نے تن کر دوبدو کہا۔
''رطابہ جیسی بھی ہے اس کی اپنی زندگی ہے، ہر انسان کی نیچر الگ ہوتی ہے، کچھ کم گو ہوتے ہیں کچھ باتونی، کچھ اپنے آپ میں رہتے ہیں، کچھ ہر کسی کے معاملے میں اپنی ٹانگ اڑاتے ہیں، کچھ معاملہ فہم ہوتے ہیں، کچھ معاملہ بگاڑ ہوتے ہیں، کچھ سمجھدار ہوتے ہیں، کچھ بے وقوف ہوتے ہیں، اب ہم ہر کسی کو ایک ہی صف میں کھڑا نہیں کر سکتے''۔ علیشاء نے جواباً ایک دھواں دھار تقریر کر کے اس کے چھکے چھڑا دیئے، وہ اس کارروائی پر بھونچکی کھڑی رہ گئی تھی۔
''کچھ اور کہنا ہے یا میں جاؤں''۔ علیشاء نے مسکراتے ہوئے اس کے چہرے پر نظر ڈالی۔
''نن نہیں''۔ وہ بمشکل بولی تھی اور علیشاء اس کے ہوائیاں اڑتے چہرے کو دیکھ کر مسکرا اٹھی تھی۔
''اب کچھ بولنے سے پہلے ہزار دفعہ سوچو گی''۔ یہ کہتے ہوئے وہ دوسری جانب بڑھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

کمرے کی ابتر حالت دیکھ کر ملازموں کا دل بند ہو گیا تھا۔
''کیا ہوا؟'' چوہدری رحیم خراماں خراماں چلتا اس جانب آیا تھا۔

''وہ صاحب مہر بی بی کو کسی نے اغوا کرلیا ہے''۔ سکینہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی زبان کھولی تھی۔

''واٹ، اوہ مجھے پہلے دن سے ہی پتہ تھا اس نیچ ذات کی لڑکی نے یہی گل کھلانا تھا، بھاگ گئی ہے وہ اپنے یار کے ساتھ، بٹا لگا گئی چوہدریوں کی عزت کو''۔ یہ غلیظ الفاظ کہتے ہوئے چوہدری رحیم خود نیچ سے نیچ تر لگ رہا تھا پر اپنے گریبان میں جھانکنا کون پسند کرتا ہے۔

''اغوا نہیں ہوئی نیچ ذات خود بھاگ گئی''۔ رحیم چوہدری کی دھاڑ نے نیچے کھڑے آفاق چوہدری کا دل دہلا دیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ریتلی دیوار کی طرح نیچے گرتا محسوس کررہا تھا اور بالآخر سچ مچ نیچے گر گیا تھا۔

☆............☆............☆

''تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہوگا؟'' چوہدری رحیم کی اس بات پر گوری کا دل بڑی بے ترتیبی سے دھڑکا تھا۔ اس نے اپنی پسینے سے تر ہتھیلیوں کو اپنے گرد پھیلی چادر کے اور اندر کیا تھا۔

''کک، کون سا کام؟'' وہ ہکلا کر بولی تھی۔

''ہمارے پاس ایک لڑکی ہے جو قید میں ہے، تمہیں اس کے ساتھ رہنا ہے''۔ اس بات پر اس کی رکی سانس بحال ہوئی۔

''مگر کیوں؟'' اب کے وہ تھوڑا اعتماد سے بولی۔

''وہ امید سے ہے، لڑکی تمہارے دماغ میں بھوسا بھرا ہے کیا؟'' یہ آواز شہلا چوہدری کی تھی۔

''کہاں ہے وہ؟'' اس نے پوچھا۔

''لے چلیں گے تمہیں''۔

''مگر میرے گھر والے کیا کہیں گے''۔

''ہم سب سنبھال لیں گے''۔ چوہدری رحیم نے نخوت بھرے لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے مجھے منظور ہے''۔ اس نے مثبت جواب دیا پر وہ یہ نہیں جانتی تھی قسمت اس کے ساتھ کیا کھیل کھیلنے والی ہے۔

☆............☆............☆

''مم، مم مہر، مم، ماہ''۔ یہ پانچ الفاظ ملازمہ کو ششدر کر گئے تھے۔ وہ حیران سی اس شخص کو تکے جارہی تھی جس نے دو سال میں پہلی مرتبہ مکمل الفاظ بولے تھے۔

''مہر ماہ یہ کون ہے سر؟'' ملازمہ نے خوشی سے سوالیہ پوچھا تھا۔

''مم، مہر، مم ماہ''۔ یہ الفاظ دوبارہ اس کے منہ سے نکلے تھے۔

''سر کون ہیں یہ بتائیے، اگر ممکن ہوا تو میں ان کو یہاں بلالوں گی''۔ ملازمہ نے اپنی طرف سے مدد کرنی چاہی تھی پر وہ یہ نہیں جانتی تھی اس شخص نے 23 برس بعد یہ مکمل الفاظ بولے ہیں، اگر جان جاتی تو ضرور بے ہوش ہو جاتی۔ کئی باتیں راز ہی رہیں تو زیادہ اچھا ہوتا ہے۔

☆............☆............☆

''آفاق صاحب کو سخت قسم کا اسٹروک (فالج) ہوا ہے، وہ جسمانی طور پر معذور ہو چکے ہیں''۔ ڈاکٹر جمیل انصاری کے یہ الفاظ پگھلا سیسہ بن کر رحیم چوہدری کے کانوں میں اترے تھے۔

''یہ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے''۔ رحیم چوہدری یکدم لڑکھڑایا تھا۔ اس خبر نے اس

کے ہوش وحواس چھین لئے تھے۔

''سوری رحیم صاحب! وہ اپنے بولنے کی طاقت بھی کھو چکے ہیں''۔ ایک اور خبر رحیم چوہدری کے اوپر پہاڑ بن کر ٹوٹی تھی، وہ پاس رکھی کرسی پر ڈھے سا گیا تھا۔

''مگر یہ کیسے ہوا؟''

''ان کو کوئی بہت سخت قسم کا صدمہ پہنچا ہے یا دیا گیا ہے، آئی ڈونٹ نو پر اسٹروک کی وجہ یہی بنا ہے''۔ ڈاکٹر یہ کہہ کر چلا گیا تھا پر رحیم چوہدری کو تپتے صحرا میں کھڑا کر گیا تھا۔

''میں شہلا کو کیسے بتاؤں گا''۔ چوہدری رحیم کے ہونٹ بڑبڑانے کے انداز میں ہلے تھے۔

اور یوں آفاق چوہدری، رحیم چوہدری کی سازش کو جانے بغیر زندہ لاش بن گیا تھا۔

مہر ماہ اور اس کے ساتھ کی اٹوٹ ڈوری بیل میں توڑ کر ہوا میں اچھال دی گئی تھی اور یہ قصہ بھی بغیر حل ہوئے کسی تابوت کی طرح زمین کی گہرائی میں دفنا دیا گیا تھا۔

یہ کہانی شروع کرنے سے پہلے ہی ختم کردی گئی تھی۔

☆..........☆..........☆

گاڑی گاؤں کی حدود سے نکل کر شہر میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ خاموشی سے ان انجانے راستوں کو دیکھ رہی تھی۔ ان نگاہوں میں نہ شوق تھا نہ اشتیاق، بس ایک بے چینی تھی۔ دل بھی الگ سہما سا تھا۔

''پتہ نہیں جہاں میں جا رہی ہوں وہاں کیا ہوگا، کہیں یہ لوگ مجھے کہیں اور تو نہیں لے جا رہے''۔ ایسی لاتعداد سوچیں، وسوسے پورا راستہ اس کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ گاڑی میں ایک عورت اور دو مرد موجود تھے۔ وہ عورت کی موجودگی میں بھی خوفزدہ ہو رہی تھی اور ایسے ہی آنکھ مچولی میں پورا راستہ کٹ گیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے مطلوبہ جگہ رکی تھی۔

☆..........☆..........☆

طبیعت تھوڑی بہتر ہونے پر وہ آج آفس چلی آئی تھی۔ آفس داخل ہوتے ہی اسے پتہ چل گیا تھا کہ چوہدری رحیم آفس نہیں آئے اور مس ناجیہ نے اس کی تصدیق بھی کردی تھی۔

''سر! دبئی گئے ہیں اپنے پرسنل کام سے''۔ مس ناجیہ نے اسے سرسری سا آگاہ کیا تھا۔

''اچھا، پر دبئی میں کون سا کام ہو سکتا ہے، وہ بھی پرسنل''۔ اس نے سوچا، پر کوئی سرا ہاتھ نہ لگا تھا۔

''کچھ کہا آپ نے مس رطابہ؟''

''نہیں کچھ نہیں''۔ وہ بولی۔

''آپ یہ فائلیں دیکھ لیں پھر میں لے جاؤں گی''۔ مس ناجیہ نے فائلیں میز پر اس کے آگے رکھی تھیں۔

''اوکے میں دیکھ لوں گی، جائیں آپ''۔ یہ کہہ کر وہ فون کی جانب متوجہ ہوگئی جہاں کسی کی کال آرہی تھی۔

''ہیلو، جی کون؟'' اس نے فون اٹھاتے ہی پوچھا تھا۔

''آپ مس رطابہ بات کر رہی ہیں پاکستان سے، سر رحیم چوہدری کی سیکریٹری''۔ فون کرنے والی نے مکمل معلومات لینی چاہی تھی۔

''جی میں ہی رطابہ ہوں''۔ وہ بولی۔

''اوکے، دومنٹ ہولڈ رکھیں سر آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں''۔ یہ کہہ کر وہ غائب ہوگئی۔ فون پر مسلسل

ہولڈ ٹیون بجنا شروع ہوگئی تھی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا، نمبر لینڈ لائن تھا۔

''ہیلو رطابہ! میں رحیم چوہدری بات کر رہا ہوں''۔ دو منٹ بعد فون پر رحیم چوہدری کی آواز گونجی۔

''السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟''

''فائن مس رطابہ! میں دبئی سے کال کر رہا ہوں''۔

''جی سر! مجھے علم ہو گیا تھا''۔ وہ بولی تھی۔

''ہوں، مجھے آپ کو انفارم کرنا تھا کہ میں دو تین دن تک آجاؤں گا، مجھے ابھی خان ٹیکسٹائل کا فون آیا ہے، وہ اپنا پروجیکٹ ہمارے ساتھ کرنا چاہتے ہیں اس سلسلے میں آپ دیکھ لیجیے گا''۔ چوہدری رحیم نے فون کی بابت آگاہ کیا تھا۔

''جی سر! ان کی فائلز میرے پاس آچکی ہیں، میں دیکھ لوں گی''۔ اس نے سر ہلایا۔

''ہوں گڈ''۔ چوہدری رحیم ریلیکس سا بولا تھا۔

''کچھ اور سر''۔ اس نے پوچھا۔

''نہیں کچھ نہیں، او کے بائے''۔ فون کٹ گیا تھا۔ پر رطابہ فون ابھی تک ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔

''یہ پہلی دفعہ ہے سر نے مجھے اس جگہ کا نہیں بتایا، ورنہ ہر جگہ کا مجھے علم ہوتا ہے، کچھ تو ہے''۔ وہ سوچے جا رہی تھی۔ الجھے جا رہی تھی پھر یکدم اس کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔

☆..........☆..........☆

''گاڑی آگے نہیں جا سکتی، یہیں اترو''۔ ساتھ آئی عورت نے کرخت لہجے میں اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے گاڑی سے اتر گئی تھی۔ تنگ تنگ گلیاں، گندی غلاظت بھری نالیاں یہاں کے مکینوں کی حالت کا بخوبی بتا رہی تھیں، یہ کم درجے کے مزدوروں کے طبقے سے تعلق رکھنے والوں کا محلہ تھا، غربت مفلسی یہاں کے انگ انگ سے ٹپک رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ان کے پیچھے چلتی جا رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد وہ ایک بوسیدہ سے مکان کے سامنے رکے تھے۔

''اندر چلو''۔ وہی عورت دوبارہ بولی تھی۔ ان میں سے ایک مرد راستے میں ہی اتر گیا تھا وہ مرد اور عورت کے پیچھے اندر داخل ہو گئی تھی۔

☆..........☆..........☆

''آفاق میرے بیٹے، کیوں مجھے جلا رہے ہو، یہ جلاپا 23 برس میں روز مجھے جلاتا ہے، اب تو معاف کر دو''۔ رحیم چوہدری آفاق چوہدری کا ہاتھ تھام کر بولا تھا۔

''اس دکھ میں تمہاری ماں بھی مر گئی، میں اکیلا ہو گیا ہوں، میرا اتنا بزنس میرے بعد کون سنبھالے گا''۔ 23 برس گزرنے کے بعد بھی رحیم چوہدری نہ بدلا تھا، وہ کہتے ہیں ناں رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔

''ڈاکٹرز کہتے ہیں تم خود ہی ٹھیک نہیں ہونا چاہتے، تم اپنی ول پاور use ہی نہیں کرنا چاہتے، ایسے مت کرو آفاق، ایسا مت کرو، کچھ اس بوڑھے باپ کا ہی خیال کر لو''۔ آفاق ان سب باتوں پر بغیر کچھ ردعمل ظاہر کیے چپ لیٹا تھا۔

''کچھ تو بولو آفاق''۔ چوہدری رحیم نے اس کا ہاتھ سہلایا۔

''مم، مہر، مم، ماہ''۔ یہ الفاظ چوہدری رحیم کے تن بدن میں آگ لگا گئے تھے، انہیں لگ رہا تھا انہیں آج پھر

نئے سرے سے تپتے صحرا میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔

"تم اس بے غیرت، نیچ ذات لڑکی کو آج بھی نہیں بھولے"۔ چوہدری رحیم نے نرمی کا چولا اتار پھینکا تھا۔ آفاق یہ دیکھ کر عجیب سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے مسکرایا تھا۔

"تم آج بھی اس نیچ لڑکی کی محبت میں پور پور ڈوبے ہو، تم نہیں بدل سکتے آفاق، میں ویسے ہی ٹائم ویسٹ کرنے یہاں آیا ہوں، کچھ حاصل نہیں ہوگا مجھے تم سے، جاؤ بھاڑ میں تم"۔ وہ چیختا چلاتا کف اڑاتا چلا گیا تھا۔ آفاق کے ہونٹوں پر اب بھی زخمی مسکراہٹ ہنوز موجود تھی۔

☆..........☆..........☆

"ہیلو! ہاں اشرف مجھے آج شام پانچ بجے ملو"۔

"پر کہاں میڈم رطابہ؟" اشرف نے پوچھا۔

"کسی پارک میں جونزدیک ہو"۔

"اوکے میڈم میں آجاؤں گا"۔

"ٹھیک ہے"۔ اس نے فون بند کر دیا۔

"مجھے کسی طریقے سے اس دبئی کا راز جاننا ہے، ہر مہینے میں ان کا دبئی کا چکر ضروری لگتا ہے، کچھ تو ہے دبئی میں، شاید مجھے اس انفارمیشن سے کچھ معلوم ہو جائے"۔ وہ سوچتی ہوئی آفس سے باہر نکل آئی تھی۔ اسے جلد از جلد پارک پہنچنا تھا۔

"ہیلو، ہاں میں پہنچ گئی ہوں"۔ اس نے اشرف کا نمبر دوبارہ ملایا تھا۔

"ٹھیک ہے میڈم! میں بھی دس منٹ میں پہنچتا ہوں"۔ اشرف تابعداری سے بولا تھا۔

"اوکے"۔ اس نے فون آف کر کے ہینڈ بیگ میں ڈال دیا تھا۔ وہ آفس ٹائم میں باہر نکلی تھی۔ اس لئے وہ نہیں چاہتی تھی کہ آفس کا کوئی بندہ کال کرے اور اسے یہاں کا معلوم ہو جائے۔ وہ ہر معاملے میں احتیاط برت رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

"ارے بہن، اس مرتبہ رطابہ بٹیا کو فون کیے کافی مہینے نہیں ہو گئے"۔ پڑوسن بوا نے پاس بیٹھی اماں سے پوچھا تھا۔

"بوا دو دن پہلے کیا تھا، ٹھیک ہے"۔ اماں نے سرسری سا بتایا۔

"ہونہہ... ویسے ہے بڑی سمجھدار تمہاری بیٹی، کیسے لڑکی ہو کر بھی پورے گھر کی ذمہ داری سنبھال رہی ہے"۔

"جی بوا! آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں"۔

"ہونہہ، بس اب جلدی سے اس کے ہاتھ پیلے کر دو"۔

"جی بوا سوچوں گی"۔

"ارے پگلی، اس میں سوچنا کاہے کا، شادی تو کرنی ہے ناں"۔ بوا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"رطابہ مانے گی تو ہی کر سکتی ہوں"۔

"تم ماں ہو اس کی، یہ تمہارا فرض ہے"۔

"جی بوا، اس دفعہ آئی تو میں بات کروں گی"۔

''ضرور کرنا، بیٹیاں جتنی جلدی اپنے گھروں کی ہوجائیں ماں باپ کے لئے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے''۔ بوا کی اس بات پر نجانے کیوں اماں کے رُکے آنسو بہہ نکلے تھے۔

☆............☆............☆

''اس کمرے میں ہے وہ عورت، تمہیں بھی یہیں رہنا ہوگا، جب تک اس کا کچھ بندوبست نہیں ہو جاتا، اور ہاں کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تم انجام جانتی ہو''۔ وہ عورت اسے خبردار کررہی تھی اور وہ بے بسی سے ہر بات پر سر ہلارہی تھی۔ اس کے سوا اس کے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔

''تم بھی ساتھ رہو گی ناں'' ۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔

''نہیں، چوہدری صاحب کا حکم ہے صرف تم یہاں رہو گی'' ۔

''ٹھیک ہے''۔ وہ بے بسی سے سر ہلا گئی تھی۔

☆............☆............☆

''میڈم! خیریت تو ہے، اتنی ایمرجنسی میں بلایا''۔ اشرف مطلوبہ جگہ پہنچتے ہی بولا تھا۔

''ہاں خیریت ہی ہے، تمہیں میرا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے''۔ وہ مطلب کی بات پر آگئی۔

''جی حکم کیجئے''۔ اشرف تابعداری سے گویا ہوا۔

''تمہیں ایک شخص کا پتہ لگانا ہے جو دبئی میں ہے، مجھے اس شخص کی پوری انفارمیشن چاہئے''۔ وہ بولی تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے رطابہ میڈم مگر''۔ اشرف نے یہ سن کر بات ادھوری چھوڑی۔

''اگر مگر چھوڑو، پیسہ جتنا تم کہو گے ملے گا، بس مجھے ہر حالت میں یہ انفارمیشن چاہئے''۔ اس کا لہجہ سختی بھرا تھا۔ اشرف نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے میڈم! آپ مجھے اس شخص کی پوری ڈیٹیل سینڈ کردیں، میں آپ کی مطلوبہ انفارمیشن آپ تک پہنچادوں گا''۔

''اوکے گڈ، بس مجھے اب انتظار رہے گا''۔ وہ مسکرائی تھی۔

☆............☆............☆

''برس ہا برس بیت گئے، اس انتظار کی سولی پر لٹکتے، پر میرا انتظار لا حاصل ہی رہا۔ اب تو بڑھاپا آپہنچا آفاق چوہدری، اب تو اس رگ رگ میں بسے انتظار کی لو بھی بجھتے دیئے کی طرح ہوتی جارہی ہے، پتہ نہیں کب یہ ٹمٹماتا دیا بجھ جائے، مجھے اب اپنی پرواہ نہیں رہی، بس تمہاری بیٹی کی فکر ہے۔ ایک دفعہ تم مل جاؤ آفاق تو تمہاری بیٹی تمہیں سونپ کر سکون سے مرسکوں، مجھے تو تم سے جدا ہونا پڑا، پر اب اپنی بیٹی سے تمہیں کبھی جدا نہیں ہونے دوں گی، تم دونوں کا ملن ضرور ہوگا آفاق چوہدری ضرور ہوگا''۔ اس سرزمین پر کوئی ایسا بھی تھا جسے آفاق چوہدری کے ملن کا آج بھی انتظار تھا، پر وہ کون تھا؟

☆............☆............☆

''تم کون ہو اور مجھے یہاں کیوں قید کیا ہے، مجھے چھوڑ دو''۔ گوری کا مہرو سے پہلا سامنا اس جملے پر ہوا تھا۔

''مم... میں گوری ہوں، مجھے یہاں تمہاری دیکھ بھال کے لئے بھیجا گیا ہے''۔ گوری نے اس خوبصورت من موہنی سی لڑکی کو دیکھ کر کہا۔

''اوہ، تم بھی ان کے ساتھ ملی ہو''۔ اس نے جواباً نفرت بھری نگاہوں سے گوری کو دیکھا تھا۔

''نہیں مہر، مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں، میں بھی مجبوری میں یہاں لائی گئی ہوں''۔

''کیا مجبوری ہے، رحیم چوہدری نے تمہارے ساتھ بھی کوئی کھیل کھیلا ہے کیا؟'' مہر نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''میں خود اس کھیل میں پھنسی ہوں مہر''۔ وہ پھر ساری کہانی سناتی گئی اور مہر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''میرے پاس کوئی چارہ نہ تھا مہر، چوہدری رحیم نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ میری شادی آفاق سے کر دیں گے''۔ یہ الفاظ مہر کی پوری ہستی کو ہلا گئے تھے۔

☆.........☆.........☆

''شش شادی، آفاق سے''۔ چیخ نما آواز مہر کے منہ سے برآمد ہوئی تھی۔

''جی مہر، میں مجبور ہوں، یہی حل میری عزت پر لگا داغ دھو سکتا ہے، جن کی وجہ سے لگا ہے، میں ان سے شادی نہیں کرنا چاہتی پر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں ہے''۔ گوری کا لہجہ بے بسی لیے ہوئے تھا۔

''جو کچھ میں تمہیں بتانے جا رہی ہوں یہ سب جان کر بھی تم آفاق سے شادی کر لوگی''۔ مہر کے لبوں پر اذیت بھری مسکراہٹ در آئی تھی۔

''کیا مطلب، آپ کیا کہنا چاہتی ہیں''۔ گوری نے نا سمجھی کے عالم میں اسے دیکھا۔

''تمہیں پتا ہے عورت کی سب سے بڑی بے وقوفی کیا ہوتی ہے، وہ مرد پر جلدی اعتبار کر لیتی ہے، اور پھر جب وہی اعتبار ٹوٹتا ہے ناں تو عورت کو بڑی شدت سے اپنی اوقات یاد آتی ہے کہ مرد کبھی بھی عورت کو اعتبار کے قابل نہیں سمجھتا''۔ وہ لحظہ بھر کو رکی تھی۔

''تم جانتی ہو، تم آج جس عورت کے سامنے بیٹھی ہو وہ کون ہے؟'' مہر نے سوالیہ لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

''نہیں''۔ گوری کا سر نفی میں ہلا، وہ مسکرائی تھی۔

''یہ عورت جو تمہارے سامنے بیٹھی ہے یہ مہر آفاق ہے''۔ یہ الفاظ اب کے گوری کی پوری ہستی کو ہلا گئے تھے، گوری جواباً پھٹی پھٹی نگاہوں سے مہر کو دیکھ رہی تھی۔

☆.........☆.........☆

''ہیلو، جی چوہدری صاحب، آپ کا شک صحیح نکلا، وہ لڑکی گڑبڑ ہے''۔ اشرف نے اپنی مخصوص تابعداری اپناتے چوہدری رحیم کو آگاہ کیا تھا۔

''اوہ تو میرا اندازہ ٹھیک نکلا، اس لڑکی پر مجھے اسی دن شک ہو گیا تھا جس دن وہ اچانک بغیر کوئی اطلاع دیئے غائب ہوئی تھی، پر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟'' چوہدری رحیم پرسوچ انداز میں بڑبڑایا تھا۔

''چوہدری صاحب! اس نے مجھے دبئی کی معلومات کے لیے ہائر کیا ہے، وہ آپ کا راز جاننا چاہتی ہے''۔ اشرف نے ایک اور معلومات دان کی۔

''کہیں یہ آفاق کی بیٹی تو نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، ان دونوں نے تو نہر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی، نہیں یہ نہیں ہو سکتا''۔ چوہدری رحیم زندگی میں پہلی مرتبہ اتنے برے طریقے سے گھبرایا تھا۔

☆.........☆.........☆

''آپ آفاق چوہدری کی بیوی ہیں؟'' گوری نے سرسراتی آواز میں پوچھا تھا۔

''ہاں، میں ہوں مہر آفاق''۔ وہ تلخی سے مسکرائی تھی۔

''لیکن آپ یہاں کیوں اور اس حالت میں''۔ گوری کو یہ جان کر سخت صدمہ پہنچا تھا۔

''گوری نیچ ذات کی عورت جب اونچی ذات کے مرد سے محبت کرتی ہے تو پھر اس کا نتیجہ ایسا ہی نکلتا ہے''۔ اس کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی کرچیوں کی چبھن تھی۔ گوری نے دکھ سے اسے دیکھا تھا۔

''تو آپ کا مطلب آپ کی یہ حالت آفاق چوہدری نے کی''۔ گوری نے بات ادھوری چھوڑی۔

''نہیں آفاق نے نہیں کی، وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے گوری، پہلے جو کچھ ہوا وہ کرنے والا آفاق کوئی اور تھا، میں تو ایک غلط فہمی کے نتیجے میں ان کی زندگی میں آئی تھی۔ تمہارے واقعہ نے انہیں بدل دیا۔ تم نے انہیں بدعادی تھی کہ تمہاری بیٹی بھی میری جیسی ہو، اس کے بعد وہ بدل گئے، انہوں نے میرا خیال رکھنا شروع کر دیا اور اولاد کی خوشخبری سن کر تو وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگے لیکن چوہدری رحیم کی بدنظر ہماری خوشیوں کو کھا گئی۔ میں نے آفاق سے جنون کی حد تک عشق کیا ہے گوری جو مرنے کے بعد بھی کم نہ ہوگا''۔ یہ سب سن کر گوری کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی جسے اس نے بمشکل اپنے اندر اتارا تھا۔ پر نہ مہر جانتی تھی اور نہ گوری کہ مہر کا جنون عشق اس کی بیٹی کا جنون انتقام بن جائے گا۔

☆..........☆..........☆

''یہ رحیم چوہدری نے مجھے اتنی ایمرجنسی میں کیوں بلوایا ہے، وہ بھی اپنے گھر۔ اس کا لہجہ مجھے عجیب سا کیوں لگ رہا ہے، کچھ تو ہے، کہیں اسے میرے کھیل کا پتہ تو نہیں چل گیا''۔ ابھی پندرہ منٹ پہلے اسے چوہدری رحیم کی کال موصول ہوئی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ اس نے وہ Docoments بھی اپنے ساتھ رکھے، یہ بھی چوہدری رحیم نے ساتھ لانے کو کہے تھے۔

''ایسا کیا ہو سکتا ہے''۔ کوئی سرا ہاتھ آ کے نہ دے رہا تھا، لایعنی سوچیں کسی وحشی ناگ کی طرح اسے بار بار ڈستی جا رہی تھیں۔ رطابہ نہیں جانتی تھی اس دفعہ اس کی چال اُس پر الٹی پڑ چکی تھی۔

☆..........☆..........☆

میٹنگ کا دن دو دن بعد کا طے تھا، اس نے اپنا ضروری سامان پیک کر لیا تھا اور ہوسٹل کے چارجز وغیرہ بھی پے کر دیئے تھے۔ اس کا برسوں کا خواب بس پورا ہونے والا تھا۔ چوہدری رحیم کی بربادی بس نزدیک تھی اور یہ سوچیں اسے کافی خوش و مطمئن کر رہی تھیں۔

''رطابہ! تم مجھے چھوڑ کر جا رہی ہو؟'' علیشاء اس کے جانے کا سن کر افسردہ تھی۔

''ارے پگلی، میرا گاؤں تمہارے لئے ہمیشہ حاضر ہے، تم وہاں آتی جاتی رہو گی اور ہمارا رابطہ بھی رہے گا، میں بھی تم سے ملنے آتی رہوں گی''۔ رطابہ نے اسے دلاسا دیا تھا۔ حقیقتاً وہ خود بھی افسردہ تھی۔

''رطابہ! میری بہت اچھی دوست''۔ یہ کہتے ہی علیشاء اس کے گلے لگ گئی تھی، آنسو دونوں کے گالوں کو بھگو رہے تھے۔

''علیشاء تم مجھے بھی پریشان کر رہی ہو، ایسے میں کیسے جا سکوں گی''۔

''آنسوؤں پر اپنا اختیار کب ہوتا ہے، یہ تو کبھی بھی چھلک آتے ہیں''۔ علیشاء دکھ سے بولی تھی۔

''اوہ.... مس علیشاء تو فلسفہ بھی بولنے لگی ہیں''۔ رطابہ نے مذاق میں کہہ کر دکھی لہجے کو زائل کیا۔

"جی آپ کے ساتھ رہنے کا نتیجہ ہے"۔ علیشاء نے ہولے سے شرارت کی، رطابہ قہقہہ لگا کر رہ گئی تھی۔

☆..........☆..........☆

"ہاں سنو، بچے کے ساتھ ہی اس لڑکی کو مار دینا، کیا نام ہے اس کا، ہاں گوری، وہ ہمارے لئے مصیبت بن سکتی ہے اس لئے اس کا مرنا بہت ضروری ہے، میں کچھ دنوں کے لئے آفاق کو لے کر دبئی جا رہا ہوں، اس لئے مجھ سے کوئی رابطہ مت کرنا، تمہارے پیسے تمہیں مل جائیں گے"۔ یہ کہہ کر چوہدری رحیم نے فون کاٹ دیا تھا۔

"غریب لڑکیاں کتنی جلدی شادی جیسے جال میں پھنس جاتی ہیں، آئی بڑی میرے بیٹے سے شادی کرنے والی، پہلی والی غلطی میں دوبارہ دہراؤں گا کیا، اتنا پاگل سمجھ رکھا ہے مجھے"۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا اور اس لمحے وہ بہت ہیبت ناک لگ رہا تھا۔

☆..........☆..........☆

مہر اور آفاق کے گھر ایک بہت ہی خوبصورت سی بچی نے جنم لیا تھا جس کا نام گوری نے رطابہ رکھا تھا۔ اس لمحے مہر کو بڑی شدت سے آفاق کی کمی محسوس ہوئی تھی۔

"کہاں ہو آفاق، دیکھو تمہاری بیٹی تمہیں ڈھونڈ رہی ہے، تمہارے لمس کے لئے بے تاب ہو رہی ہے، اب تو آ جاؤ میرے لئے نہ سہی اپنی بیٹی کی خاطر ہی آ جاؤ"۔ دل سے فریادیں نکل رہی تھیں پر شنوائی نہ تھی۔ دل کی فریادیں دل میں ہی دب کر رہ گئی تھیں۔

"مہر! رطابہ نے نین نقش آپ کے اور رنگت باپ کی چرائی ہے"۔ گزرتے دنوں میں مہر اور گوری ایک دوسرے کے بہت قریب ہو گئی تھیں۔ دوستی کا رشتہ پروان چڑھتے چڑھتے بہناپے میں تبدیل ہو گیا تھا۔

"گوری تم میری رطابہ کا بہت خیال رکھنا، دیکھو اس دنیا میں میرے علاوہ اس کا کوئی نہیں، صرف ایک تم ہی ہو جس پر میں بھروسہ کر سکتی ہوں"۔ وہ اس سے وعدہ لے رہی تھی یا دے رہی تھی، گوری سمجھ نہ سکی تھی۔

"مہر یہ آپ کیسی خوفزدہ کر دینے والی باتیں کر رہی ہیں، خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو تو نہیں گیا جو آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں"۔ گوری نے دہل کر کہا تھا۔

"گوری اگلے وقت کا کسے پتا ہوتا ہے، بس اپنی تسلی کر لینا چاہتی ہوں، اللہ میری رطابہ کا نصیب اچھا کرے، اس کے نصیب میں بھی رحیم چوہدری جیسا شخص نہ آئے، چوہدریوں کا خون ہے، بس اگر ہو سکے تو اسے اپنے باپ سے ملوا دینا اور ایک اور بات تم آفاق سے شادی کر لینا گوری"۔ آخری لفظ گوری پر بجلی کی طرح گرے تھے۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں مہر، پہلے تو میں لاعلم تھی، اب سب کچھ جان کر تو میں کبھی نہیں کر سکتی، آپ ایسی باتیں نہ کریں"۔ وہ جھنجلا کر بولی تھی، مہر نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔

☆..........☆..........☆

"چوہدری صاحب بیٹی ہوئی ہے اس عورت کے گھر"۔ یہ اطلاع اسی کرخت لہجے والی عورت نے دی تھی۔

"اوہ"۔ رحیم چوہدری نے ہونٹ سکیڑے۔

"ٹھیک ہے، آج رات میں اگلا کام ہو جانا چاہئے"۔ چوہدری رحیم نے حکم دیا۔

"جی جیسا آپ نے کہا ہے ویسا ہی ہوگا"۔ وہ عورت بولی تھی لیکن دوسری طرف دروازے کے پیچھے چھپ کر کھڑی گوری کے پاؤں سے زمین سرک گئی تھی۔

''مجھے بھی مارنا چاہتے ہیں''۔ اس کی زبان لڑکھڑائی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی مہرو کے کمرے میں آئی تھی۔
''مہر! ہمیں یہاں سے جلدی نکلنا ہوگا، وہ ہم تینوں کو مار دیں گے''۔ اس نے مہر کو جھنجھوڑا تھا۔ لیکن مہر کے ساکت وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی تھی۔ اس نے دوبارہ ہاتھ چھوا، مہر کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا، مہر مر چکی تھی، جنون عشق کی اس کہانی کا ایک باب مکمل ہو چکا تھا۔
''مہر، اٹھیں مہر''۔ اس نے پوری طاقت سے مہر کو جھنجھوڑا تھا، پر مہر خاموش لب لئے پڑی تھی۔
''مہر... ''وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

☆..........☆..........☆

وہ ہوسٹل سے باہر آئی تو اس نے اماں کو فون ملایا تھا۔
''السلام علیکم اماں!''
''وعلیکم السلام! کیسی ہو رطابہ؟'' فون کی دوسری جانب اماں گوری تھی۔
''ٹھیک ہوں اماں! ابھی رحیم چوہدری کے گھر جا رہی ہوں، اس نے بلایا ہے''۔ اس نے بتایا۔
''اوہ اچھا دھیان سے جانا، وہ بڑا شاطر آدمی ہے''۔ گوری نے اسے آگاہ کیا تھا۔
''جی اماں! جانتی ہوں، بس ایک بات کھٹک رہی ہے، میٹنگ پرسوں ہے لیکن بلا آج رہا ہے، کچھ سمجھ نہیں آ رہی''۔
''چلو وہاں جا کر ہی معلوم ہوگا، بڈھا کیا گل کھلا رہا ہے''۔ گوری کا لہجہ تلخ تھا، وہ مسکرائی تھی۔
''بڈھا تو نہ کہیں، جوان لگتا ہے ابھی تک تو''۔ رطابہ ہنستے ہوئے بولی۔
''سیاہ کرتوتوں کے مالک خود کو جوان ہی سمجھتے ہیں''۔ گوری بھڑکی۔
''اچھا اماں! اب واپس آ کر آپ کو کال کروں گی''۔
''ٹھیک ہے ہر کام سوچ سمجھ کر دھیان سے کرنا''۔ اماں نے دوبارہ یاددہانی کروائی تھی۔
''جو حکم باس''۔ وہ بولی۔
''جیتی رہو''۔
''اماں ایک منٹ، آپ کو ایک اور اہم خبر بھی دینی ہے''۔
''وہ کیا''۔
''ابو زندہ ہیں اور دبئی میں مقیم ہیں''۔
''اوہ، یہ تو خوشی کی خبر ہے''۔ گوری خوشی سے بولی۔
''جی، اب آپ تیاری کیجئے''۔ اس کی شرارت کی رگ پھڑک اٹھی تھی۔
''کیا مطلب؟''
''ارے دلہن بننے کی''۔ اس نے ہنستے ہوئے شگوفہ چھوڑا۔
''ٹھہر بدتمیز لڑکی''۔ اماں نے ڈانٹ پلائی، اس نے فوراً فون کاٹ دیا۔

☆..........☆..........☆

''میرے اللہ میری مدد کر، کوئی راستہ بتا یہاں سے نکلنے کا، تو ہی میری مدد کر سکتا ہے''۔ گوری نے پریشانی سے دعا مانگی تھی۔ یہ ڈھلتی شام کا وقت تھا۔ اسے رات سے پہلے پہلے یہاں سے نکلنا تھا ورنہ وہ اور ننھی رطابہ

زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتیں۔ اس نے مہر سے وعدہ کیا تھا وہ رطابہ کو کچھ نہ ہونے دے گی اور اس نے یہ وعدہ پورا کرنا تھا۔ مہر کی موت کی خبر ابھی تک کسی کو نہ ہوئی تھی۔ اس نے بے بسی سے مہر کو دیکھا، آنسو چھم چھم اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ وہ اتنی بے بس و مجبور تھی۔ اس نے ننھی رطابہ کے منہ میں فیڈر دیا اور خود اس کمرے کے چاروں طرف نگاہیں گھمانے لگی، یہ کمرہ پوری طرح بند تھا، اچانک اس کی نظر چھت کے بالکل ساتھ لگے روشن دان پر پڑی تھی۔

☆............☆............☆

''ہیلو السلام علیکم سر!'' رخشی نے فون اٹھاتے ہی کہا تھا۔ یہ آفاق چوہدری کی نئی ملازمہ تھی جو کچھ دن پہلے ہی رکھی گئی تھی۔

''ذرا آفاق کے قریب فون لے جاؤ''۔ اس حکم پر وہ فون آفاق کے پاس لے گئی، آفاق حسب معمول چت لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

''سر! آپ کا فون ہے''۔ رخشی نے فون اس کے کان کے ساتھ لگایا۔

''ہیلو ڈیئر آفاق! کیسے ہو، تمہیں ایک خبر دینی تھی اور وہ خبر یہ ہے کہ تمہاری بیٹی زندہ ہے''۔ آفاق چوہدری یہ سن کر تڑپا تھا۔

''مہر ماہ''۔ وہ بڑبڑایا۔

''ہاہاہا، آگے تو سنو ڈیئر سن، تمہاری بیٹی کو میں مارنے والا ہوں، پر ایک احسان تم پر کر رہا ہوں، تم پہلی اور آخری دفعہ اپنی بیٹی سے مل سکتے ہو، کل تم پاکستان آؤ گے اور پرسوں اپنی بیٹی کی لاش کے پاس بیٹھ کر روؤ گے''۔ چوہدری رحیم زور زور سے قہقہے لگاتا ہنس رہا تھا اور یہ قہقہے آفاق چوہدری کی جان نکال رہے تھے۔

''نن نہیں نن''۔ آنسو بے اختیار چھلکتے جا رہے تھے اور ان آنسوؤں کا سدباب کوئی نہ تھا۔

☆............☆............☆

وہ ہوسٹل کے گیٹ سے باہر نکل آئی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر ایک الوداعی نظر اس ہاسٹل کے در و دیوار پر ڈالی، آنسو کا ایک ننھا سا قطرہ اس کی آنکھ سے ٹپکا تھا۔ جس جگہ ہم رہتے ہوں وہاں کی بے جان چیزیں بھی ہم سے مانوس ہو جاتی ہیں۔ جو جگہ چھوڑتے وقت ہمیں بڑی شدت سے یاد آتی ہیں۔ اس نے آنسو کا ننھا قطرہ اپنی پور سے صاف کیا اور ہوسٹل کی دائیں جانب چلنے لگی۔ پتہ نہیں آج اس کا دل کیوں خالی خالی لگنے لگا تھا۔ جیسے اس میں کوئی امنگ ہی نہ رہی ہو، بچپن سے لے کر جوانی تک کا وقت اس نے یہ خواب سوچتے ہوئے گزارا تھا اور آج جب وہ خواب پورا ہونے کا وقت آیا تو اسے اپنا آپ خالی لگنے لگا۔

''کیا میں نے ایک نارمل زندگی گزاری ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پر جواب کی سنوائی نہ ہو سکی تھی۔ کبھی کبھی کچھ سوال اتنے مشکل ہو جاتے ہیں کہ ان کے جواب ہمیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتے یا ہم ڈھونڈنا ہی نہیں چاہتے۔ یا اگر ڈھونڈنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو اس ڈر سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ شاید یہ جواب ہمیں دکھ کے علاوہ اور کچھ نہ دیں۔

زندگی بے مقصد نہیں گزاری جا سکتی، گزارنے کے لئے کسی مقصد کی ضرورت ہوتی ہے اور رطابہ نے جو مقصد چنا تھا اب اس میں اسے کامیابی ہونے والی تھی یا ناکامی یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی اور کچھ باتوں کا نہ جاننا ہی اچھا ہوتا ہے۔ وہ دل میں اپنی زندگی کے تانے بانے بنتی ہوئی چلتی جا رہی تھی اور اس کا یہ چلنا چوہدری رحیم کی

بھیجی پراڈو کی بدولت اچانک رکا تھا۔اس نے سنبھل کر ایک نظر ڈرائیور پر ڈالی اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

☆............☆............☆

یہ اس کمرے کا واحد روشن دان تھا جو بغیر آہنی سلاخوں اور جالی کے تھا۔ گوری کے اندر یکدم پھرتی ابھری تھی۔ اسے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ روشن دان کافی اونچا تھا۔ وہ بغیر کسی سہارے کے اوپر نہیں چڑھ سکتی تھی۔ اس نے کمرے کے چاروں طرف نگاہیں گھمائیں، وہ کسی ایسی چیز کی تلاش میں تھی جس کی مدد سے وہ روشن دان تک پہنچ سکے اور آخر کار اسے وہ گوہر مقصود مل ہی گیا، کمرے کے ایک کونے میں اسے لکڑی کی ٹوٹی پھوٹی سیڑھی دکھائی دی تھی۔ وہ تیزی سے سیڑھی کی جانب لپکی اور اسے وہاں سے اٹھا کر روشن دان کے بالکل نیچے والی جگہ پر رکھا۔ اس پوری سیڑھی میں صرف چھ سٹیپ تھے جس کی مدد سے وہ اوپر چڑھ سکتی تھی۔

اب اگلا مرحلہ رطابہ کو اٹھانے کا تھا۔ اس نے رطابہ کو اپنے سینے سے لگایا اور ایک بڑے دوپٹے کی مدد سے اسے اپنے ساتھ باندھ لیا۔ وہ پوری طرح تیار تھی۔ اس نے اک الوداعی نظر نم آنکھوں سے مہر پر ڈالی اور سیڑھی کی جانب بڑھ گئی۔ اس نے پہلے اسٹیپ پر قدم رکھا ہی تھا کہ سیڑھی پوری طرح لڑکھڑائی، وہ خوف سے نیچے اتر آئی۔

''کیا کروں، میں یہاں رہی تب بھی موت اور اس سیڑھی سے گری تب بھی موت، کیوں نہ اس سیڑھی کو ہی آزمایا جائے''۔ یہ سوچ کر اس نے ہمت سے دوبارہ قدم بڑھایا اور دھڑکتے دل کے ساتھ وہ چوتھے اسٹیپ پر پہنچی ہی تھی۔ اس چوتھے اسٹیپ اور پانچویں اسٹیپ کے درمیان کافی بڑا خلا تھا۔ رطابہ کو اس نے مضبوطی سے پکڑا جو اس سارے کھیل کو اپنی بڑی بڑی نگاہوں سے خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ اللہ کا نام لے کر وہ پانچویں اسٹیپ پر پہنچ ہی گئی۔ اس کی رکی سانس بحال ہوئی تھی پر دروازے کے پیچھے ہونے والے شور نے اس کا دل مٹھی میں دبوچ لیا تھا۔ اسے یوں لگا وہ کھڑے قدموں کے ساتھ پوری کی پوری نیچے گرنے والی ہے۔

☆............☆............☆

دبئی انٹرنیشنل ایئرپورٹ کی گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ لوگ اپنی اپنی فلائٹس کے انتظار میں انتظار گاہوں میں بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ایسے میں رخشی آفاق چوہدری کی ویل چیئر گھسیٹتی ایئرپورٹ کے داخلی دروازے سے داخل ہوئی۔ آفاق چوہدری سر جھکائے اس کے ساتھ گھسٹتا جا رہا تھا۔ سر جھکائے پتہ نہیں وہ کس سوچ میں گم تھا۔ آنسو تو بہہ کر پتہ نہیں کب کے سوکھ چکے تھے۔ اب رونا چاہتا بھی تو رو نہیں سکتا تھا جیسے سب اختیاروں کی طرح یہ اختیار بھی اس سے چھن گیا تھا۔ وہ بے بسی کی آخری انتہا پر کھڑا تھا۔

☆............☆............☆

چوہدری رحیم کے کارندے زور زور سے دروازہ پیٹ رہے تھے اور وہ آخری سیڑھی پر کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں۔ اس کی ہمت ٹوٹتی جا رہی تھی، پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔

''دروازہ کھولو ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے''۔ کرخت خوفناک آوازیں اس کے کانوں کے پردے چیر رہی تھیں۔

''مم، مم مجھے ہمت کرنی ہوگی''۔ وہ بڑبڑائی تھی اور کوشش کرتی روشن دان کے منہ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ دروازہ ابھی تک بے دردی سے پیٹا جا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے رطابہ کو اپنے سینے سے الگ کیا اور روشن دان کے باہر بنی سلیب پر لٹا دیا، وہ خود بھی دھان پان سی تھی۔ اس لیے اسے باہر نکلنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی تھی۔ ابھی

اس کا دایاں پیر کمرے کے اندر ہی تھا کہ دروازہ چنگھاڑتی آواز کے ساتھ لاک میں بولٹ ہوا تھا۔

''پکڑو جلدی وہ بھاگ رہی ہے''۔ اس نے جلدی سے پاؤں باہر نکالا اور رطابہ کو لیتی نیچے کود گئی۔ وہ انجانے راستوں پر بھاگتی جا رہی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ چوہدری رحیم کے بندے اس کا اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے نہیں۔ بھاگتی بھاگتی نجانے وہ کہاں نکل آئی تھی۔ رات کے اس پہر اسے جنگلی جانوروں کی آوازیں اور بہتے تیز پانی کے شور کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یعنی وہ کسی ایسی جگہ تھی جہاں آبادی کے آثار تھے۔ اس نے اردگرد نظریں گھمائیں، دور سے اسے ننھی سی روشنی کی رمق دکھائی دی۔ وہ تیزی سے اس جانب چلنا شروع ہو گئی۔ اسے جلد از جلد یہاں سے نکلنا تھا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گئی ہوگی کہ آگے سے آتے وہی کارندے اسے دکھائی دیئے۔ خوف سے اسے اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور الٹے قدموں بھاگنا شروع کر دیا۔ پیچھے وہی کارندے اس کے تعاقب میں تیز تیز بھاگتے آ رہے تھے۔ وہ بھاگتی ہوئی نہر کی طرف نکل آئی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور آنکھیں بند کرتے ہی گہری نہر میں کود گئی۔

☆..........☆..........☆

''ویلکم مائی ڈیئر سن! آج تم کتنے سالوں بعد اس گھر میں آئے ہو، تمہارا تو شاندار استقبال ہونا چاہیے''۔ رحیم چوہدری اس کے سامنے بیٹھا چہک رہا تھا۔ آفاق نے نفرت بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

''غصہ نہیں مائی ڈیئر! ابھی تو تمہیں میں بڑی خوشخبری سے ہمکنار کرنے والا ہوں، تمہاری بیٹی بس آتی ہی ہو گی''۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے تڑپا رہا تھا۔

''سر! میڈم رطابہ آ چکی ہیں''۔ اس خبر پر آفاق نے سر اٹھا کر چوہدری رحیم کو دیکھا۔

''فوراً اندر بلاؤ، کہیں دیر نہ ہو جائے''۔ وہ مکروہ ہنسی ہنسا تھا۔ گارڈ واپس مڑ گیا تھا۔

''تم سوچ رہے ہو گے میں تمہاری وجہ سے اسے معاف کر دوں گا، تو یہ تمہاری بھول ہے''۔ رحیم چوہدری پھنکارتے ہوئے گرجا تھا۔

''صحیح کہا تم نے''۔ رطابہ ہنستی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''سیاہ کرتوت اتنی جلدی نہیں مٹتے''۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی، ابھی وہ باپ کو دیکھ کر کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے اک نگاہ غلط بھی آفاق کی طرف نہ ڈالی تھی۔

''اوہ تو رطابہ آفاق آ چکی ہیں''۔ چوہدری قہقہہ لگا کر بولا تھا۔

''رطابہ آفاق تو کب کی تمہیں برباد کرنے آ چکی تھی، تم ہی نادان نکلے''۔ وہ طنزیہ پھنکاری تھی۔

''اوہ گڈ، پر آج یہی رطابہ یہاں سے لاش کی صورت جائے گی''۔ یہ کہتے ہی چوہدری رحیم نے جیب سے گن نکالی اور اس پر تانتے ہوئے بولا۔

''مجھے موت سے مت ڈراؤ چوہدری رحیم، موت دینے والے تم نہیں ہو''۔ اس کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔

''مرنے سے پہلے اپنے اس ناکارہ باپ سے مل لو، برسوں کی محبت کا ملن کرا رہا ہوں باپ بیٹی کا''۔ چوہدری رحیم کا لہجہ ہتک آمیز تھا۔ رطابہ بڑی بے بسی سے باپ کی جانب پلٹی تھی۔ برسوں سے ملنے کا خواب پورا بھی ہوا تھا تو کس نہج پر۔

''ابو میرے ابو، آپ کہاں تھے''۔ وہ بلبلاتی آفاق کے کشادہ سینے سے ٹکرا گئی تھی۔ آفاق نے لرزتا ہاتھ اس

کے سر پر رکھا تھا۔
''تم، مجھے، معاف، کر، کر دینا رطابہ بیٹی''۔ انتہائی دقت سے جملہ بولا تھا۔
''مجھے کوئی گلہ نہیں ابو! بس ایک خواہش ہے، اگر آپ مانیں تو آپ میری گوری ماں سے شادی کر لیجیے گا، وہ بہت اکیلی ہیں آپ کے بغیر، وہ آج بھی آپ کے انتظار کا دیپ جلائے بیٹھی ہیں، ان کا دیپ روشن کر دیجیے گا اور اپنی اس بدنصیب بیٹی کو معاف کر دیجیے گا جو آپ کے کسی کام نہ آسکی''۔ وہ کھسکتی ہوئی پیچھے ہٹی اور چوہدری رحیم کو گھورنے لگی۔
''تمہیں آج حساب دینا پڑے گا رحیم چوہدری، میرا، میری ماں کا، میرے باپ کا اور گوری کا تمہیں حساب دینا ہوگا''۔ یہ کہہ کر اس نے وہ پیپرز نکالے اور ایک ایک کر کے اس کی جانب اچھال دیے۔ چوہدری رحیم اب بے یقینی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔
''تم ایک بات بھول گئے چوہدری رحیم، میں بھی تمہاری پوتی تھی، بھلا کیسے تمہیں نہ ہراتی''۔ وہ ہنسی تھی، وہی زہریلی مسکراہٹ...
''دیکھو، ان پیپرز کو تم اپنی ساری پراپرٹی، بزنس سب کچھ یتیم خانے کے نام کر چکے ہو''۔ رحیم چوہدری بری طرح لڑکھڑایا تھا۔
''تت، تم''۔ وہ پاگل سا اس کی جانب لپکا۔
''ابھی ٹھہرو، تم اپنا دہی والا بزنس دیوالیہ کر چکے ہو''۔ ایک اور دھچکا لگا تھا، وہ پورے قد سے زمین پر گرا تھا۔
''میں تمہیں ایسا ہی دیکھنا چاہتی تھی، جھکا ہوا، بے بس، کمزور''۔ اس نے نفرت سے اس پر تھوکا اور وہیل چیئر کی جانب بڑھی، وہ یہاں سے جا رہی تھی اپنے باپ کے ساتھ جہاں ان تینوں نے مل کر رہنا تھا۔
''ٹھاہ''۔ اچانک فائر کی آواز آئی، آفاق نے رطابہ کی طرف دیکھا اور ساکت رہ گیا، رطابہ خون میں لت پت پڑی کراہ رہی تھی۔
''بیٹی''۔ آفاق اس کے قریب گر گیا تھا۔
''یہی لفظ سننا چاہتی تھی ابو، اب میں پرسکون ہوگئی ہوں''۔ رطابہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند چکی تھی۔
جنون عشق کا دوسرا اور آخری باب بھی پھٹ چکا تھا۔

☆..........☆..........☆

عورت آج بھی مقام کی تلاش میں ہے، انصاف کی تلاش میں ہے، پر نہ تو مقام مل سکا اور نہ رطابہ کو انصاف، زبردستی مقام حاصل کرنے کی جدوجہد میں رطابہ خود بکھر گئی۔ یہ کہانی رطابہ کی نہیں، نہ مہر کی، یہ کہانی عورت کی تھی۔ اس کے جنون کی تھی اور اس جنون نے اس عورت کی جان لے لی تھی۔ عورت آج بھی انصاف کا، مقام کا کشکول اٹھائے کھڑی ہے کہ شاید یہ کشکول بھر جائے، اس مرد کے معاشرے میں عورت کا مقام بلند ہو جائے۔

☆..........☆..........☆

چوہدری رحیم کو عدالت نے پھانسی کا حکم سنا دیا تھا۔ آفاق گوری کے پاس لوٹ گیا تھا۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا پر پھر بھی اک کمی، اک کسک باقی رہ گئی تھی۔ رطابہ جیسی آج بھی کتنی لڑکیاں اس معاشرے میں موجود ہیں، جو اپنے جائز حق، مقام کی تلاش میں ہیں۔ شاید ان کو رطابہ نہ بننا پڑے۔ ان کو اپنا مقام مل جائے۔

☆..........☆..........☆

عائشہ مرزی

ناولٹ

سب مایہ ہے

کل ہلکی ہلکی بارش تھی
کل سرد ہوا کا رقص بھی تھا......

کل پھول بھی نکھرے نکھرے تھے
کل ان میں آپ کا عکس بھی تھا



کل بادل گھرے کالے تھے
کل چاند پہ لاکھوں پہرے تھے
کچھ ٹکڑے آپ کی یادوں کے بڑی دیر سے دل
میں ٹھہرے تھے
کل یادیں الجھی الجھی تھیں
اور کل تک یہ نہ سلجھی تھیں
کل تم بہت یاد آئے تھے
کل یاد بہت تم آئے تھے......

ڈائری کے اوراق بدلتے نظم کی چند سطروں پر اس کی نگاہیں ٹھہری سی گئیں۔ مایا کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھی یہ نظم۔ اس کی آنکھوں کے پردے پر اس کا عکس جھلملانے لگا۔ اسے سوچنا آج بھی اس کے لیے کتنا تکلیف دہ تھا، ہر بار کی طرح اس بار بھی اسے یاد کرنا اسے نئے سرے سے مضطرب کر گیا۔ کمرے میں اسے گھٹن سی ہونے لگی۔ ڈائری ٹیبل پر الٹ کر وہ اوپن ٹیرس پر نکل آیا۔ اس گھٹن سے بچنے کا فی الوقت یہ ہی طریقہ اسے مناسب لگا لیکن باہر آ کر بھی اس کا اضطراب کم نہ ہوا۔ اس کے اندر جیسے ویرانیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا کوئی ہلچل اسے اب بھلی نہ لگتی کوئی خوش کن بات اب اس کے لبوں پر



مسکراہٹ نہ بکھیرلی۔ ہر وقت جیسے اس پر پژمردگی کی کیفیت طاری رہتی۔ یہ سب اس کا اپنا تو کیا دھرا تھا۔ تو اب پشیمانی کیسی؟ کیسا دکھ؟ اسے خود سے اب قطعی ہمدردی نہ تھی۔ زندگی جیسے اس سے روٹھ چکی تھی۔ فقط سانس کی ڈور بندھی تھی۔ بے بسی ایسی ہی ہوتی ہے شاید۔ وہ خود کو چاہ کر بھی اس کیفیت سے نکال نہ پار ہا تھا۔ وہ ابھی پلٹنے ہی لگا تھا کہ ممی دروازہ ناک کرکے اندر چلی آئیں۔

''ہاشم! جاگ رہے ہو؟ آفس جانا ہے تمہیں کیوں اپنی نیند کے دشمن بنے پھر رہے ہو۔'' اس کی سوجی آنکھیں دیکھ کر فکرمندی سے بولیں۔

''کہاں مام! اب تو نیند بھی ہم سے روٹھ چکی ہے۔'' وہ یاسیت سے کہنے لگا۔

''چلو اپنی دوا لے کر تم آرام کرو۔ کام کا پریشر زیادہ ہو تو پرسکون نیند بھلا کہاں آتی ہے۔'' وہ کہہ کر پلٹنے لگیں کہ کچھ یاد آنے پر رک کر کہنے لگیں۔

''اور ہاں کل مایا کی پہلی برسی ہے اچھا ہوتا اگر تم بھی چلتے آپا کو ڈھارس ملتی۔'' مما کی بات پر جیسے اسے سانس رک رک کر آنے لگی، ہر پل اس کے ذکر پر اس کی کیفیت کم و بیش ایسی ہو جاتی۔ احساس جرم تھا یا وہ بھولی بسری محبت جو اس کے دل کے نہاں خانوں میں اب بھی آباد تھی۔ چند پل لگے اسے خود کو نارمل کرنے میں۔

''نہیں مام! میرا وہاں کیا کام۔ جو لوگ بچھڑ جاتے ہیں ان کے لیے آنسو نہیں بہاتے صرف دعائیں کی جاتی ہیں۔ میں اس کے لیے ضرور دعا کروں گا اور ویسے بھی کل میری ایک کلائنٹ سے ضروری میٹنگ ہے۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی وہ صفائی دینے لگا۔

''اوکے فائن، اب تم آرام کرو۔'' بدقت مسکرا کر کہتے وہ باہر نکل گئیں۔ جب کہ وہ بے جان ہوتے قدموں کے ساتھ بیڈ پر آکر بیٹھ گیا۔ دل اب بھی بے چین اور ذہن منتشر تھا۔ بیڈ پر بے سدھ ہوتے اس کے لبوں پر فقط ایک ہی نام تھا، ''مایا''۔

☆......☆

مایا ملک سے دس سال بعد اس کی ملاقات بس ایک اتفاق تھا۔ جس نے اس کی لائف کے معنی ہی بدل دیئے۔ اب تک وہ جس حال میں جی رہا تھا سراسر خود کو بیوقوف بنانے کے مترادف تھا۔ دراصل جینا اور خوش رہنا تو اس نے اب جانا تھا یا پھر وہ تھی ہی ایسی شخصیت کی مالک۔ اسے اپنا ماضی صرف ایک برا خواب لگنے لگا۔ مایا کے سنگ وہ مسکرانے لگا تھا۔ بدلنے لگا تھا مگر یہ وقت اتنا مختصر ہوگا اس بات کا قطعی اندازہ نہ تھا۔ جلا کر راکھ کر دینے والا۔ بھلا ان کا ملاپ کیوں کر ممکن تھا۔ اس جلتے شعلے نے اس پروانے کو جلا کر راکھ کر دیا بھسم کر دیا اس کے خواب چھین لیے اور وہ اڑنے کی چاہ لیے تڑپ تڑپ کر مر گئی تھی مایا اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔

☆......☆

پچھلے کچھ دنوں سے وہ ایک کیس کے سلسلے میں کافی بزی تھا۔ آج چونکہ کیس کی سماعت تھی وہ کورٹ سے واپسی پر سیدھا گھر لوٹا تھا۔ تھکا دینے والے شیڈول اس کے اعصاب پر بھی اثر کرنے لگے۔ صغریٰ سے کافی کا کہہ کر وہ روم کی جانب بڑھنے لگا مگر راستے میں اس کے قدم تھم گئے اسٹڈی کے ان لاک ڈور سے اندر کا منظر واضح تھا۔ سات سالہ بچی بک شیلف کے پاس اسٹول رکھ کر اس پر چڑھے شیلف میں نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ ارد گرد سے بے نیاز، معصومیت بھرا انداز اسے رکنے پر مجبور کر گیا۔ ننھے ہاتھوں سے بھاری کتابوں کو باری باری کھولتے نہ جانے اسے کس چیز کی تلاش تھی۔ چند پل رک کر اسے دیکھتے ناچار اسے گلا کھنکار کر اسے متوجہ کرنا پڑا مگر اسے اندازہ نہ تھا مخاطب اس افتاد کے لیے تیار نہ تھا جبھی اس کی آواز پر وہ توازن برقرار

نہ رکھ پائی اور دھڑام سے اسٹول سے نیچے گرگئی۔ بھاری کتابیں ہاتھ لگنے سے اس پر باری باری آگریں۔

"اوہ گاڈ!" سامنے کا منظر اس کی توقع کے برعکس تھا۔ وہ اپنی مسکراہٹ چھپائے اس کی سمت بڑھا۔

"لگی تو نہیں۔" اسے بازو کے سہارے اٹھاتے وہ پوچھنے لگا۔ جب کہ اس کی بات پر اس کے آنسو گال پر لڑھک گئے۔

"افوہ اب رونا نہیں۔" کہنے کے ساتھ اس کی نظریں اس کی چھلی کہنی پر جا پڑیں جس پر کھرچ اور خون کے نشان واضح تھے۔ غصے کی جگہ ایک دم شرمندگی نے لے لی۔

"دیکھو مایا! اب رونا نہیں میں بینڈج کردوں گا پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔" وہ اسے اٹھا کر باہر صوفے پر لے آیا۔

"صغریٰ بوا جلدی سے فرسٹ ایڈ باکس لے آئیں۔" بوا سے کہہ کر وہ چوٹ کا معائنہ کرنے لگا۔ اتنے میں بوا باکس لے آئیں۔ پٹی کر کے وہ اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گیا۔

"امی کہتی ہیں کہ جب کوئی تکلیف میں ہو تو اس کے لیے دعائیں مانگنی چاہیے میں دعا والی کوئی کتاب ڈھونڈ رہی تھی۔" پہلے کی نسبت اب وہ کافی بااعتماد اور نڈر لگ رہی تھی۔

"سیریسلی......! ویسے تمہاری امی کہاں ہیں اور آپی۔" اچانک کچھ کمی محسوس ہونے پر وہ بولا۔

"ہاسپٹل......!" اس کی بات پر وہ ٹھٹک گیا اس وقت مایا سے کچھ پوچھنا اس نے مناسب نہ سمجھا۔ تبھی شام کو مام کے لوٹتے وہ ان کے سر ہوگیا۔

"پھپھو گاؤں سے یہاں آئی ہوئی ہیں اور ہاسپٹل میں ہیں اور آپ نے مجھے بتانا تک ضروری نہ سمجھا۔ ویسے ایڈمٹ کون ہے سب ٹھیک تو ہے مام۔ کچھ تو ہے جو آپ مجھ سے چھپا رہی ہیں۔" ان کے چہرے کے تاثرات بھانپ کر وہ قیاس کرنے لگا۔

"نتھنگ مائی سن! بس تم بزی تھے اس لیے میں نے ڈسٹرب کرنا ضروری نہ سمجھا۔"

"نو مام! آپ شاید یہ بات نہیں جانتیں بٹ میں آپ کو بچپن سے جانتا ہوں آپ کو جھوٹ بولنا تو بالکل نہیں آتا۔" وہ انہیں شانوں سے تھامے کہنے لگا۔

"زویا کے دل میں سوراخ ہے شریانوں کے تنگ ہونے کے سبب خون جمنے لگا ہے۔ ہارٹ بلڈ سرکولیٹ نہیں کر پا رہا۔ ڈاکٹر نے فوراً سرجری کرنے کو کہا ہے۔ فردوس آپا بھی کافی ڈسٹرب ہیں سمجھ نہیں آرہا کہ کریں تو کیا۔" بیڈ پر بیٹھ کر آہستگی سے وہ کہنے لگیں۔ ان کے الفاظ اس پر ہتھوڑا بن کر برسنے لگے ایک پل کو تو وہ کچھ بول ہی نہ پایا مگر جب بولا تو الفاظ بکھر کر ادا ہونے لگے۔

"کب ہے......سرجری۔"

"ڈاکٹر نے اگلے ماہ تک کی مہلت دی ہے پیسوں کا انتظام ہونے پر فوراً آپریشن کرنا پڑے گا۔" وہ بھیگے لہجے میں بتانے لگیں۔

مام کافی disapointed لگ رہی تھیں۔

"اٹس او کے مام! سب ٹھیک ہوجائے گا۔ زویا کو کچھ نہیں ہوگا۔ ٹرسٹ می۔" وہ ان کے قدموں کے پاس بیٹھا ان کا ہاتھ تھامے تسلی دینے لگا۔ جس پر فقط وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گئیں۔ آپریشن کے لیے ایک خطیر رقم درکار تھی۔ اگلے روز اس نے ہاسپٹل جا کر ساری انفارمیشن لی۔ رقم کے متعلق فردوس بیگم کو دلاسہ دلا کر اس نے بینک میں لون کے لیے اپلائی کیا۔ کمپنی کے آج کل خسارے کے دن تھے۔ وہاں سے کچھ ملنا مشکل تھا۔ اس نے شہر سے باہر بنا اپنا پلاٹ تک بیچ دیا۔ وہ باقاعدگی سے

ہاسپٹل جانے لگا تھا۔ زویا کی حالت دن بدن بگڑنے لگی اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔ زویا کی تکلیف اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ پھپھو اس کی بے حد مشکور تھیں لیکن اس کے اندر جیسے ویرانیاں اترنے لگیں۔ زویا کو کھونے کا احساس بے حد تکلیف دہ تھا۔

☆......☆

''آپی کب واپس آئیں گی ہاشم بھائی؟'' مایا اس کا کندھا جھنجوڑنے لگی۔ تو جیسے وہ ہوش کی دنیا میں واپس لوٹ آیا۔

''جلد، بہت جلد۔'' بھیگے لہجے میں وہ کہنے لگا۔

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میں نے ماموں اور ڈاکٹر کی باتیں سن لیں ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ اب آپی کبھی ٹھیک نہیں ہوں گی آپ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ بہت برے ہیں۔'' سات سالہ مایا اب باقاعدہ رونے لگی تھی۔

''پاگل ایسا نہیں ہوگا۔ تمہاری آپی ضرور آئیں گی آئی پرامس۔'' اس کے ننھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے وہ اس سے زیادہ خود کو تسلی دینے لگا۔

''اچھا چلو میں نے تمہارے لیے کچھ اسٹوری بکس لی ہیں۔ یہ دیکھو۔'' وہ فوراً رونا بھول کر کتابوں میں مگن ہوگئی۔

ہاشم اب اس کا پہلے سے بھی زیادہ دھیان رکھنے لگا تھا۔ وہ اپنی آپی سے بہت مانوس تھی شاید اس لیے زویا کی حالت اس کے لیے بہت تکلیف کا باعث تھی۔ وہ جتنا ہوتا اس کی ضرورتوں کا پورا خیال رکھتا مایا بھی اب اس سے کافی اٹیچ ہوگئی تھی۔ دن تیزی سے گزرنے لگے۔ گزرتے دنوں آپریشن کا دن بھی آگیا۔ سب کی بے شمار دعاؤں اور آنسوؤں کے باوجود سرجری کے دوران زویا زندگی کی بازی ہار گئی۔ زندہ رہنے کی امید جیسے دم توڑ گئی۔ پھپھو نے رو رو کر برا حال کرلیا۔ کچھ کم خراب حالت اس کی بھی نہ تھی۔

وہ مایا سے نظریں بچاتا رہا اس کے معصوم سوالوں کے جواب دینے سے قاصر تھا۔ سب کی تشفی اور حوصلہ آمیز جملے بھی اس کا غم کم نہ کر سکے۔ دو دن سے اس نے ایک نوالہ تک نہیں کھایا تھا۔ وہ خود کو جیسے فراموش کر بیٹھا ہو۔ خود کو بھلا کر جینا اس نے سیکھ لیا تھا مگر کب تک......؟

ناشتے کی ٹرے جوں کی توں رکھی تھی۔ تبھی مایا دروازہ کھول کر اندر چلی آئی صوفے پر وہ آکر بیٹھ گئی۔

''آپی تو چلی گئی ہاشم بھائی پر اگر آپ نے بھی کچھ نہ کھایا تو پھر کہیں آپ بھی ہمیں چھوڑ کر چلے نہ جائیں۔ پلیز کچھ کھالیں ہاشم بھائی۔'' معصومیت سے کہے الفاظ پر وہ بے یقینی سے اس صابر بچی کو دیکھنے لگا۔

''ہوں!'' محض اتنا کہہ کر اس نے مایا کے ماتھے پر لب رکھ دیے۔

''آپ کے ہاشم بھائی آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گے پرامس۔'' اس کے فقط اتنا کہنے پر ہی وہ خوش ہوگئی۔

☆......☆

وہ اب خود کو بدلنے لگا تھا۔ وہ اسے خوش رہ کر دکھانا چاہتا تھا۔ اس کی معصوم مسکراہٹ اس کے لیے بیش قیمت تھی۔ جس سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس نے دوبارہ آفس جوائن کرلیا تھا۔ شام کو اکثر وہ اسے پارک گھمانے اور آئسکریم کھلانے لے جاتا، شام کو گھر واپس لوٹتے اس نے پھپھو کو مایا سے کہتے سنا۔

''اب ہمیں چلنا ہوگا عظمت بھائی، آپ نے ہمارے لیے جو کچھ کیا۔ میں شاید ہی تمام عمر یہ قرض نہ چکا پاؤں گی۔'' پھر اگلے روز پھپھو مایا کو لے کر چلی گئیں۔

☆......☆

عدالت کے اہم کام کے سلسلے میں پچھلے چار دن سے وہ اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ آج اس کی واپسی تھی۔ واپسی پر گھر لوٹنے کے بجائے وہ آفس چلا گیا۔ رات کو تقریباً گیارہ بجے اس کی واپسی ہوئی۔ گھر پر اندھیرے کا راج تھا۔ کوٹ اور بیگ ٹرنو کو پکڑا کر وہ اسٹڈی کی سمت چلا آیا۔ خلاف توقع اسٹڈی کی لائٹ آن تھی۔ اس وقت یہاں کسی کے آنے کا امکان تو نہ تھا۔ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے سب سے پہلے اس کے دماغ میں یہی خیال آیا۔ اندر داخل ہو کر سامنے اسٹول کے پاس کھڑی سی گرین سوٹ میں ملبوس وہ ریک پر نہ جانے کیا رکھ رہی تھی کہ دروازہ کھلنے کی آواز پر بے ساختہ پلٹی۔

"پچھلی بار آپ کی شرارت پر میں گر گئی تھی۔ پر اب یہ پاسیبل نہیں ہاشم بھائی۔" مسکرا کر کہتے وہ اسٹول سے اتر گئی۔ چہرے پر ننھے چمکتے پسینے کے قطرے بالوں کی ڈھیلی چٹیا گالوں پر پڑنے والا ڈمپل، وہی جھیل جیسی کالی گہری آنکھیں اسے دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ زبان نے بمشکل حرکت کی۔

"زویا......!"

"افوہ آپ شاید میرا نام تک بھول گئے۔" اب کی بار اس کے انداز میں خفگی نمایاں تھی تبھی دروازہ کھول کر مما چلیں آئیں۔

"اچھا ہوا ہاشم تم آ گئے۔ مایا سے تم مل چکے ویسے تمہاری پھپھو تمہاری منتظر ہیں۔"

"کب آئیں پھپھو؟" ان کے سوال پر اس نے کہا۔

"کل شام کو ہی سرفراز لینے گیا تھا۔ میں نے تمہیں ٹیکسٹ تو کر دیا تھا۔ فون تو تم اٹینڈ کرتے نہیں۔ اینی وے ڈنر تو کر لیا نا تم نے؟"

"جی۔" جواب میں اس نے فقط اتنا ہی کہا۔

"او کے تم فریش ہو کر آ جاؤ۔ فردوس آپا کتنی بار تمہارا پوچھ چکی ہیں، آ کر ان سے بھی مل لینا۔" ممی کہہ کر جا چکی تھیں۔ جبھی وہ پلٹا مایا اسی کی منتظر تھی۔

"آپ اتنے ان رسپانسبل تو نہ تھے ہاشم بھائی! پتا ہے پاپا آپ کی وجہ سے کتنی اپ سیٹ رہتی ہیں۔" وہ تھکن کا بہانہ کر کے فوراً وہاں سے چلا آیا۔

ساری رات سبز کپڑوں میں ملبوس سراپا اس کے حواس پر چھایا رہا۔ سلیپنگ پلز لے کر وہ آنکھیں موندھے لیٹ گیا۔ صبح ناشتے پر خاصی گہما گہمی تھی مما پاپا کے علاوہ پھپھو اور مایا کی موجودگی اتنے عرصے بعد خاصی رونق لگی تھی۔

"ماشاء اللہ میری مایا بیٹی تو خیر سے کافی بڑی اور سمجھدار ہو گئی ہے ابھی کچھ سال پہلے تو دو چوٹیاں تک نہیں بنتی تھیں تمہاری۔" عظمت صاحب اس کے سر ہاتھ پھیرتے محبت سے کہنے لگے اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ مسکرا رہی تھی آج چونکہ سنڈے تھا ناشتے کے بعد وہ لان میں ٹہلنے آ گیا۔ آج اس کا بھی آف تھا۔ سنڈے کو زیادہ تر اس کی کوشش ہوتی کہ فیملی کو ٹائم دے۔ لان میں وہ یوں ہی ٹہلنے لگا۔ تبھی مایا اس کے پیچھے چلی آئی۔

"افوہ حد ہے ہاشم بھائی! مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ مجھ سے کترا رہے ہیں۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں...... نہیں تو۔" وہ جیسے سٹپٹا گیا۔

"ایکچوئلی اتنے عرصے بعد تمہیں دیکھ کر کافی سرپرائز ہوں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ صفائی دینے لگے۔

"ہاں آپ تو زویا آپی کے بعد جیسے ہمیں بھول ہی گئے۔ کیا آپی کے بعد سارے تعلق ختم ہو گئے ہم سے آپ کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ آپ نے ایک بار بھی ان دس سالوں میں چکر نہ لگایا بس ماموں اور مامی بھی کبھار فارمیلٹی کے لیے آ جاتے ہیں۔" وہ افسردگی سے کہنے لگی۔

"تم بھی تو مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گلہ کر بیٹھے۔ وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

ہاشم بھائی! واقعی کتنا بدل گئے تھے۔ اپنے عمر سے خاصے بڑے دکھائی دینے لگے۔ بالوں میں چمکتی سفیدی، فریم لیس گلاسز اور چہرے پر حزن رقم تھا۔ مایا کو دیکھ کر افسوس ہونے لگا۔ زویا کے بغیر زندگی کتنی منتشر تھی۔ وہ دکھ سے سوچنے لگی۔

"اب میں آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں جاؤں گی آئی پرامس۔" اس کی بات پر کتنی دیر وہ کچھ بول ہی نہ سکے۔



اسفند یار پھوپھا نے اسلم نامی شخص کے ساتھ مل کر کاروبار شروع کیا۔ وہ شخص فراڈ نکلا اور ایک روز ان کی تمام جمع شدہ رقم اور بینک سے ایک خطیر رقم لون لے کر فرار ہوگیا۔ بینک کے کاغذات پر چونکہ اسفند یار کے سائن تھے۔ لون ان کے نام سے لیا گیا تھا تو پولیس نے انہیں حراست میں لے لیا۔ ان کا گھر بینک کے قبضے میں چلا گیا۔ رقم انہوں نے چونکہ گاؤں کے چوہدری ملک وجاہت سے ادھار لے رکھی تھی یہ کیس انہوں نے ہی اس کے خلاف درج کروایا تھا۔ اسلم جیسے مشکوک شخص کے ساتھ کام کر کے ان کی نیک نامی پہلے ہی مشکوک ہو چکی تھی۔ جب سب نے مدد کرنے سے انکار کر دیا پولیس انہیں لے جا چکی تبھی پھپھو نے روتے ہوئے عظمت صاحب کو کال کر لی۔ عظمت صاحب عارضہ دل کے مریض تھے ڈاکٹر نے انہیں لمبا سفر کرنے سے منع کیا تھا۔ سو انہوں نے اپنے ڈرائیور کو انہیں لینے بھیج دیا۔ بہن کے حالات ان کے لیے بہت تکلیف کا باعث تھے ہاشم کو بھی یہ سب جان کر بہت افسوس ہوا۔ رات کو ٹیرس پر کھڑے سگریٹ پیتے اس کا دھیان نہ جانے کس سمت تھا کہ مایا دبے پیر چلتی ریلنگ کے پاس ان کے برابر چلی آئی۔

"کتنی بری بات ہے آپ چپکے چپکے اسموکنگ بھی کرتے ہیں۔ اٹس ناٹ فیئر ہاشم بھائی۔" وہ چونکے۔

"تم سے یہ کس نے کہا کہ میں چھپ کر اسموکنگ کرتا ہوں۔" رخ موڑے بغیر جواب دیا گیا۔

"اور نہیں تو کیا ورنہ اتنی رات کو یہاں ٹھنڈ میں آپ تھوڑی نا پیتے۔" اپنے تئیں اس نے پتے کی بات کی۔ دانستہ وہ اس کی سمت دیکھنے سے گریز کرنے لگے۔

"ہاشم بھائی! کیوں آپ اپنی لائف کو مشکل بنانے پر تلے ہیں۔ جسٹ تھرو دس۔" کہہ کر اس نے سگریٹ ان کے ہاتھ سے لے کر پھینک دی وہ ہکا بکا دیکھتے رہ گئے۔

"واٹ نان سینس از دس۔ تمہیں کیا لگا تمہاری اس اسٹوپڈ حرکت سے میں رک جاؤں گا نیور، اینڈ ہاؤ ڈیئر یو، ہوش میں آؤ مس مایا اب تم بچی نہیں رہی جسٹ گرو اپ۔ ایسی اسٹوپڈ حرکتیں تمہیں سوٹ نہیں کرتیں۔" اس نے پہلی بار ہاشم کو یوں غصے میں دیکھا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی سموئے وہ انہیں دیکھنے لگی۔

"آپ واقعی بہت بدل گئے ہیں ہاشم بھائی! آپ نے پہلے کبھی مجھ سے اس طرح بی ہیو نہیں کیا۔" نہ چاہتے ہوئے اس کا لہجہ نم ہوگیا۔ کہہ کر وہ رکی نہیں تیزی سے وہاں سے نکل آئی۔ جب کہ وہ ندامت سے اپنا سر تھام کر رہ گئے۔



صبح آفس کے لیے نکلتے وقت وہ انہیں لان میں تنہا بیٹھی دکھائی دی۔ بیگ اور لیپ ٹاپ سرفراز (ڈرائیور) کو تھما کر ریسٹ واچ دیکھتے وہ اس کی سمت چلے آئے۔

"گڈ مارننگ اینجل!" وہ اس کے سامنے رکھی

چیئر پر آبیٹھے اس نے جواب دینا ضروری نہ جانا تھا۔

''اوہ تو لٹل اینجل ناراض ہیں ہم سے۔'' وہ اسے تنگ کرنے کی خاطر بولے۔

''میں آپ سے ناراض نہیں ہوں بس اپ سیٹ ہوں۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اور تمہارے اپ سیٹ ہونے کا میری اسموکنگ سے کیا کنکشن؟'' وہ نا سمجھی سے پوچھنے لگے۔

''آپ ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں کیا۔ آپ کو اپنے سوا کسی کی پروا نہیں۔ ہاشم بھائی پتا نہیں کب سدھریں گے آپ۔'' وہ مایوسی سے کہنے لگی۔

''تم پہلی لڑکی ہو جو مجھے کہہ رہی ہو کہ میں بگڑا ہوا ہوں ورنہ آج تک تو مجھے صرف تعریفیں ہی سننے کو ملی ہیں۔'' وہ واقعی حیران تھے۔

''اچھا اوکے، اب تم آگئی ہو تو تم ہی مجھے سدھار لینا۔'' وہ فوراً ہار مانتے بولے۔

''سیریسلی......! تو آپ آئندہ اسموکنگ نہیں کریں گے، وعدہ کریں۔'' وہ جھٹ سے مطلب پر آئی۔

''اوکے بابا! کوشش کروں گا پر وعدہ نہیں۔'' اس کے کہنے پر بھی وہ خوش ہوگئی۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ دن بھر اس کی دلکش مسکراہٹ اس کے آنکھوں کے پردے پر چھائی رہی۔ اپنے لیے کسی کا اتنا فکر مند ہونا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔

آج وہ آفس سے جلدی لوٹ آیا۔ بابا نے واپسی پر مایا کے لیے کالج کے ایڈمیشن فارم لانے کو کہا تھا۔ شام کو لاؤنج میں بیٹھے وہ ایڈمیشن فارم کے متعلق ڈسکس کر رہے تھے۔

''پری میڈیکل میں ڈاکٹر بننا چاہتی ہوں ہاشم بھائی! گاؤں کے لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ بابا کی بھی یہی وش تھی اور میں ان کا خواب ضرور پورا کروں گی۔'' وہ اپنے ایڈمیشن فارم کو لے کر کافی ایکسائیڈ تھی۔ اس کے پچھلے نمبرز بھی کافی شاندار تھے اسے پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا وہ اس کے بچپنے پر مسکرا دیے۔ وہ اپنی اسٹڈیز کو لے کر بہت کریزی تھی۔ دن میں چھ سے آٹھ گھنٹے وہ کتابوں کو چاٹتی۔ اسے ہر حال میں اسکالرشپ حاصل کرنا تھا جس کے لیے وہ اتنی تگ و دو کر رہی تھی۔

☆......☆

''سنو لڑکی! خود پر تھوڑا ترس کھا لیا کرو۔'' ہاشم شام کو اس کے روم میں آئے۔ کتابیں پھیلائے ان پر سر رکھے وہ اونگھ رہی تھی۔ ان کی آمد پر وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

''سوسوری تھوڑی نیند آگئی بس۔'' آنکھیں مسلتے معصومیت سے کہا۔

''اچھا ویسے کھانا کھالیا۔'' ان کی بات پر زبان دانتوں تلے دبا کر اس نے اپنے سر پر چپت ماری۔

''سوری وہ بھی بھول گئی۔''

''پتا تھا مجھے۔'' انہوں نے ٹیبل پر رکھا باکس آگے کیا۔

''پیزا آڈر کیا تھا سو چاہل کر کھائیں گے۔''

''تھینکس۔'' پیزا کا بائٹ لیتے وہ بولی۔

''خود پر اتنا پریشر مت ڈالو اسکالرشپ کوئی اتنی تو ضروری نہیں اور پھر تمہاری پوزیشن تو ویسے بھی اسٹرونگ ہے۔'' وہ اسے سمجھانے لگے۔

''آپ کو نہیں پتا اٹس مائی ڈریم میں کسی کے احسان کے بوجھ تلے نہیں رہنا چاہتی میں اڑنا چاہتی ہوں بلندیوں کو چھونا چاہتی ہوں میرا اپنا نام ہوگا۔ اپنا امیج ہوگا یہ تب ہی پاسیبل ہے جب یہ سب میں اپنی مدد آپ کے تحت کروں ویسے بھی ماموں اور آپ نے جو کچھ کیا، کیا وہ کم تھا جو اپنی اسٹڈیز کو لے کر بھی میں آپ پر بوجھ بن جاؤں۔''

''آئی ڈونٹ بلیو تم ایسا بھی سوچ سکتی ہو۔ تم نے ہمیں یوں ایک پل میں غیر کر دیا۔'' وہ تاسف سے

بولے۔

''ایم سوری ہاشم بھائی! پر میں اپنوں کی نظروں میں گر کر بلند نہیں ہونا چاہتی اس لیے آپ جیسا سوچنا چاہیں آپ کی مرضی۔'' کہہ کر وہ دوبارہ کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔

چند پل یوں ہی بیت گئے تبھی اس وقت مایا کو سمجھانا انہیں دنیا کا مشکل ترین کام لگا تھا مگر وہ اس کی خودداری کے معترف ضرور ہوئے تھے۔

☆......☆

رات کو بہت بارش برسی تھی۔ صبح ہر چیز نکھری نکھری تھی۔ برستی بارش بالکل اس کے اندر کی عکاسی کررہی تھی۔ زویا کی تصویر تھامے کتنی دیر وہ اسے دیکھتے رہے۔ تصویر کو دیکھنے میں اتنے مگن تھے کہ مایا کے آنے کا احساس تک نہ ہوا۔

''آپ اب بھی زویا آپی سے بہت محبت کرتے ہیں نا؟'' مایا کو دیکھا تو انہوں نے فوراً فوٹو فائل میں رکھ دی۔

''محبت کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے پر نبھانا مشکل۔ دس سال کسی کی محبت میں خود کو فراموش کردینے کے لیے کافی ہوتے ہیں۔ اب آپ کو نہیں لگتا آپ کو آگے لائف بڑھانی چاہیے۔ کب تک آپ اس طرح اپنے ساتھ اپنوں کو دکھ دیتے رہیں گے۔'' اس کی بات پر وہ اچنبھے سے اسے دیکھنے لگے۔

''اپنوں کو دکھ اور میرا کیا، میرے دکھ کا کسی کو اندازہ ہے۔ مایا کہنا بہت آسان ہوتا ہے۔ پر میری جگہ پر خود کو رکھ کر دیکھو سب اپنے آپ سمجھ آجائے گا۔'' ان کی بات پر وہ بالکل خاموش ہوگئی۔

''اچھا ویسے کیوں آئی تھیں تم کام تھا کیا؟'' وہ پوچھنے لگے۔

''ایکچوئلی آپ کی ڈائری میں میں نے ایک نظم لکھی سوچا آپ کو شاید اچھی لگے۔''

''اور اگر ...'' بے ساختہ انہوں نے کہا۔

''ایم شیور، آپ جب اسے دیکھیں گے مجھے مس ضرور کریں گے اپنی وے میں چلتی ہوں۔'' وہ پلٹنے لگی۔

''اور ہاں ہاشم بھائی! ایک اور بات جو لوگ بچھڑ جاتے ہیں ان کے لیے آنسو نہیں بہاتے بلکہ ان کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں۔ آپ زویا آپی کے لیے دعا کریں آپ کو سکون ملے گا۔'' اس نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ زویا کے لیے دعا کرکے وہ واقعی خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگے تھے۔ یہ سب کرنا نجانے کیوں انہیں اچھا لگنے لگا تھا۔

☆......☆

زویا کے جانے کے بعد جیسے وہ ہنسنا مسکرانا بھول گئے تھے۔ زندگی میں پہلی بار انہوں نے کسی سے سچی محبت کی تھی اسے کھونے کا درد ہر شے سے بڑھ کر تھا۔ زویا کے علاوہ کبھی وہ کسی لڑکی کو لے کر سیریس نہ ہوئے تھے شاید اب اس کی ضرورت نہ تھی انہیں زندہ رہنے کے لیے کسی بہانے یا وجہ کی ضرورت نہ تھی۔ ان کے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ان کا کیریئر تھا ایک کامیاب وکیل بننے کے لیے انہوں نے بہت جدوجہد کی تھی تب جاکر انہیں یہ مقام ملا تھا۔ ماما اب بھی اکثر انہیں لڑکیوں کی تصاویر دکھاتیں مگر اس کی توجہ اس جانب نہ تھی پر مایا سے مل کر وہ بدلنے لگے تھے۔ وہ مسکرانے لگے تھے۔ خوش رہنے لگے تھے اس کی بچکانہ حرکتیں، اس کا انداز سب اسے بھلا لگنے لگا۔ مایا کی شاید ہی کوئی بات اسے بری لگتی۔ وہ محفلوں سے گریزاں رہتا۔ حد درجہ لاپرواہ بندہ اب مایا کے معاملے میں اپنی احساس ذمے داری پر خود حیران رہ جاتا۔ اسے کالج پک اینڈ ڈراپ کرنا، کبھی لائبریری تو کبھی اسٹڈیز کے معاملے میں اسے گائیڈ کرنا، مایا کے ساتھ وقت بیتنے کا احساس تک نہ ہوتا۔ مایا کی بات

کورڈ کرنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

☆......☆

اس روز بھی وہ ساڑھے پانچ بجے تھکا ہارا گھر لوٹا کہ مایا نے اسے جالیا، چاہنے کے باوجود وہ اسے منع نہ کر پایا۔ حالانکہ اس وقت اسے چائے کی شدید طلب تھی۔ مارکیٹ جا کر اس نے پوری مارکیٹ کھنگال ڈالی پر اسے مطلوبہ چیز نہ ملی۔ تبھی طارق روڈ کے ایک بوتیک جا کر اس نے ہاشم کے لیے سوبر قسم کا سوٹ پسند کیا۔ وہاں سے نکل کر اس کا رخ سیلون کی طرف تھا۔

''کافی ٹائم ہو گیا اب گھر چلیں۔'' ریسٹ واچ دیکھتے انہوں نے بیزاری سے کہا۔

''افوہ آپ روز فری تھوڑی ہوتے ہیں کم آن۔ ان کے بالوں کا نیچرل ڈائی کریں اور کٹنگ بھی کسی نیو لک کی جو انہیں سوٹ کرے اور ینگ بھی لگیں۔'' ہاشم کے منع کرنے کے باوجود اس نے اپنی ضد پوری کروا کر ہی دم لیا۔ اپنے نئے لک کو دیکھ کر وہ پہچان ہی نہ پائے ''سپرب'' وہ بچوں کی طرح خوش ہونے لگی۔

''تین گھنٹے کی انتھک محنت کا نتیجہ ہے میں نے کہا تھا آپ اتنے بھی بوڑھے نہیں۔ جتنا show کرتے ہیں۔ ویسے مامی نے کہا تھا کل آپ کو لڑکی والے دیکھنے آ رہے ہیں۔ میں نے سوچا اس طرح امپریشن اچھا پڑے گا۔'' وہ اپنی کامیابی پر بے حد خوش تھی۔ وہ ٹھٹھک کر اسے دیکھنے لگے۔

''واٹ ڈو یو مین، یہ سب تم نے مام کے ساتھ مل کر، ڈیم اٹ، مام کی بات تو چلو اور ہے بٹ یو، سب کچھ جانتے ہوئے بھی تم ایسا کیسے کر سکتی ہو۔ میں نے تمہیں کیا سمجھا اور تم کیا نکلیں اوروں کی طرح مطلبی، سیلفش میں نے کم از کم تم سے یہ ایسپیکٹ نہیں کیا تھا۔'' اس کی حرکت پر انہیں واقعی دکھ پہنچا۔ جبھی گھر پہنچ کر بنا کچھ کہے وہ اپنے کمرے میں بند ہو گئے نام کو اس نے ان لوگوں کو بلانے سے منع کر دیا۔ وہ اب مایا کو فیس نہیں کرنا چاہتا تھا مگر کب تک اگلی شام وہ اس کے سامنے تھی۔

''آپ اتنی جلدی ہم سے بیزار ہو گئے ہاشم بھائی! آپ کو مجھ سے چھپنے کی ضرورت نہیں میں نے ماموں سے کہہ دیا ہے اب ہم آؤٹ ہاؤس میں رہیں گے۔'' انہوں نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔

''ایم سوری ہاشم بھائی مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ آپ میری حرکت سے ہرٹ ہوں گے۔ ورنہ کبھی میں ایسا نہ کرتی میں واقعی بہت اسٹوپڈ ہوں۔'' انگلیاں آپس میں مسلتے وہ واقعی شرمندہ لگ رہی تھی۔

''اٹس او کے۔'' انہوں نے فقط اتنا ہی کہا تھا وہ ان کے سینے سے لگ گئی۔

''آپ کی مایا بہت بری ہے ہاشم بھائی پلیز آپ جو سزا دینا چاہیں دیں پر پلیز مجھ سے ناراض مت ہوں۔'' ہاشم کی سانس رکنے لگی۔ وہ اس کے پاس تھی اس کے دل کی حالت عجیب ہونے لگی۔ اس نے مایا کو دونوں شانوں سے تھام کر خود سے الگ کیا۔

''میری مایا دنیا کی سب سے اچھی لڑکی ہے۔ دیکھو اب رونا نہیں میں تم سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔'' ان کی بات پر آنسو صاف کر کے وہ دل سے مسکرا دی۔

''تھینکس ہاشم بھائی!'' وہ نجانے کیا کہنے لگی مگر اس کی نگاہیں اس کے ڈمپل والی مسکراہٹ پر ٹھہری گئیں۔ ساری رات وہ نم پلکیں اور ڈمپل والی مسکراہٹ اسے مضطرب کرنے لگیں وہ اپنی اس کیفیت کو کوئی نام نہ دے پایا۔

☆......☆

اسفندیار کے کیس کے سلسلے میں عظمت صاحب

آج کل کسی وکیل کی تلاش میں سرگرم تھے اس سلسلے میں ہاشم نے اپنے کولیگ سے بات بھی کر لی تھی۔ پیر کو کیس کی پہلی پیشی تھی پھپھو کی دعائیں طویل اور سجدے لمبے ہونے لگے۔ مایا بھی پریکٹیکلز کے سبب کالج سے لیو نہ لے سکی۔ ان روز وشب میں پہلی پیشی گزر گئی۔ اگلی تاریخ ایک ماہ بعد تھی پھپھو نے طویل قیام کے پیش نظر اور مایا کے کہنے پر آؤٹ ہاؤس میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ عظمت صاحب کبھی آمادہ نہ ہوتے اگر مایا نے ضد اور پھپھو نے اس کی حمایت نہ کی ہوتی۔ سنڈے کو جاگنگ سے واپس لوٹتے وہ گیٹ پر ٹھٹھک کر رک گیا سامنے بلیک ٹاپ اور جینز پہنے ننھے کبوتر کو دونوں ہاتھوں میں لے کر پیار کرتی مایا کھڑی تھی کس قدر معصومیت اور سادگی تھی اس کے انداز میں وہ کتنی ہی دیر محویت سے اسے دیکھتا رہا۔ ٹپ ٹپ بارش کی بوندیں اسے ہوش کی دنیا میں واپس لے آئیں۔

''اندر چلیں ہاشم بھائی ورنہ ٹھنڈ لگ جائے گی۔'' مایا کے متوجہ کرنے پر وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔ بارش رفتہ رفتہ تیز ہونے لگی۔ مایا اندر جا چکی تھی مگر وہ کتنی ہی دیر بھیگتا اسے سوچتا گیا۔ مایا کے لیے اس کے دل میں موجود جذبات بدلنے لگے تھے۔ اسے پہروں بیٹھ کر سوچنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ پر یہ اعتراف کرتے نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ سے بھی جھجھک جاتا۔ بارش میں بھیگنے کے سبب شام کو اسے موسمی نزلہ و بخار نے آلیا بخار اور دردسر کے سبب اس نے ڈنر پر آنے سے منع کر دیا۔ شرفو سرشام ہی ڈاکٹر کو لے آیا۔ ڈاکٹر کے نسخے کی دوا نے بھی خاطر خواہ افاقہ نہ کیا۔ مایا نے جب سنا فوراً دوڑی چلی آئی۔

''ویسے اس موسم میں میری ایسی حالت ہو جاتی ہے اب کی بار آپ نے یہ اپنے سر لے لی۔'' ان کا بخار چیک کرتے وہ فکرمندی سے کہنے لگی۔

''بس معمولی سا بخار ہے دوا میں نے لے لی۔ تھوڑا آرام کر لوں ٹھیک ہو جاؤں گا۔'' وہ نقاہت سے کہنے لگے۔

''ہاں وہ بھی کر لینا پہلے یہ سوپ پی لو۔'' مائی سوپ کا پیالہ لے کر آئیں۔

''مام کچھ تو رحم کریں مجھ سے سوپ وغیرہ نہیں پیا جاتا۔'' وہ ناگواری سے کہنے لگا۔

''لائیں مائی مجھے دیں میں پلاتی ہوں۔'' سوپ لے کر وہ اسے چمچ لے کر پلانے لگی۔ سلکی لیئرز میں کٹے بال کندھے پر ایک جانب پھیلائے اورنج کاٹن کے لباس میں ملبوس وہ اس وقت بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ مائی مسکراتے ہوئے پلٹ گئیں۔ مایا بھی تھوڑی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے جا چکی تھی مگر اس کے اندر جیسے ویرانیاں گھر کرنے لگیں۔ زویا کے بعد اب مایا کو کھونے کا حوصلہ اس میں نہ تھا۔ پھوپھا کے واپس آتے ہی یہ لوگ گاؤں واپس لوٹ جاتے اس طرح تو وہ مایا کو شاید ہمیشہ کے لیے کھو دیتا۔ پھوپھا کسی قیمت پر مایا کو اس کے سپرد نہ کرتے اور مایا کے بغیر رہنا اب جیسے ناممکن تھا۔ یہی پل تھا جب اس کے دماغ میں ایک خیال آیا۔ ماموں تو اس کی خواہش جان کر ساکت رہ گئے۔

''کیا فردوس آپا اس رشتے پر رضامند ہوں گی۔'' مام نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

''یہ میرا ہیڈک نہیں میں نے صرف آپ کو اپنی پسند سے آگاہ کیا ہے۔'' عظمت صاحب کو سمجھ نہ آیا کہ کہیں تو کیا لیکن جب فردوس بیگم نے یہ سنا تو جیسے ہتھے سے اکھڑ گئیں۔

''مانا کہ بھائی صاحب! ہاشم آپ کا اکلوتا بیٹا ہے پر مایا بھی میری بچی ہے کیسے اسے جان بوجھ کر اندھے کنویں میں دھکیل دوں کیسے اپنی سترہ سالہ بچی آپ کے چالیس سالہ بیٹے سے بیاہ دوں۔ بلاشبہ ہاشم میرا بھتیجا ہے پر سچ مانیں آپ کے منہ سے یہ سن

کر مجھے بہت ٹھیس پہنچی ہے بتائیں اگر مایا آپ کی بیٹی ہوتی تو کیا آپ تب بھی یہی فیصلہ کرتے؟'' ان کی بات پر عظمت صاحب خاموش ہو کر رہ گئے۔ مام نے جب سچویشن اسے بتائی تو وہ جیسے ضد پر اڑ گیا۔

''میں یہ سب نہیں جانتا مام! میں اگر شادی کروں گا تو صرف مایا سے اینڈ دیٹس آل، اور اگر آپ کے لیے یہ پاسیبل نہیں تو فائن آئندہ اس گھر میں اس ٹاپک پر کوئی بات نہیں کرے گا۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے نکل آیا نام اپنا سر تھام کر رہ گئیں جب کہ عظمت صاحب کی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

☆......☆

''مجھے یقین نہیں آ رہا عظمت بھائی ایسا کیسے سوچ سکتے ہیں آج اگر میں بے بس ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ میری مجبوری کا اس طرح فائدہ اٹھائیں۔'' مایا کو یہ سب سن کر شدید دھچکا لگا تھا۔

''میں ابھی ہاشم بھائی سے اس بات کا پوچھ کر آتی ہوں ایم شیور انہیں اس سب کے متعلق کچھ علم نہ ہوگا۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی مما نے اس کی کلائی تھام کر اس اقدام سے روکا۔

''ہرگز نہیں یہ سب ہاشم کی خواہش پر ہوا ہے۔'' مما کے انکشاف پر وہ ششدر رہ گئی۔ اگلے ہی پل وہ ہاشم کے کمرے میں اس کے روبرو تھی۔

''یہ سب کیا ہے ہاشم بھائی ماموں نے جو کہا کیا وہ سچ ہے۔'' وہ راکنگ چیئر پر بیٹھے تھے کہ اس کے داخل ہونے پر رک کر اس کی سمت دیکھنے لگے جو بالکل اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''ریلیکس آرام سے بیٹھو دراصل میں خود تم سے یہ سب ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔'' سامنے صوفے کی جانب اشارہ کر کے وہ آرام سے کہنے لگے۔

''امپاسیبل ہاشم بھائی! آئی ڈونٹ بلیو آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو اپنے بڑے بھائی کی طرح سمجھا اور آپ......!'' وہ بے یقینی سے کہنے لگی۔

''جسٹ لسین مایا! میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس سے تمہارے اعتماد کو ٹھیس پہنچے۔ میں زویا سے واقعی محبت کرتا تھا پر وہ سب اب ایک بھولا بسرا خواب بن کر رہ گیا ہے۔ اب میں تم سے محبت کرتا ہوں تمہارے علاوہ اور کسی کے بارے میں، میں تصور بھی نہیں کر سکتا ٹرسٹ می۔'' وہ اسے شانوں سے تھام کر کہنے لگے۔ اس کی آنکھوں میں تنفر کی جگہ خوف سا پھیلنے لگا۔ اس کی گرفت سے خود کو چھڑا کر وہ وہاں سے تیزی سے نکل آئی۔ جن رشتوں پر اس نے سب سے زیادہ اعتبار کیا تھا انہوں نے اس کے اعتبار کو کرچی کرچی کر دیا۔ اس وقت وہ صرف تنہا رہنا چاہتی تھی۔ بے شمار آنسو تکیے کو بھگونے لگے۔ صبح ناسازی طبیعت کے باعث اس نے کالج جانے سے منع کر دیا۔ اس وقت وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اسفندیار کے کیس کی سماعت میں صرف چند دن رہ گئے تھے ان پر فراڈ کا کیس ثابت ہو چکا تھا تمام ثبوت اور گواہ ان کے خلاف تھے بچنے کا صرف ایک راستہ تھا کہ وجاہت چوہدری یہ کیس واپس لے لے عظمت صاحب چوہدری کو مطلوبہ رقم دینے پر تیار تھے۔

''مگر انہوں نے ایک شرط رکھی ہے مایا وہ یہ کہ میں تمہاری شادی ہاشم سے کرا دوں۔'' فردوس بیگم کی بات پر وہ تو جیسے دنگ رہ گئی۔ اس کے نزدیک بابا کی رہائی اہم تھی پر ماموں کی خود غرضی پر اسے بہت رنج ہوا۔

''اور آپ نے کیا کہا؟'' وہ افسردگی سے پوچھنے لگی۔

''میں نے انہیں ہاں کر دی اور میں کرتی تو کیا بھائی صاحب کے پہلے ہم پر بہت احسان ہیں۔ رہنے کے لیے چھت سے لے کر تمہاری تعلیم، ہر مشکل وقت میں انہوں نے ہمیں سہارا دیا ہے۔ اور پھر کیا کمی ہے ہاشم میں۔'' وہ دکھ اور بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔

''تو آپ نے سودا کر لیا میرے خوابوں کا میری خواہشوں کا میری زندگی کا۔''

''نہیں میری جان ایسا کچھ نہیں ہے اور پھر اس طرح تمہارے سارے خواب پورے ہوں گے اب اگر حالات کٹھن ہیں تو اچھا وقت بھی ضرور آئے گا۔ سمجھنے کی کوشش کرو یہ سب میں نے تمہارے لیے کیا ہے ہمارا گھر بار سب چھن چکا ہے اور اب کوئی مدد کرنے کو بھی تیار نہیں۔ تمہاری تعلیم تمہارے خواب پورے ہونے کا اب یہی ذریعہ ہے۔'' وہ اسے سمجھانے لگیں۔

''آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں ہیں میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی جسے ہمیشہ میں نے اپنا محرم سمجھا ہو۔ ہاشم بھائی ہمیشہ زویا کے حوالے سے میرے لیے اہم ہیں اور رہیں گے۔ اس سے آگے کچھ نہیں۔'' اس نے سختی سے ان کی بات رد کر دی۔

''مایا میری جان مان جاؤ۔ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔ کیا تم اپنے خوابوں سے دستبردار ہو سکتی ہو۔ نہیں نا تو پھر میرا فیصلہ تسلیم کر لو اپنے لیے میرے لیے اپنے بابا کے لیے۔'' ان کی بات پر وہ مزید کچھ بول ہی نہ پائی بس گرم آنسو گال کو بھگونے لگے۔

شام کو ہاشم تقریباً چھ بجے گھر لوٹا وہ پورچ میں کھڑی اس کی منتظر تھی۔

''مبارک ہو بالا آخر اپنی سازش میں آپ کامیاب ہو گئے۔ آپ نے مما کو تو کونیس کر لیا مگر میں مر کر بھی آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں ہاشم بھائی! آج سے پہلے میری نظر میں جو آپ کا مقام تھا سب گر کر چور چور ہو گیا۔ زمین بوس ہو گیا۔ مٹی میں مل گیا۔ آج سے میرے ہاشم بھائی میرے لیے مر چکے۔ آپ نے میرے خوابوں کا خواہشوں کا سودا کیا یہ سودا آپ کو بہت مہنگا پڑے گا۔ آپ پچھتائیں گے تمام عمر۔ سکون کے لیے تڑپیں گے آپ مگر پھر بھی خالی ہاتھ رہیں گے۔ جس تکلیف سے میں گزری میری دعا ہے وہ آپ پر بھی گزرے۔ پل پل اذیت میں رہ کر آپ کو میری بے بسی کا اندازہ ہوگا اور ایسا ضرور ہوگا۔'' کہہ کر وہ رکی نہیں تیزی سے اندر چلی گئی۔ جب کہ وہ گم صم اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔

☆......☆

مایا کا بہت بری طرح نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ پھر مایا بھی چلی گئی اسے چھوڑ کر اس کے لیے تمام عمر کی ناتنہائیاں چھوڑ کر کتنی مشابہ تھی وہ زویا سے بالکل اسی کی مانند اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ آج ایک سال ہونے کو آیا تھا۔ اسے بچھڑے وہ اس کی قبر پر بیٹھا اپنی قسمت پر ماتم کناں تھا اس کے ہاتھوں نے اس کی پلکوں سے معصوم خواب چھین لیے۔ کاش وہ ایسا نہ کرتا تو آج مایا زندہ ہوتی اس کے خواب زندہ رہتے۔ کاش اسے کبھی محبت ہی نہ ہوئی ہوتی اور نجانے کتنے کاش تھے جو پچھتاوے بن کر اسے ڈسنے لگے وہ نم پلکوں سے اس خاک کو دیکھنے لگا جس کے سپرد اس کی متاع حیات تھی وہ متاع حیات جسے خود اس نے اپنے ہاتھوں سے اس مٹی کے سپرد کیا تھا۔ ساری فساد کی جڑ یہی محبت تھی۔ وہ محبت جو لازوال ہے جو امر ہے۔ باقی سب تو مایہ ہے۔

☆......

افسانہ

ابریل نوال

وہ جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا ہمیشہ کی طرح وہ صوفے پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ جب کہ ثانیہ اور تانیہ کسی شو پر بری طرح بحث کررہی تھیں اور امی ہاتھ میں تسبیح اٹھائے پڑھ رہی تھیں۔ وہ سب کو سلام کرتا صوفے پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا اور جب معمول حمیرا جلدی سے اٹھ کر اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے گلاس تھام لیا پھر اسے چڑانے کو امی سے بولا۔ حالانکہ وہ کبھی چڑتی ہی نہیں تھی وقار پھر بھی کوشش کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔

''امی! یہ حمیرا کوئی کام نہ کرے تو مجھے بتایئے گا میں اس کی خوب خبر لوں گا۔''

''ارے نہیں بیٹا! میری حمیرا جیسی بیٹی اور بہو اللہ سب کو دے۔ سارا دن میرے ساتھ کچن میں گزار دیتی ہے۔ کبھی سالن بنا رہی ہے، کبھی صفائی کررہی ہے سچ میرے جیسا خوش قسمت کوئی نہ ہوگا۔ جب کہ ثانیہ اور تانیہ کو بس ٹی وی دے دو اور کچھ نہیں ارے میں کہہ کہہ کر تھک جاتی ہوں پر یہ کسی کام کو ہاتھ تک نہیں لگاتیں۔ آخر کو اگلے گھر بھی جانا ہے خوب نام روشن کریں گی ماں کا۔'' حناء بیگم تو بھری بیٹھیں تھیں۔ اس کے چھیڑتے ہی شروع ہوگئیں جب کہ باتوں میں مصروف ان دونوں نے بے اختیار ماں کو دیکھا تانیہ بولی۔

''امی! ایسا تو نہ کہیں رات کو برتن کس نے دھوئے تھے۔''

''اور صبح کو چائے کس نے بنائی تھی۔ آپ ہماری تعریف کبھی نہیں کرتیں۔'' ثانیہ بولے اور تانیہ چپ رہے یہ ممکن تھا اسے بھی اپنی بنائی چائے آ گئی جبکہ حناء بیگم کا پارہ بڑھتا دیکھ کر حمیرا نرمی سے بولی۔

''امی! جب ان پر ذمے داری پڑے گی تو خود کام کریں گی۔''

''ارے بیٹا! آنا ہوگا تو کریں گی جب کہ آتا ہی نہیں تو۔''

''اچھا آپ چل کر سو جائیں چلیں چھوڑیں انہیں۔'' حمیرا نرمی سے کہتی ہوئی انہیں ان کے کمرے میں لے گئی تو وہ دونوں بڑبڑا کر رہ گئیں۔ وہ جیسے ہی کمرے سے نکلی وقار اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ٹیرس پر لے گیا۔ مغرب کا وقت ہو رہا تھا سورج غروب ہو رہا تھا وقار نرمی سے اسے دیکھتا ہوا بولا۔

''حمیرا! تم جانتی ہو، غروب ہوتے وقت سورج سرخ کیوں ہو رہا ہے؟'' حمیرا اسے دیکھنے لگی تو وہ مسکرا کر بولا۔

''اس لیے کہ وہ اپنے دن سے دور ہو رہا ہوتا ہے۔ اسی دکھ میں وہ سرخ ہو جاتا ہے۔ اور جانتی ہو رات کو چاند روشن کیوں ہوتا ہے کیوں کہ وہ اپنی رات سے مل رہا ہوتا ہے۔ جس طرح رات چاند کے بغیر ادھورا ہے اور سورج دن کے لیے ضروری ہے اسی طرح تم میرے لیے۔ تمہاری موجودگی میرے لیے آکسیجن کا کام کرتی ہے۔''

وہ محبت سے بولا تو حمیرا ایک دم شرما گئی پھر وقار بولا۔

''تم مجھ سے کتنی محبت کرتی ہو؟''

''میری محبت کا مجھے نہیں پتا بس اتنا پتہ ہے کہ تمہارے بغیر میں مر جاؤں گی کیوں کہ میں تم سے ہی زندہ ہوں۔'' وہ اپنی بات مکمل کرکے مڑی اور سیڑھیاں اترتی چلی گئی، جب کہ وقار کھل کر مسکرا دیا۔

☆......☆

ڈاکٹر علی کے صرف دو بیٹے تھے۔ بڑا اسحق چھوٹا رفیق، اسحق کی شادی حناء سے ہوئی جن کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا وقار تھا۔ جب کہ رفیق کی صرف ایک بیٹی حمیرا عروش تھی۔ جس کی پیدائش پر صائمہ کا (اس کی ماں) انتقال ہو گیا تھا۔ اور بیوی کے غم میں رفیق بھی چل بسے۔ تب حناء نے ماں کی طرح حمیرا عروش کی پرورش کی اسے بے حد محبت دی۔ اپنی بیٹی مانا، حمیرا اور وقار کی محبت دیکھ کر گھر والوں نے ان کی بات پکی

کردی۔ وقار نے جاب کے لیے دبئی جانا تھا۔ اس کے آنے کے بعد ان کی شادی طے پائی۔ حمیرا صرف گھر بھر کی لاڈلی نہیں تھی بلکہ پورا خاندان ننھیال سب اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اسے جو بھی کام بتادیا جاتا بغیر کسی ناگواری کے کرتی ہمیشہ سب کی ہاں میں ہاں ملاتی اور غلط بات پر ٹوکے بغیر نہ رہتی۔

☆......☆

وہ گھر داخل ہوا تو بے حد خوش تھا کیوں کہ اسے دبئی میں جاب مل گئی تھی۔ وہ حناء بیگم کے گلے میں بازو ڈال کر خوشی سے بتانے لگا تو حمیرا جو وہیں پر تھی جلدی سے اٹھ گئی۔ دو نفل شکرانے کے ادا کرنے کے بعد اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بے اختیار اس کے آنسو بہہ نکلے۔ منہ پر ہاتھ پھیر کر وہ مڑی تو وقار جو کب سے اسے دیکھ رہا تھا نرمی سے بولا۔

''اس لمحے پر قربان میرا دل میری جان
جس لمحے وہ دیکھتا ہے مجھے فرصت نکال کر''

''کب آئیں گے آپ وقار؟'' وہ بولی تو وہ بولا۔

''جلدی بارات لے کر آؤں گا۔ انتظار کرنا۔'' وہ مڑا تو حمیرا بے اختیار بولی۔

''جلدی آئے گا آپ کی حمیرا آپ کا انتظار کرے گی۔'' وہ مڑا اور مسکرا کر واپس چلا گیا۔ جب کہ بہت ضبط کے باوجود ایک آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر نکلتا چلا گیا۔ پھر اگلے دن کی فلائٹ سے وہ دبئی چلا گیا۔

☆......☆

وقت رک سا گیا تھا۔ دن تھم سے گئے تھے ایک سال اسے دس صدیاں لگ رہی تھیں اور پھر بلا آخر وقار کا فون آیا۔

''ہیلو حمیرا! تمہارا وقار آرہا ہے۔''

''کب؟'' وہ بولی۔

''اگلے ہفتے آئی لو یو۔'' اور پھر ہفتہ اسے مہینہ لگنے لگا گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ وہ اپنے دوست اکرام کے ساتھ بیٹھا تھا جب اکرام بولا۔

''یار! تو پرسوں جائے گا اور کل فرسٹ اپریل ہے یعنی اپریل فول۔'' اس کی بات پر وقار پرسوچ انداز میں بولا۔

''اپریل فول۔'' اور پھر مسکرا دیا۔ کل اس کی بارات تھی اس کا برسوں کا دیکھا خواب پورا ہورہا تھا وہ بے یقینی سے اپنے ہاتھوں پر سجی مہندی کو دیکھتی تو کبھی گھر کو وہ اس قدر خوش تھی کہ حد نہیں۔ تبھی اس کا فون بز کرنے لگا، انجان نمبر تھا اس نے حیرت سے اوکے کیا۔

''ہیلو! مسٹر وقار کا ایکسیڈنٹ ہوچکا ہے اور وہ ہم میں نہیں رہے۔'' اور فوراً بند کردیا۔ اس نے فون بند کرکے ایک نظر وقار کو دیکھا جو مسلسل مسکرا رہا تھا پھر بولا۔

''دیکھا بن گئی نا اپریل فول، اب میں کل گھر جاکر اسے حیران کردوں گا۔'' وہ مسکرایا۔

''لیکن یار......'' اس کا دوست اکرام پریشان سا بولا۔

''چھوڑ یار! مجھے پیکنگ کرنی ہے چل میری مدد کروا۔'' دوسرے ہی دن وہ خوشی خوشی گھر پہنچا تو ساکت رہ گیا سامنے ہی حمیرا سفید کفن پہنے پڑی تھی اس کے ہاتھ سے بیگ چھوٹ گیا وہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچا۔ وہ جاچکی تھی بہت دور اس کے ہاتھوں پر اپنے نام کی مہندی دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ حناء بیگم غم سے نڈھال بولیں۔

''کل اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا ہائے میری بچی۔'' اس نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تھا اور اس کے بغیر جینے کے تصور سے ہی مر گئی تھی۔ اس کا چھوٹا سا مذاق چھوٹا سا اپریل فول اس کی جان لے گیا تھا۔ اس کی زندگی برباد کر گیا تھا۔ وہ اپنے ہی ہاتھوں اپنی ساری خوشیاں گنوا بیٹھا تھا۔ یہ اپریل فول ایک زندگی لے گیا تھا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا کہ اب رونا مقدر ہی ٹھہرا تھا۔

......☆......

یاسمین آفریدی

افسانہ

اعتبارِ یار



بس ہوں لاریب آج میری شادی ہے مگر اس سے نہیں جس کے میں نے خواب دیکھے بلکہ اس سے جس کا میں کئی روز پہلے تک نام بھی نہیں جانتی تھی۔ کتنا عجیب لگتا ہے نا یہ سب، محبت کسی سے اور شادی کسی اور سے مگر میں پھر بھی بہت خوش ہوں کیونکہ میرے مالک نے اسی میں میری بہتری جانی ہے اور میں اس کے لیے اپنے مالک کی شکر گزار ہوں۔ کبھی کبھی کچھ رشتے نہ بننا ہی بہتر ہوتا ہے کیونکہ کبھی ایک ہی رشتہ ہمیں بہت سے رشتوں سے دور کر دیتا ہے۔

میں نے جس سے محبت کی اس نے مجھے بہت چاہا اتنا کہ اس کی شدید چاہت اور محبت نے مجھے ہر لمحہ آزمائش میں ڈالا مجھے صرف پریشانیوں میں گھیرے رکھا۔

میں گھر کی سب ہی بیٹیوں سے بڑی ہوں اسی لیے ہر کوئی مجھے چاہتا ہے چاہے وہ میرے چاچو ہوں، تایا ہوں یا ان کے بچے ہوں۔ گھر کے سب ہی لوگ مجھے بات بات پر چھیڑتے تاکہ میں بھی ان سب کو جواب دوں۔ ان میں سے ایک میرے تایا کے بیٹے بھی تھے۔ علی جنہیں میں نے ہمیشہ بڑا بھائی سمجھا مگر یہ بھول گئی کہ جنہیں ہم بھائی مانتے ہیں ضروری نہیں وہ بھی ہمیں بھائی کی نظر سے دیکھیں۔ خیر یہ تو تھے میرے تایا کے بیٹے ان سب کزنز میں میرے دو کزن اور بھی تھے۔ میرے چچا کے بیٹے حیات اور پھپھو کے بیٹے حمزہ۔ جو مجھ سے زیادہ بس سال ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ نہ جانے ان کے دل میں میرے لیے کس طرح کی پسندیدگی تھی یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے، ان دونوں میں اور علی میں ایک فرق تھا۔ علی کی میں نے ہمیشہ عزت کی اور حیات، حمزہ کو اکثر کھری کھری سنا بھی دیتی۔ ان سے دوستی ہونے کے باعث کافی فرینک تھی۔ اتنی کہ وہ ہر بات ہر مسئلہ مجھ ہی سے شیئر کرتے، میں انہیں برا بھلا بھی کہہ دیتی تو بھی وہ دونوں خاموشی سے سنتے۔ انہی ہنستے کھیلتے دنوں میں علی کی کال موصول ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ وہ مجھے چاہتے ہیں اور ہم دونوں کی شادی ہو ایسا گھر والے چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں صاف انکار کر دیا اور کہا۔

''میں تو آپ کو اپنا بڑا بھائی سمجھتی تھی، میں نہیں جانتی گھر والوں کی کیا مرضی ہے، وہ کیا چاہتے ہیں جب گھر والے مجھ سے اس موضوع پر بات کریں گے میں جب سوچوں گی اس بارے میں۔ فی الحال میں ایسا کچھ نہیں سوچتی۔'' ان کو اتنا روڈ جواب دینے کے بعد بھی میرے اندر کوئی ملال نہ تھا مگر گزرتے دنوں میں، میں علی کے بارے میں کافی حد تک سوچنے لگی۔ مجھے محسوس ہوا میں نے غلط کیا اور میں نے سوری کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنے رویے کے لیے معذرت ظاہر کی تو علی نے بھی خوش اسلوبی سے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور پھر کچھ ہی دنوں بعد چاچو اور چاچی نے حیات کے نکاح کا اعلان کر دیا۔ سب ہی خوش تھے میں بھی بہت ایکسائیٹڈ تھی۔ میرے دوست کا نکاح ہو رہا تھا اور ان ہی دنوں مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں بھی علی سے محبت کرنے لگی ہوں۔ اسی لیے میں نے فوراً ہی علی سے اپنی محبت کا اظہار کر ڈالا۔ اب تک سب کچھ بظاہر بہت اچھا چل رہا تھا۔ میں اب اور بھی خوش تھی مگر کہیں بہت گڑبڑ ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی جلد بازی کے فیصلے ہماری ذات پر بہت بڑا بوجھ ڈال دیتے ہیں۔ اس کا اندازہ مجھے کچھ ہی دن میں ہو گیا تھا۔

حیات سے اب بھی میری پہلے جیسی ہی دوستی تھی۔ وہ حمنیٰ کی باتیں اکثر مجھ سے کرتا اور میں بہت مزے سے سنتی مگر کہیں ہماری دوستی کو بہت غلط نام دیا جا چکا تھا۔

☆......☆

حیات کے نکاح کو سال گزر چکا تھا اور میں ان دنوں علی کے بدلے بدلے رویے سے کافی پریشان تھی۔ پھر ایک دن حیات کی کال اور اس سے اگلے ہی دن حمزہ کے میسیج نے مجھے غصہ دلا ڈالا تھا۔

حیات کی جس وقت کال آئی میں اپنے سیکنڈ ایئر کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھی۔ میں نے کال ریسیو کر کے بڑے ہی مصروف انداز میں ہیلو کہا۔

''لاریب! کیسی ہو؟'' دوسری طرف سے حیات کی آواز تھی۔

''جیسی پہلے تھی حسین، خوب صورت، خوب سیرت تم بتاؤ کیسے فون کیا؟'' میں نے شرارتی انداز میں جواب دے کر اس کے فون کرنے کا جواز جاننا چاہا۔

''میں نے کچھ بات کرنی تھی تم سے ضروری بات ہے تم مصروف ہو؟'' حیات نے میری مصروف سی آواز سن کر پوچھا۔

''ہاں پڑھائی میں مصروف تھی۔ تم کہو کیا کہنا ہے میں سن رہی ہوں۔'' میں نے بکس سائیڈ میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

''پلیز تم ناراض نہ ہونا اور نہ غصہ۔'' حیات نے تاکید کی۔

''ایسی کیا بات ہے؟'' میں پورے دھیان سے اس کی بات سننے لگی۔

''میں حمنیٰ سے شادی کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ میں تنگ آ گیا روز کے لڑائی جھگڑوں سے، میں نے ہمیشہ تم سے محبت کی تمہیں چاہا اور آج بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' حیات کی بات نے میری بولتی بند کر ڈالی تھی۔ مجھے ایک دم بہت شدید غصہ آیا تھا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا اپنے بارے میں نہیں اپنی منکوحہ کے بارے میں سوچو، خیر آج کے بعد تمہارا اور میرا کزن کے علاوہ کوئی رشتہ نہیں، مجھ سے دوبارہ بات کرنے کی کوشش بھی مت کرنا۔'' میں نے غصے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔ میرے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اگلے روز میرا پیپر تھا اور میں اس نئی مصیبت میں پھنس چکی تھی۔

☆......☆

پیپرز کی تیاری کافی اچھی طرح کی تھی اسی لیے حیات کی کسی بات کا اثر پیپر پر نہیں ہوا تھا۔ کہتے ہیں غصے میں انسان ہمیشہ اپنا ہی نقصان کرتا ہے مگر میں نے انجانے میں اپنا فائدہ کر ڈالا تھا۔ میں نے حیات کے فون کے بعد ساری کہانی علی کو سنا ڈالی تھی۔

مگر جب میں گھر واپس آئی تو مجھے حمزہ کا میسج موصول ہوا جس میں لکھا تھا۔

''آئی رئیلی لو یو لاریب! میں کل ہی ماما کو رشتہ لے کر تمہارے گھر بھیج رہا ہوں۔ تمہارے جواب کا منتظر حمزہ۔''

مجھے سمجھ ہی نہ آیا یہ سب میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے میں نے بھی جوابی میسج میں خوب سنا ڈالی تھیں اور اس بار بھی میں علی کو سب بتا چکی تھی۔ میں نے حیات اور حمزہ دونوں ہی سے قطع تعلق کر ڈالا تھا۔

میں نے ان دونوں کے بارے میں علی کے علاوہ کسی سے ذکر نہیں کیا تھا مگر ایک دن میری کزن مہک نے مجھ سے سوال کیا۔

''تمہاری حیات اور حمزہ کے ساتھ دوستی کس نوعیت کی ہے؟'' مجھے اس کی بات پر بے حد غصہ آیا۔

''میری ان دونوں سے دوستی تھی اب نہیں ہے آج کے بعد مجھ سے ان لوگوں کا ذکر مت کرنا۔'' میں اس کو تنبیہہ کرتی اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میری سمجھ سے باہر تھا کہ میری دوستی کو غلط رنگ کیوں دیا جا رہا تھا۔ میں اب اپنے سب ہی کزنز سے ریزرو رہتی چاہے وہ لڑکیاں ہوں یا لڑکے، ان سے ایک حد تک بات کرتی۔

سال بھر بعد ہی حیات کی شادی کے انوی ٹیشن نے مجھے پرسکون کر ڈالا تھا اور ساتھ ہی گھر میں میری شادی کا ذکر بھی چھڑ چکا تھا۔ مجھے لگا اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ جس دن حیات کی شادی کی پہلی ڈھولکی تھی میں بھی خواتین کے ساتھ ڈھولکی میں انجوائے کر رہی تھی جب میرے پاس حیات کا میسج آیا۔

''مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' میں اب کوئی نئی مصیبت نہیں پالنا چاہتی تھی اسی لیے میں نے جواب دیے بغیر میسج ڈیلیٹ کر ڈالا۔ اس وقت میں نہیں جانتی تھی کہ وہ میرے پیچھے کھڑا میری اس حرکت کو نوٹ کر چکا ہے۔ اس نے سب سے نظر بچا

کر میرے کان کے قریب سرگوشی نما انداز میں کہا۔
''میں اوپر ٹیرس پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سنبھل کر کہہ ڈالا۔
''میں نہیں آؤں گی۔'' کوئی بھی ہماری طرف متوجہ نہ تھا۔
''تم آؤ گی۔ میرے لیے نہیں اپنے لیے میں تمہیں کچھ سچائی بتانا چاہتا ہوں۔'' وہ اس یقین کے ساتھ کہہ کر جا چکا تھا کہ میں ضرور جاؤں گی وہ یہ جانتا تھا اس کی اتنی بات ہی مجھے تجسس میں مبتلا کر گئی اور میں نے اس کے یقین پر مہر بھی لگا ڈالی۔ میں چھت پر چلی آئی۔ جہاں دیوار کے ساتھ حیات نظریں جمائے کھڑا تھا۔ میں بھی اسی طرف چلی آئی اور باہر لان کو دیکھنے لگی جہاں علی اور حمزہ سمیت سب ہی مرد حضرات موجود تھے۔
''جلدی کہو کیا کہنا ہے۔'' میں نے ہی بات کا آغاز کیا۔
''تم اب تک مجھے غلط سمجھتی ہو مگر آج ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں میں نے ہمیشہ اسی سے محبت کی جس سے میری شادی ہو رہی ہے تم صرف میری بہت اچھی کزن اور دوست ہو، اس سے زیادہ کچھ نہیں مگر اپنے لیے کوئی بھی فیصلہ لینے سے پہلے علی کی سچائی جاننا تمہارا حق ہے۔'' وہ پل بھر کے لیے رکا تھا اور میں سانس روکے اس کی اگلی بات کی منتظر تھی۔
''میں نے خود سے تمہیں پرپوز نہیں کیا تھا۔ نہ ہی میں ایسا چاہتا تھا مگر میں مجبور تھا علی نے مجھے بہت سے واسطے اور قسمیں دے کر مجبور کر ڈالا تھا یہ صرف علی کے دماغ میں بھرا خناس تھا وہ یہ سمجھتا ہے کہ تم مجھے پسند کرتی تھیں اور میرے نکاح کا سننے کے بعد تم نے صرف اپنا دل بہلانے کے لیے اس کے پروپوزل کا پازیٹو جواب دیا۔ وہ تمہیں آزمانا چاہتا تھا کہ تم اس سے کتنی سچی محبت کرتی ہو اور جس وقت میں نے تمہیں کال کی وہ میرے ساتھ تھا۔ میری اور تمہاری ساری باتیں سن رہا تھا اور اس نے یہ سب صرف میرے ذریعے نہیں بلکہ حمزہ کے ذریعے بھی کیا حمزہ نے بھی

اسی کے کہنے پر تمہیں میسج کیا اور مہک کو بھی اسی نے تم سے معلوم کرنے کو کہا۔ مجھے لگا وہ مجھ سے کال کروا کر مطمئن ہو گیا ہو گا مگر میں غلط سمجھا اس نے ایک بار نہیں تمہیں کئی بار آزمایا اور وہ اب بھی پوری طرح تم پر بھروسہ نہیں کرتا۔ میرا فرض تھا تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنا۔ آگے تم خود سمجھدار ہو۔ اپنے لیے بہتر سوچ سکتی ہو۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے ایک نظر مجھ پر ڈال کر جا چکا تھا اور میں وہاں پہروں بیٹھے یہ سوچتی رہی کہ اگر اتنی بے یقینی ہے تو محبت کہاں ہے اس رشتے میں، یہ محبت نہیں تھی بلکہ محبت تو کہیں نہیں تھی۔ میں نے اسے اللہ کی طرف سے آزمائش جان کر صبر کر لیا تھا۔
گھر آ کر میں نے ایک ایک بات ماما کو بتا ڈالی تھی اور ماما نے پاپا کو، میں نہیں چاہتی تھی کہ گھر میں کوئی لڑائی ہو، اسی لیے پاپا نے میرا رشتہ اپنے دوست کے بیٹے سے طے کر دیا گھر میں سب ہی کو بہت اعتراض ہوا ان میں علی بھی شامل تھے۔ کئی دنوں تک علی کے میسج آئے جس کے بدلے میں، میں نے صرف ایک ہی جواب دیا۔
''آپ سے میں نے محبت کرنا نہیں سیکھی تو کیا ہوا، آپ نے مجھے سکھایا کہ محبت میں آزماتے کیسے ہیں، اب میں کسی پر اندھوں کی طرح اعتبار نہیں کر سکتی۔ آپ نے میرے مخلص دوستوں کو بھی میری نظر میں بے اعتبار کر ڈالا۔ آپ نے مجھے قدم قدم پر آزمایا جب کہ یہ حق تو اللہ نے بھی آپ کو نہیں دیا۔
''خیر جو ہوا سو ہوا دو ماہ بعد میری شادی ہے۔ شرکت ضرور کریئے گا۔ کیونکہ میں بھی آپ کو تکلیف میں دیکھنا چاہتی ہوں۔'' اس ملاقات کے بعد میں نے اب تک کسی سے رابطہ نہیں رکھا۔ آج سب ہی میری خوشی میں شریک ہونے والے ہیں اور میں ایک بار پھر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں کہ اس نے مجھے زندگی بھر آزمائے جانے سے بچا لیا اور رہا اپنوں پر اعتبار.....تو وہ بھی آ ہی جائے گا۔

......☆......

مریم فاطمہ

افسانہ

غروب

ہوا میں خنکی تھی، سردی بہت تھی، اس نے ٹھنڈ سے بچنے کے لئے ایک شال اپنے جسم پر اوڑھ رکھی تھی، کاش کہ اس گھر میں ایک ہیٹر ہوتا لیکن ہیٹر تو دور کی بات ابا کے پاس تو انگیٹھی لینے تک کے پیسے نہیں تھے، اسے رہ رہ کر اس بات کا افسوس



ہو رہا تھا، پرسوں اسے اپنی دوست ثنازیہ کی شادی میں بھی جانا تھا، وہ سوچ رہی تھی کہ کون سے کپڑے پہنے گی، تمام فینسی سوٹ وہ اس کے گھر پہن کر جا چکی تھی، اس بار کوئی نیا ہونا چاہیے تھا لیکن نیا سوٹ وہ کہاں سے لاتی۔ تب ہی اسے اس مسئلے کا حل سمجھ میں آیا، وہ کام سے فارغ ہو کر جلدی جلدی سامنے والی مریم کے پاس پہنچی۔ مریم سے اس کی زیادہ دوستی تو نہ تھی لیکن فی الحال اس کی مدد کی ضرورت تھی، ویسے بھی ان کے حالات اس سے کہیں بہتر تھے۔

"السلام علیکم مریم! کیسی ہو؟" اقصیٰ نے سلام کے بعد اس کا حال پوچھا۔

"وعلیکم السلام! ٹھیک ہوں، تم سناؤ کیسے یاد کرلیا"۔ مریم نے منہ چڑھا کر جواب دیا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں، وہ دراصل میری دوست کی پرسوں شادی ہے تو میرے پاس کوئی کپڑے نہیں ہیں پہن کر جانے کے لئے، اگر تم اپنے پاس سے کوئی سوٹ دے دو تو بڑی مہربانی ہوگی"۔

"نہ بابا میں تمہیں اپنا کوئی سوٹ نہیں دے سکتی، معاف کردو برا نہ ماننا لیکن اس سے پہلے میں نے کنول کو اپنا سوٹ ایک دفعہ شادی میں پہننے کے لئے دیا تھا، اس نے شادی میں اس پر قورمہ گرا کے بالکل ناس مار دیا"۔ اس نے بڑی رکھائی سے جواب دیا۔

مریم نے کچھ اس طرح کہا تھا کہ پھر اقصیٰ زیادہ دیر وہاں نہ رک سکی۔ بس خدا حافظ کہہ کر واپس گھر آ گئی۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ ایسا کیا کروں کہ کہیں سے پیسے کا بندوبست ہو جائے۔

"اگر ادھار لیتی ہوں تو وہ چکانے کا مسئلہ"۔ آخر اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ وہ چپکے سے اٹھ کر ابا کے کمرے میں آئی۔ الماری کی دراز کھولی اور ہزار ہزار کے دو کرارے سے نوٹ نکال لئے۔ پھر وہ چپکے سے واپس اپنے کمرے میں آئی اور وہ پیسے اپنی کالج کی کتاب میں چھپا دیئے۔

پھر شام کے وقت کسی بوتیک سے ایک اچھا سا سوٹ خریدا اور گھر آ کر اماں ابا سے کہا کہ کسی سہیلی نے تحفے میں دیا ہے۔

پھر شادی والا دن بھی آ گیا، وہ خوب سج سنور کر ثنازیہ کی شادی میں پہنچی، وہاں بریانی اور زردے سے اسے انصاف کرتا دیکھ کر اس کی ساری سہیلیاں اسے چھیڑتی رہیں، کھانے کے معاملے میں پیٹو کہتی رہیں۔

دراصل گھر میں تو کبھی ایسا کھانا بنتا نہ تھا، آج اتنا ذائقے دار کھانا کھا کر مزہ آ گیا تھا۔ اس کی سہیلی نجمہ نے تجسس سے پوچھا۔

"اقصیٰ! ایک بات تو بتاؤ یہ سوٹ تم نے کب خریدا؟" وہ جانتی تھی کہ اس کے گھر کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ نجمہ کیونکہ اس کی بہترین دوستوں میں سے تھی اس لئے اس نے اسے سب کچھ سچ بتا دیا۔

یہ سنتے ہی نجمہ اپنے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھ کر توبہ توبہ کہنے لگی۔

"یہ تو نے بہت غلط کیا اقصیٰ! تجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا"۔

نجمہ نے یہ بات شادی میں آئی اس کی باقی کی سہیلیوں کو بھی بتائی اور پھر تو یہ بات جنگل کی آگ کی طرح سارے میں پھیل گئی کہ یہ لڑکی چور ہے۔ وہاں موجود ہر عورت اسے تنقیدی نظروں سے دیکھنے لگی۔

جب وہ گھر پہنچی تو معلوم ہوا کہ جو دو ہزار روپے اس نے ابا کی الماری سے چرائے تھے وہ دراصل انہوں نے اپنی دوائی کے لئے رکھ چھوڑے تھے اور اب وقت پر دوائی نہ ملنے سے ان کی حالت خراب ہو گئی تھی۔ انہیں سانس رک رک کر آ رہی تھی، وہ اور اماں انہیں فوراً سرکاری ہسپتال لے کر گئیں لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی، ان کی روح اس دنیا سے پرواز کر چکی تھی۔ اماں، ابا کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر سکیں اور ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

اب وہ سوچ رہی تھی کہ اگر میں اس وقت ابا کی الماری سے پیسے نہ نکالتی تو یہ سب نہ ہوتا لیکن اب پچھتانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ میں پہلے اتنی غریب نہیں تھی جتنی کہ اب ہو گئی ہوں۔

☆......☆......☆

سحر مبین

افسانہ

بے وجہ ہی

سرخ پانچ انچ کی ہیل میں مقید اس کا نرم دودھ ملائی جیسا سفید پاؤں اچانک اس کے پیروں کو چھوتے سرخ گاؤن سے الجھا تھا اور وہ زمین بوس ہو جاتی، اگر اس کا مضبوط ہاتھ اسے تھام نہ لیتا تو۔

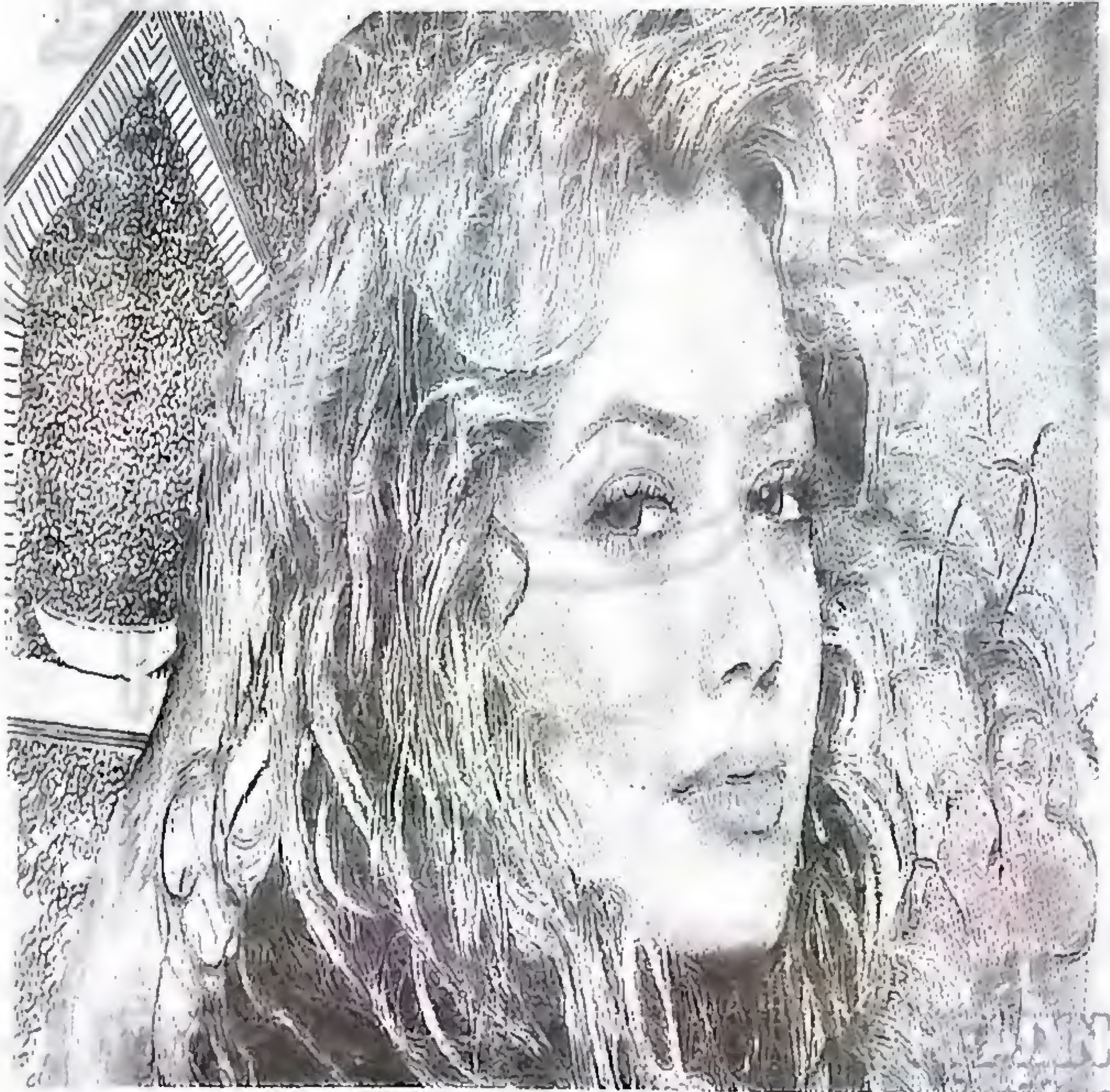


"بی کیئرفل انوشہ۔" ہلکی خفگی سے ڈپٹا گیا تھا۔ وہ ابھی کچھ لمحے پہلے ہی گاڑی سے اتری تھی اور وہ ابھی گاڑی سے اتر ہی رہا تھا جب اسے انوشہ کو گرنے سے بچانا پڑا۔ سیاہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس اس کا بازو ابھی تک انوشہ کی کمر کے گرد حمائل تھا، جو بے اختیاری میں اس کی طرف بڑھا تھا۔

"اوہ تھینکس میکال"۔ وہ حواس باختہ سی بولی۔ کچھ لمحے سرکے تھے اور وہ دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔

یہ ایک اپر کلاس فنکشن تھا، نامعلوم کس چیز کا۔ یہ تو ان دونوں کو بھی یاد نہیں ہوگا کہ وہ کسی برتھ ڈے پارٹی میں آئے یا کسی اینیورسری میں، کیا خبر کوئی شادی ہی ہو، انہیں بس پارٹیز اٹینڈ کرنے کا کریز تھا۔ کہیں سے بھی انوی ٹیشن ہوتا ان دونوں کا ساتھ ساتھ جانا لازمی امر تھا۔

پارٹی کی رونقیں عروج پر تھیں جب میکال، انوشہ کی کمر میں بازو حمائل کیے قدم قدم بڑھ رہا تھا، انوشہ کی اکڑی ہوئی گردن اور ہونٹوں پر کھیلتی دلفریب مسکراہٹ، سلیولیس گاؤن سے جھانکتے اس کے نرم دودھیا بازو۔ اف... کمال کی جوڑی تھی دونوں کی، اور وہ دونوں اس سے بخوبی واقف تھے۔ بہت سی



سراہتی اور دیگر حاسد نگاہیں ان کی جانب اٹھی تھیں۔ کچھ اٹھی نگاہوں میں بے فکری تھی جیسے انہیں ان کی لاجواب جوڑی سے غرض ہی نہ ہو۔

انوشہ اور میکال کا کپل ان کے سوشل سرکل میں بہت مشہور اور بے مثال مانا جاتا تھا، پچھلے کچھ برسوں سے وہ ایک ساتھ ہی دکھائی دیتے تھے اور جلد ہی شادی کا ارادہ رکھتے ہوئے ہمیشہ ایک ساتھ ہی دکھائی دینے کے تمنائی تھے۔

وہ دونوں اب کلوز فرینڈز سے بغل گیر ہونے میں مصروف تھے، دور نزدیک سے نظر آتے انکل، آنٹی کی طرف ''ہیلو''، ''ہائے'' کے تبادلے کے سلسلے بھی جاری تھے۔

''میکال! تم کب انگیجمنٹ فنکشن پر انوائٹ کر رہے ہو؟'' ہاتھ میں ڈرنک کا گلاس تھامے سپ لیتی فارہ نے پوچھا تھا۔ انوشہ اور میکال کے لبوں پر بڑی محظوظ اور جاندار مسکراہٹ آئی تھی۔

''بہت جلد''۔ جواب سن کر جہاں فارہ کا قہقہہ بلند ہوا تھا وہیں انوشہ اور میکال سمیت باقی دوستوں نے بھی دل کھول کر اس کا ساتھ دیا تھا۔ رات گزرتی جارہی تھی اور وہ مستیوں میں مصروف تھے۔

☆..........☆..........☆

انوشہ کے والد تین برس قبل ہی میکال کے پڑوس میں ایک بنگلے میں شفٹ ہوئے تھے۔ انوشہ اور میکال کے والد آپس میں دیرینہ اور گہرے دوست تھے۔ دونوں گھرانوں کے آپس میں بہت اچھے اور گہرے مراسم تھے، انوشہ کی ایک بڑی بہن بھی تھی جو شادی شدہ تھی اور ادھر میکال بھی سب بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ تین برس قبل ہی ان دونوں کی دوستی ہوئی تھی، خوب انڈراسٹینڈنگ اور پھر بے تحاشا پیار جو گہری دوستی میں چھپا تھا اور پھر اچانک سے ظاہر ہوا اور وہ دونوں دل کھول کر اپنی ہر ہر کیفیت ایک دوسرے سے شیئر کرتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔

انہیں زندگی بہت رنگین اور پیاری لگتی تھی۔ ہر طرف رنگ ہی رنگ تھے۔ بے فکری تھی، سب کچھ اپنا تھا، بے انتہا چاہنے والے دو دل اور ان کا بے تحاشہ لگاؤ اور خلوص، ہاں سب اچھا ہی تھا، وہ ایک دوسرے سے مطمئن تھے، دونوں میں بلا کی انڈراسٹینڈنگ تھی، پسند ناپسند سب ملتی جلتی، کسی کو دوسرے سے شکایت نہیں تھی، غرضیکہ زندگی واقعی حسین تھی۔

☆..........☆..........☆

رات ممی نے ڈائننگ ٹیبل پر ہی انوشہ کو آپی کے دیور کی شادی میں شرکت کے لیے تیاری مکمل رکھنے کا کہہ دیا تھا۔ آپی بیرون ملک ہی اپنے سسرال سمیت سیٹل تھیں اور وہیں ان کے دیور کی شادی ہونا تھی۔

مما پاپا نے بس تقریب میں ہی شرکت کرنا تھی، سو ان کا اسٹے محض دو تین دن تک تھا جبکہ آپی انوشہ کو کم از کم پندرہ بیس دن اپنے پاس روکنے پر بضد تھیں۔ میکال اسے ایئرپورٹ پر سی آف کہہ آیا تھا۔

اور پھر وہ شادی میں مکمل طور پر مصروف ہوگئی۔ اٹھارہ دن بعد وہ واپس آئی تھی، اس کا ارادہ میکال کو سرپرائز دینے کا تھا، وہ اس کے کمرے میں گئی تھی مگر وہ تو گھر میں ہی موجود نہیں تھا، اسے خود کو میکال کا شام تک انتظار کرنے کے لیے تیار کرنا پڑا۔

رات ہوتے ہی وہ بغیر کھانا کھائے اس کے گھر تک آئی تھی، اس کا ارادہ آج میکال کے ساتھ ڈنر کا تھا، وہ اس وقت بھی گھر میں نہیں تھا۔ اسے سن کر افسوس ہوا۔ بھابیوں نے اسے کھانے پر روکا تھا مگر وہ باہر لان میں آگئی۔

بظاہر تو وہ قدم بقدم لان ماپنے میں مصروف تھی مگر شدت سے میکال کی واپسی کی منتظر تھی۔ وہ اسے کال نہیں کرنا چاہتی تھی مگر... سرپرائز کے چکر میں خود ہی ہلکان ہوئے جارہی تھی۔ وقت گزرنے لگا تھا، اس کی ٹانگیں شل ہوچکی تھیں، وہ لان میں رکھی چیئر پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اس کے حواس بحال ہوئے تو اس

نے رات کی تاریکی کو مزید گہرا محسوس کرتے ہوئے بے اختیار وقت دیکھنے کو موبائل اٹھایا تھا۔ 12 بجنے کے قریب تھے، وہ آٹھ بجے کے قریب اس کے گھر آئی تھی، بے اختیار ہڑبڑا کر اٹھی۔

شاید میکال آ گیا ہو اور اسے پتہ نہ چلا ہو، وہ بھاگتی رہائشی حصے کی طرف گئی تھی، ابھی تک چھوٹی بھابی اور بھائی لاؤنج میں موجود تھے، وہ جاتے جاتے پلٹ آئی۔ موڈ ایکدم بگڑا تھا، اور خراب موڈ کے ساتھ ہی وہ دونوں گھروں کی درمیانی دیوار میں موجود دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

بیڈروم میں جانے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک اسی متعلق سوچتی رہی تھی۔ جانے کب نیند آئی۔

صبح ناشتے کے بعد وہ پھر سے میکال کی طرف گئی۔ اسے امید تھی کہ وہ ابھی تک سویا ہوا ہوگا اور ہوا بھی یہی۔ انوشہ کے اٹھانے پر ہی وہ اٹھا تھا۔

''کہاں تھے کل کا دن؟'' اس کی کھلتی آنکھوں کو دیکھ کر وہ تیزی سے بولی، انداز ڈپٹنے والا تھا۔

''یہیں تھا''۔ وہ سادگی سے بولا تھا۔

''نہیں تھے یہیں''۔

''یس نہیں تھا یہاں''۔ وہ سابقہ لہجے میں بولا۔

''تو پھر کہاں تھے؟''

''لانگ ڈرائیو پر''۔

''ہوں... کیسی رہی پھر؟''

''اچھی تھی''۔ وہ مختصراً جواب دے رہا تھا، انوشہ نے اس کے سنجیدہ سے لہجے کو قصداً نظرانداز کیا۔ یقیناً ابھی اس کا بولنے کا موڈ نہیں ہوگا۔ آخر ابھی تو اٹھا ہے۔ وہ اس کے سنجیدہ مزاج کو نظرانداز کر گئی تھی۔ وہ اس کے جانے سے جتنا بے قرار تھا اب واپس آنے پر ساری گرم جوشی مفقود تھی۔ مگر یہ باتیں نظرانداز کر دینے کے لئے ہی وقوع ہوئی تھیں۔ یہ کوئی خاص معنی نہیں رکھتی تھیں۔ انوشہ اتنا گہرائی میں جا کر ہرگز نہیں سوچ رہی تھی۔ وہ انوشہ تھی اور وہ اس کا میکال، اور سب اچھا تھا۔

وہ اپنے مزاج کے مطابق بولنا شروع کر چکی تھی۔ وہاں شادی کے قصے، یہ، وہ، اس نے کہاں کہاں میکال کو زیادہ یاد کیا، کیسے لباس زیب تن کیے، اور وہ سن رہا تھا بس۔

☆..........☆..........☆

میکال اکثر گھر سے باہر رہتا تھا، اس کا موبائل زیادہ تر آف ہی رہتا، انوشہ کال کرتی تو کاٹ دیتا، وہ حیران ہو رہی تھی اس کے رویے پر، شاید وہ اس سے ناراض ہو مگر کیوں؟

وہ اپنے رویے پر نظر ثانی کر رہی تھی، شاید اس سے کہیں کوئی غلطی ہو گئی ہو، مگر ایسا کہاں ہوتا تھا؟ وہ دوست تھے، ایسی غلطیاں کوئی معانی نہیں رکھتی تھیں، مگر میکال کی طرف سے لاپرواہی تھی کہ ہنوز برقرار، ہاں ایک بات کا اضافہ ضرور ہوا تھا اس لاپرواہی میں، وہ اب بالکل بھی اس سے نہیں ملتا تھا۔ وہ بے حد حیران تھی، بہت پریشان، وہ اپنی کزنز اور مشترکہ دوستوں سے بھی کچھ نہیں ڈسکس کر رہی تھی۔

ان دونوں کی ذہنی ہم آہنگی کا تو ایک زمانے میں چرچا تھا۔ پھر ان کے درمیان ایسی کسی صورتحال کا پیدا ہونا۔

وہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوئے جاتی۔ پھر خود کو پرسکون کرنے کے لیے صرف آنکھیں موند لیتی۔

''ضرور کوئی مسئلہ ہے مجھے میکال سے ضرور ملنا چاہئے، ہوسکتا ہے اسے کسی اور حوالے سے کوئی ٹینشن لاحق ہو؟ وہ اس سے شیئر نہ کر پا رہا ہو''۔

مگر وہ تو سب شیئر کرتے تھے پھر؟

وہ پھر سے روہانسی ہو جاتی۔ اس نے سوشل ویب سائٹس اور اس کے موبائل پر بے تحاشا پیغامات چھوڑے ہوئے تھے مگر جواب ندارد۔

''میکال ایسا کیوں کر رہا ہے؟''

''وہ آخر ٹھیک تو ہے، خیریت سے؟''

''مجھے یقیناً انکل، آنٹی سے اس حوالے سے بات کرنا ہوگی، کیا خبر انہیں اس کی سرگرمیوں کا پتہ ہو''۔

وہ ایسی باتوں کو سوچتی ہوئی آنٹی کے سامنے بیٹھی تھی۔

"آنٹی! میکال کم کم نظر آتا ہے، کہاں ہوتا ہے وہ؟" وہ سرسری سے انداز میں پوچھنے لگی۔ پہلے تو اس کے نہ ملنے کی وجہ ہر کوئی انوشہ سے پوچھا کرتا تھا مگر آج...

اف... یہ دن بھی دکھانا تھا قسمت نے، اس نے پانیوں سے بھری آنکھوں کو جھکانا مناسب سمجھا۔

"یہ انوشہ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ میکال کے علاوہ انوشہ کو ہی اس کے ہر ہر عمل کی خبر ہوتی ہے"۔ وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہنے لگیں۔

"جی"۔ وہ قصداً مسکرائی پھر گویا ہوئی۔

"مگر کچھ دنوں سے میرا اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا"۔

"اچھا... وہ تو سارا دن گھر میں نہیں ہوتا، میں تو اس لئے انجان رہی کہ ایسا کون سا پہلی دفعہ ہو رہا ہے، وہ میچور ہے، اور آپ فرینڈز تو ویسے بھی اکثر گھر سے باہر ہی پائے جاتے رہے ہو، ہوسکتا ہے دوستوں کے ساتھ ہو"۔ آنٹی کہہ کر اٹھ گئیں۔ انہیں پارٹی میں جانا تھا۔

انوشہ کا دل بے تحاشا رونے کو چاہا تھا، کن دوستوں کے ساتھ؟

انوشہ سے زیادہ بہترین اس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ ان کے مشترکہ دوست؟ وہ ان کے پاس بھی نہیں ہوتا۔ کوئی نیا دوست؟

مگر وہ اتنا اہم کیسے کہ انوشہ کہیں پیچھے چلی جائے۔ وہ کمرے میں بند ہو کر روتی رہی۔

دل میں میکال کے حوالے سے بہت سی فکریں تھیں۔

"اللہ کرے وہ خیریت سے ہو"۔

اور پھر اس کی میکال سے ملنے کی دعائیں رنگ لے ہی آئیں۔

وہ اسے دیکھ چکی تھی، وہ ٹیرس پر کھڑی تھی میکال اپنے گھر کے گیٹ پر تھا۔ انوشہ نے بے اختیار ہاتھ ہلایا تھا اور وہ رک گیا۔ انوشہ دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اس تک پہنچی تھی۔

"میکال! کہاں تھے تم، میں اتنی ٹینشن میں تھی۔ اتنے دن، اف... مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی۔ تم بتا بھی کچھ نہیں رہے تھے، کال کاٹ دیتے، رپلائی نہیں کرتے، سب خیریت تو ہے ناں؟" وہ بے اختیار اس کا بازو تھامے بولتی چلی گئی۔

"ہوں... سب خیریت ہے"۔ وہ نارمل سے انداز میں بولا۔

"پھر..."

"کیا پھر؟"

"پھر رابطہ کیوں نہیں کر رہے تھے؟"

"ایسے ہی، میرا دل نہیں تھا رابطہ کرنے کو"۔

"میکال! پلیز تنگ نہ کرو۔ سچ سچ بات بتاؤ"۔ وہ زچ ہوئی۔

"تم پلیز مجھے تنگ نہ کرنا، میں قصداً تمہیں نظر انداز کر رہا تھا"۔ وہ کہہ کر آگے بڑھنے لگا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوئی۔

"دل کیا"۔ آرام سے جواب آیا۔

"تم پلیز مجھے تنگ نہ کرو"۔ وہ باقاعدہ منت کرنے لگی۔

"میں سیریس ہوں انوشہ"۔

"مگر کیوں؟"

"میری مرضی"۔

"کیا ہے تمہاری مرضی، بتاؤ پلیز"۔

"میں نہیں بتاؤں گا، مجھے آرام کرنے دو"۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ بھی پیچھے آئی۔

میکال اسے تنگ کر رہا تھا بس، وہ دونوں ایک دوسرے کے جذبات کی شدت سے آگاہ تھے، وہ کچھ بھی آگے تک نہیں سوچ پائی، سوائے اس بات کے کہ وہ اسے تنگ کر رہا ہے بس۔

جلد ہی اس کی پریشانی تشویش میں بدلنے لگی تھی۔

"میکال! پلیز تنگ نہ کرو"۔ وہ روہانسی ہو گئی۔

''انوشہ! تم مجھے مسلسل تنگ کر رہی ہو۔'' انوشہ نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''کیا ہے تمہیں؟ پرابلم کیا ہے؟'' وہ زچ ہوگئی۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے مسلسل پریشان رہی تھی اور اب میکال اسے دستیاب ہوا تھا تو اس کا رویہ۔

''مجھے کوئی پرابلم نہیں، میرا دماغ چاٹنے کی ضرورت نہیں''۔ وہ سرد مہری سے بولا۔

''تمہیں کوئی پرابلم ہے، بتاؤ مجھے''۔ وہ اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولی۔

''نہیں ہے کوئی بھی''۔

''میکال! پلیز یار بتاؤ کیا ہوا؟'' وہ منت کرنے لگی۔ دل ڈوبا جا رہا تھا۔

''کچھ بھی ہو، تمہیں کیا؟'' قطعی لہجہ۔

''تم ناراض ہو؟''

''نہیں ہوں''۔

''پھر تمہارا رویہ کیوں چینج ہو گیا اچانک۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی، چلو شاید کوئی ہوئی ہو، آئی ایم سوری وہ کوئی بھی بات جو تمہارے اس بی ہیو کی وجہ ہے اس کے لیے سوری۔ پلیز مجھے مزید تنگ نہ کرو، سانس بند ہو رہی ہے'' وہ روہانسی ہوگئی۔

''میں تمہیں تنگ نہیں کر رہا، نہ مجھے کوئی پرابلم ہے، نہ تمہیں سوری کی ضرورت''۔ وہ کہہ کر واش روم میں گھس گیا۔

انوشہ اس کے باہر آنے کا انتظار کرتی رہی پھر اس بات کو کچھ مزید وقت پر ڈالتے ہوئے مڑ گئی۔

☆☆☆☆☆

میکال کا رویہ بدستور وہی تھا، انوشہ بیک وقت بہت سے نئے جذبات احساسات سے روشناس ہو رہی تھی، نظر اندازی، سب سے برا اور مار ڈالنے والا احساس نظر انداز ہی تو ہوتا ہے، وہ ان دنوں اس احساس کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

حیرت، صدمہ، تکلیف، پریشانی، سب احساسات اس کے لیے نئے تھے۔ وہ سوچتی رہتی کیسے سب ٹھیک ہو جائے۔ وہ جاننے کی کوشش کرتی کہ میکال کے اس رویہ کی وجہ کیا ہے، مگر کچھ حاصل نہ ہوتا۔

وہ اس دن ضبط گنوا بیٹھی جب وہ اسے دستیاب ہوا تو وہ رونے لگ گئی، ہچکیوں سمیت روتی رہی، وہ جان نہ پائی میکال اسے دیکھ کر کیا سوچ رہا ہے۔

''میکال! اگر تم ناراض نہیں تو پلیز ناراض ہو جاؤ، روٹھ جاؤ، خفا ہو جاؤ، میں تمہیں منا تو لوں، مگر ایسا رویہ تو نہ رکھو فار گاڈ سیک میکال''۔ وہ روتی رہی۔

''تم بتا تو دو ہوا کیا ہے، ٹھیک ہے اگر تم واقعی مجھے زچ کرنا چاہتے ہو تو کر لو، پلیز مجھ سے تعلق کیوں ختم کرنے پر تلے ہو''۔

''تم کہیں اور انٹرسٹڈ ہو گئے ہو؟''

''نہیں''۔

''پھر کیا وجہ ہے''۔

''میں بتانا ضروری نہیں سمجھتا''۔

اف اس کا قطعی لہجہ، کاش... وہ مر جائے۔ عجیب سی حسرت پیدا ہوئی تھی۔

''تم کیوں کر رہے ہو ایسا؟'' وہ خود کلامی کرنے لگی پھر وہ واپس پلٹی۔

ان کے درمیان بہت انڈر اسٹینڈنگ تھی، بہت دوستی، ان کا اسٹیٹس بھی ایک جیسا تھا، ان کی لو اسٹوری میں دور تک کسی ولن کا نشان نہیں تھا مگر پھر کیا ہوا؟

یہ کوئی نہیں جانتا، میکال کا رویہ کیوں بدلا؟

یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب نہ ہو۔

محبت اور بیوفائی میں ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔ محبت ''بے وجہ'' اگر ہو سکتی ہے تو بے وفائی کے لیے کسی وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

''تم بے وفا ہو'' وہ بڑبڑائی تھی۔

ایک ایسا رشتہ جس کا اختتام ہوا تھا کیونکہ بے وفائی بے وجہ ہو جاتی ہے۔

☆..........☆..........☆

شیریں تبسم

افسانہ

صدائے من

رات کافی ڈھل چکی تھی، ہر طرف اندھیرے کا راج تھا، مگر وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ جب رات کی تاریکی اپنی آخری حد پر پہنچتی ہے تب ہی اجلی نکھری صبح کا آغاز ہوتا ہے۔ اللہ پر اعتماد اسی صبح کی



طرح ہوتا ہے جس سے پہلے رات کالی سیاہ چادر اوڑھے ہوتی ہے۔

''اللہ ھوا کبر...''

''اللہ ھوا کبر...''

درختوں پر بیٹھی ہوئی چڑیوں کی چہچہاہٹ، ٹھنڈی ملائم ہوائیں اور اذان کے کلمات کے ساتھ صبح کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ آواز اس محلے کی جامع مسجد کے امام صاحب حسن مصطفیٰ کی تھی۔ اذان تو موذن صاحب ہی دیتے تھے مگر کبھی کبھار امام صاحب کی بھی آواز گونجتی تھی۔

نماز اور قرآن پاک کی تلاوت کے بعد ناشتے سے فارغ ہو کر حب علی کالج جانے کے لئے تیار کھڑا تھا اور کالج بیگ اٹھا رہا تھا تب امام صاحب نے اسے پکارا۔

''سنو بیٹا!''

''جی ابو جی''۔ حب علی نے بیگ کو بائیں کندھے پر لٹکایا۔

''بیٹا! کالج سے واپسی پر میرے ساتھ اسٹور چلنا، مجھے کچھ سامان خریدنا ہے''۔ امام صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔



''اچھا ٹھیک ہے ابو جی! اگر ظہر کے بعد چلیں گے کیونکہ پھر مجھے بیٹھ کر اپنا اسائنمنٹ بھی مکمل کرنا ہے آج''۔ حب علی نے وجہ بتائی۔

''اچھا بچے''۔ امام صاحب نے اپنے سدا بہار نرم لہجے میں اس کی بات کی تائید کی اور اسے کالج کے لئے رخصت کیا۔

امام صاحب کو اپنے ذاتی کاموں کے لئے دوسروں کو تکلیف دینا اچھا نہیں لگتا تھا، اس لئے وقت ملنے پر خود ہی یا کبھی اپنے بیٹے حب علی کے ساتھ اسٹور چلے جاتے تھے اور سامان خرید لاتے۔

حب علی سیکنڈ ایر کا اسٹوڈنٹ تھا، نماز روزے کا پابند، بہت خوش اخلاق، بالکل امام صاحب کی طرح۔ حب علی کی امی اتنا فرمانبردار اور نیک بیٹا پا کر ہر وقت اللہ کا شکر ادا کرتیں اور اس کو نظر بد سے بچانے کے لئے ہر وقت کچھ سورتیں پڑھ کر اس پر دم کرتی رہتیں۔ اکلوتا بیٹا تھا، ماں باپ دونوں کی آنکھ کا تارا اور اوپر سے اس کی پرورش اتنے اچھے ماحول میں ہو رہی تھی، امی جی معلمہ اور ابو جی امام مسجد۔

''ابو جی! انٹر کے بعد سے میں بھی اذان دیا کروں گا''۔ اس نے لہجے میں زمانے بھر کی معصومیت سموتے ہوئے کہا۔

''ارے انٹر کے بعد کیوں بھلا؟ انٹر سے پہلے کیوں نہیں''۔ امام صاحب پچھلے کئی دنوں سے یہی جملہ اس کے سامنے دہراتے تھے اب بھی وہ یہ بول کر اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے زاویئے کو دیکھ کر لطف اندوز ہو رہے تھے۔

جواب میں حب علی سر کھجا کر رہ گیا۔ کیونکہ یہ بات تو امام صاحب کی بھی ٹھیک تھی۔ وہ اتنی اچھی قرأت کرتا تھا اسکول سے لے کر کالج تک کئی انعامات جیت کر آیا تھا۔ کئی بار ابو جی کو اذان بھی سنا چکا تھا اور امام صاحب نے اس سے فرمائش بھی کی تھی کہ اب وہ اذان دیا کرے مگر اس کی سوئی انٹر کے بعد یہ کروں گا، انٹر کے بعد وہ کروں گا پر ہی اٹک گئی تھی اور کالج کی لائف ہوتی بھی تو کتنی پرسکون ہے ناں! نہ کوئی فکر، نہ ٹینشن، ساری فکریں تو اسی کالج لائف کے بعد سے ہی شروع ہوتی ہیں اور ذمہ داریاں بھی۔

یہ ان دونوں کی اسٹور سے باہر کی گئی گفتگو تھی۔ اب سامان کا تھیلا بائیک پر رکھ کر انہوں نے گھر کی راہ لی۔

دن گزرتے گئے، امتحانات سر پر آ گئے، امتحانات ہو گئے تو پھر رزلٹ کا انتظار اور حب علی کی وہی رٹ کہ ''اذان میں انٹر کا رزلٹ آنے کے بعد دوں گا، ابھی میں چھوٹا ہوں''۔

وہ اتنی معصومیت سے کہتا کہ امام صاحب کو اس پر بے تحاشا پیار آتا تھا۔

دراصل حب علی اذان دینے کو بہت بڑی ذمہ داری سمجھتا تھا اور خود کو اس بڑی ذمہ داری کے سامنے بہت چھوٹا تصور کرتا تھا۔

ہر جمعرات کو مسجد کے احاطے میں بنے مدرسے میں وہ ناظرہ سیکشن کے بچوں کو درس دیتا تھا۔ وضو کے طریقے سکھاتا تھا، ناظم صاحب نے خاص اس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ ہر جمعرات کو مدرسے میں بچوں کو درس دیا کرے گا۔ نعتیں پڑھنا، قرأت سکھانا، وضو کا طریقہ سکھانا، نماز سکھانا، یہ کام وہ اپنی خوشی سے کرتا تھا اور یہ سب کرتے ہوئے اسے راحت ملتی تھی مگر سارے لاڈ پیار وہ امی جی اور ابو جی کے سامنے دکھاتا تھا مگر مسجد کے اور دیگر امور میں بالکل ایک ذمہ دار شخص کی طرح سارے کام انجام دیتا تھا۔

☆.........☆.........☆

جب انٹر کا رزلٹ آیا سب کتنا خوش تھے۔ پھر

شام کو امام صاحب حب علی کو اس کا گفٹ دلانے اسی اسٹور پر گئے۔ یہ ان کے علاقے سے تھوڑا دور ایک سپر اسٹور تھا۔ یہاں سے راشن، گفٹ، برتن، ضرورت کی ہر چیز ملتی تھی۔ حب علی اپنا من پسند گفٹ پا کر بہت خوش تھا اور امام صاحب کو اس بات کی خوشی تھی کہ آج حب علی کی اذان کی آواز فضاؤں میں گونجے گی۔

وہ دونوں اسٹور سے باہر بائیک پر بیٹھ کر بس ابھی تھوڑا ہی دور گئے تھے کہ ایک نقاب پوش نے بندوق دکھا کر ان کا راستہ روک لیا اور اگلے ہی لمحے ان سے بائیک چھیننی چاہی اور دوسرا نقاب پوش اسی گلی کے نکڑ پر کھڑا اسے جلدی جلدی کا اشارہ کر رہا تھا۔ دونوں نقاب پوش گھبرائے ہوئے سے لگ رہے تھے۔ اس نقاب پوش کی بندوق کا رخ حب علی کی طرف تھا امام صاحب اور حب علی دونوں اس اچانک صورتحال پر بوکھلا گئے تھے۔ بیٹے کی محبت کے آگے امام صاحب بائیک سے اتر آئے اور حب علی کو بھی اترنے کا اشارہ کیا۔ اگر وہ اکیلے ہوتے تو کبھی بندوق کے ڈر سے بائیک ان لٹیروں کے حوالے نہ کرتے۔

اچانک گلی کے کنارے کھڑا اس کا ساتھی بھاگ کر دوسری طرف جانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا، اُس کی اس حرکت پر ان دونوں کے پاس کھڑا نقاب پوش مزید گھبرا گیا کیونکہ وہاں سے اس کا اکیلا بھاگ جانا اس پلان میں تو شامل ہی نہیں تھا۔ وہ اسی گھبراہٹ کے عالم میں ان دونوں پر بندوق تانے روڈ ہی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ ابھی اس کا ساتھی آئے گا مگر اس کی گھبراہٹ مزید بڑھ گئی جب پیچھے سے اسے انسپکٹر اکرم نے گردن سے دبوچا تھا۔

''لگتا ہے اس علاقے میں نئے آئے ہو؟''

انسپکٹر اکرم نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھینتے ہوئے اس کے حلیے کا جائزہ لیا۔ وہ نقاب پوش کانپنے لگا۔ نظریں اس کی بار بار سڑک کی جانب اٹھتیں اور ناکام پلٹ آتیں۔

''السلام علیکم امام صاحب!'' انسپکٹر اکرم نے سعادت مندی سے سلام کیا۔

''آپ فکر نہ کریں آرام سے گھر جائیں، اس سے تو ہم نمٹ لیں گے''۔ انسپکٹر اکرم نے امام صاحب کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا۔ وہ ان کو جانتا تھا اور ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اکثر وقت نکال کر ان کے درس اور خطبے میں شریک ہوتا تھا۔

اسی لمحے روڈ سے ایک پولیس کی گاڑی نمودار ہوتی اسی سمت چلتی ہوئی ان کے قریب آئی۔

''ڈالو اسے بھی''۔ انسپکٹر اکرم نے اپنے مخصوص کڑک دار لہجے میں گاڑی میں بیٹھے اپنے ساتھی افسر سے کہا۔ اس گاڑی میں اس نقاب پوش کا وہ ساتھی بھی بیٹھا تھا جو دراصل پولیس کی گاڑی کو دیکھ کر بھاگ گیا تھا، مگر قانون کے ہاتھ تو لمبے ہوتے ہیں سو وہ اور اس کا ساتھی پکڑے گئے۔

''اللہ اکبر...''

''اللہ اکبر...''

عشاء کے وقت مسجد سے اذان کی صدا بلند ہو رہی تھی مگر اب کی بار آواز نہ موذن صاحب کی تھی نہ امام صاحب کی بلکہ حب علی کی تھی اور اس کی پہلی اذان میں ایک خاص جذبہ تھا، احساس تشکر تھا، وہ آج ایک آفت سے صحیح سلامت بنا جان و مال کے نقصان کے بچ آیا تھا اور یہی سچ ہے اللہ بے شک بہت بڑا ہے۔ بس اس کو پکارنے کے لئے نیت میں سچائی اور بھروسہ شامل ہونا چاہئے اور اب وہی سچائی اور بھروسہ اس کی آواز میں رچ بس گیا تھا اور اس کے من کی صدا بن گیا تھا۔

☆............☆............☆

افسانہ

ایک تھی عنفاف

یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کے دور میں بھی سنڈریلا جیسی کہانیاں موجود ہیں۔ عنفاف ایک حقیقی کردار ہے تھوڑی سی ردوبدل کے ساتھ میں نے یہ کہانی لائف بوائے شیمپو کے حوالے سے تحریر کی ہے۔ اس کو پڑھیے



اور سندیسہ منر در لگ گئے۔

☆☆

ایک عفاف تھی۔ ۔اس کا خواب تھا کہ وہ کسی خوب صورت شہزادے سے شادی کرے۔

لیکن اس کی سوتیلی ماں بہت زیادہ ظالم تھی اور عفاف کو بہت زیادہ ظلم اور تکلیفیں دیا کرتی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ عفاف کا باپ مرتے وقت ساری دولت عفاف کے نام کر گیا تھا۔ عفاف بہت زیادہ خوب صورت، ذہین اور ایماندار لڑکی تھی۔اس کا ایمان تھا کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ملتی ہے جب کہ اس کی سوتیلی بہن اس سے اس بات پر حسد کیا کرتی۔ دولت کے لالچ نے اس کی بہن اور ماں کو بہت زیادہ لالچی بنا دیا تھا۔ ہر وقت وہ اسی فکر میں رہتیں کہ کسی طرح عفاف کی دولت حاصل کر لی جائے۔اس بار بھی انہوں نے ایک پلان بنایا۔ گھر سے پروگرام بنا کر دوسرے شہر لاہور جانے کا۔ عفاف کو بھی اپنے ساتھ بڑی محبت سے لے کر چلیں اور کہا کہ خالہ کے گھر جا رہے ہیں۔ عفاف بے چاری ان کی باتوں میں آ گئی اور اپنا سامان جلدی جلدی پیک کر کے ٹرین کے ذریعے کراچی سے لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔



اسٹیشن قریب آنے پر اس کی سوتیلی ماں نے تھرماس میں سے چائے نکالی، عفاف کو دی اور خود بھی پینے لگی۔ چند لمحوں میں ہی عفاف گہری نیند سوگئی۔

ٹرین اسٹیشن پر رک گئی۔ عفاف کی سوتیلی ماں اور بہن، عفاف کو ٹرین میں سوتا چھوڑ کر اتر گئیں۔ کچھ دیر بعد ٹرین روانہ ہوگئی۔ جب عفاف کی آنکھ کھلی تو وہ رونے لگی اور لوگوں سے پوچھنے لگی۔ ''میری امی اور بہن کہاں گئیں اور یہ کون سا اسٹیشن ہے؟''

''بی بی اگلا اسٹیشن لاہور کا ہے آپ کی امی اور بہن بہت پہلے اتر گئیں۔ آپ بہت گہری نیند سو رہی تھیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ان کی بیٹی ہیں ورنہ میں آپ کو اٹھا دیتی۔'' ایک عورت بولی۔

وہ روئے جارہی تھی اور کوئی اس کی باتوں پر دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اسٹیشن آگیا وہ اپنا بیگ اٹھا کر نیچے اتر آئی۔ آنسو پونچھ کر اس نے اردگرد دیکھا اس کا اپنا کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ جونہی دو چار قدم وہ آگے بڑھی سامنے سے آتے ہوئے شخص سے وہ بری طرح ٹکرا گئی۔

''میم! آپ دیکھ کر چلیں کیا کررہی ہیں آپ؟'' وہ چونک کر بولا اور وہیں پر تھم سا گیا۔ وہ بغور عفاف کو دیکھ رہا تھا جب کہ عفاف کے آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔

''کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں؟ آپ رو کیوں رہی ہیں؟''

وہ بمشکل اسے اپنی روداد سنا سکی۔

''او کے آپ گھبرائیں نہیں، آپ اپنا کانٹیکٹ نمبر دیں۔''

''ہاں ہاں میں امی کا نمبر دیتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

تبھی سامنے کھڑے شخص نے اپنے سیل سے کال ملائی اور بولا۔ ''یہ تو آف جارہا ہے۔ آپ تھوڑی دیر یہاں بیٹھ کر ویٹ کریں میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''میں یہاں آپ کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتی ہوں؟'' وہ گھبرا کر بولی۔

''میم! آپ یہاں اکیلے ہی بیٹھیں میں کچھ فاصلے پر بیٹھ جاتا ہوں جب تک آپ اپنا نمبر ٹرائی کرتی رہیں۔'' اس نے اپنا سیل اسے تھما دیا۔

کافی دیر بعد بھی فون ریسیو نہیں ہوا تو بے بسی سے اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آگئے۔

''میم! آپ کا یہاں اس طرح سے بیٹھنا صحیح نہیں ہے۔ آپ اکیلی ہیں بہتر یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیں یا جہاں آپ کہیں میں آپ کو وہاں ڈراپ کردیتا ہوں۔''

''مجھے تو یہاں کا کچھ نہیں پتا میں تو امی کے ساتھ ان کی کزن کی بیٹی کی شادی میں آرہی تھی یہاں۔'' عفاف بولی۔

''بہتر یہ ہے کہ آپ چھ گھنٹے بعد کراچی جانے والی ٹرین سے واپس چلی جائیں میں آپ کے ٹکٹ کا بندوبست کردیتا ہوں۔''

''نہیں میں اکیلے نہیں جاسکتی۔''

''پلیز میم! اتنی دیر سے ہم ساتھ ہیں میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟'' تبھی اس نے آہستہ سے اپنا نام بتادیا۔

''مجھے شہریار کہتے ہیں۔'' وہ بھی جواباً اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

''پلیز اب آپ اس طرح سے روئیں مت لوگ مڑ مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے ساتھ گھر چلیں میری والدہ کی بار بار کال آرہی ہے۔ آپ چاہیں تو ان سے بات کرسکتی ہیں۔ آپ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ سفر کرسکیں اس وقت یہاں پر رک سکیں۔'' پھر اس نے اس کی بات اپنی والدہ سے کروادی اور پھر وہ اس کے ساتھ بیگ اٹھائے چل دی۔

شہریار کے گھر میں سبھی لوگ موجود تھے۔ سب اس کی بات سن کر اس سے ہمدردی کرنے لگے تھے۔ سب کو اس نے بتادیا تھا کہ اس کی والدہ سوتیلی ہیں اور وہ اسے ٹرین میں چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔

بار بار وہ یہی کہہ رہی تھی کہ ''مجھے کراچی پہنچا دیں۔''

شہریار کی امی بڑے راحت رساں لہجے میں بولیں۔

''دیکھو بیٹا! ہمارے بہت ہی قریبی رشتے دار کی شادی ہے۔ ہم دو چار دن تک کہیں نہیں جا سکتے اور میں کسی کے ساتھ تمہیں اکیلا نہیں بھیجوں گی۔''

''میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ میں آپ کو ہمیشہ کے لیے روک لوں۔'' تبھی شہریار کی بہن حوریہ بولی۔

''کوئی بات نہیں آپ ہمارے ساتھ ہمارے گھر کراچی چلیں۔'' عفاف بولی۔

''فی الحال تو آپ ہماری مہمان ہیں۔ اب آپ میری چھوٹی بہن بن کر ہمارے ساتھ رہیں۔'' شہریار کی بھابی بولیں۔ امی جان بھی بغور اسے دیکھ رہی تھیں۔

☆......☆

دوسرے دن کی بات ہے۔

''امی! لڑکی ہے تو بڑی پیاری یوں بھی شہریار کو کوئی لڑکی پسند نہیں آتی۔ آپ اس کے بارے میں شہریار سے پوچھیں اس کی کیا رائے ہے۔'' حوریہ نے کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو، کون ہے، کہاں سے آئی ہے، کون جانے۔ صرف شکل وصورت نہیں حسب و نسب بھی دیکھا جاتا ہے۔'' امی جان آہستہ سے حوریہ کو سمجھاتے ہوئے بولیں۔

''امی! آج ہم سب مہندی میں جا رہے ہیں اس کو بھی ہم لوگ لے کر جائیں گے۔ کیوں ناں اس کو کوئی اچھا سا ڈریس دلوا دیا جائے۔''

''کیوں نہیں بیٹا یہ تو نیکی ہے وہ تو ہماری مہمان ہے اور وہ پریشان بھی ہے اللہ نیکیوں کا صلہ نیکی سے ہی دیتا ہے۔ تم اس کی مدد کرو گی اللہ تمہارے لیے رستے بنائے گا۔''

پھر حوریہ گھمانے کے بہانے عفاف کو باہر لے گئی اور کہا۔ ''چلو تمہیں لاہور کی سیر کرواؤں۔''

''میں آج کی تقریب کے لیے ایک ڈریس لینا چاہتی ہوں کیا تم اس میں میری مدد کرو گی۔'' حوریہ بولی۔

''شیور کیوں نہیں۔'' عفاف بولی۔ پھر حوریہ نے ایک بوتیک سے ڈریس پسند کیا اور عفاف سے بولی۔

''کیسا لگ رہا ہے تمہیں یہ ڈریس۔''

''اچھا ہے مگر مجھے یہ پیرٹ گرین اچھا لگ رہا ہے۔'' اس نے بہت قیمتی سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔ شہریار رخ پھیر کر مسکرایا۔ حوریہ نے دیکھا اور پھر شہریار سے بولی۔

''کیوں بھائی جان! لے لوں یہ؟'' شہریار نے اثبات میں سر ہلایا تو انہوں نے وہ ڈریس لے لیا اور پھر گھر کی طرف لوٹ آئے۔

☆......☆

شام میں حوریہ نے اس سے پوچھا۔ ''ہم لوگ تو سب چلے جائیں گے مہندی میں تم یہاں اکیلے کیسے رہو گی۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔''

''لوگ کیا کہیں گے؟'' عفاف بولی۔

''کچھ نہیں آپ ہماری مہمان ہیں اور کیا کہیں گے لوگ۔''

''لیکن میرے کپڑے ٹھیک نہیں ہیں۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''تمہارا ڈریس تو یہ رہا۔'' وہ ہینگر میں پیرٹ گرین ڈریس لہراتے ہوئے بولی۔

''یہ تو تمہارا ہے۔'' عفاف نے حوریہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں امی نے آپ کے لیے یہ ڈریس منگوایا تھا۔''

''میرے لیے......!'' وہ حیرت سے حوریہ کو دیکھ رہی تھی۔

''ویسے بھی یہ تمہاری پسند ہے تمہارے لیے ہے اور یہ تم پر اچھا بھی لگے گا۔ عجیب اتفاق ہے بھائی کو بھی یہ رنگ بہت پسند ہے بائی دا وے تمہارا اسٹار کیا ہے؟'' حوریہ نے عفاف سے پوچھا۔

''لیو۔''

''او...... بھائی کا بھی لیو ہے۔'' حوریہ ہنس کر بولی۔ عفاف جھینپ گئی۔ تبھی شہریار روم میں آیا تھا۔ پیرٹ گرین ڈریس پر اس کی نظر رک گئی۔ اس نے مڑ کر

عفاف کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شوخ سی لہر عفاف کو نظر آئی وہ جھینپ کر رخ پھیر گئی اور پھر تیار ہونے کے لیے اس نے اپنا بیگ کھول کر اپنا شیمپو نکالا اور واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ جب وہ باہر آئی تو پورا کمرہ مہک رہا تھا۔

☆......☆

رات میں مہندی کی بڑی گہما گہمی تھی۔ عفاف پر وہ رنگ بہت سوٹ کر رہا تھا۔ شہریار نے ایک نظر چوری سے اسے دیکھا اور پھر رخ پھیر لیا۔ کچھ اس طرح سے کہ عفاف کو محسوس بھی نہ ہوا۔ سب تیار ہو کر جب ہال پہنچے سب بڑی گرمجوشی سے ملے۔ ہر کوئی اس کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ یہ کون ہے؟"

"یہ میری دوست ہے۔" حوریہ ہر ایک کو جواب دیتی رہی۔ سبھی نے یہ بات محسوس کی کہ شہریار بار بار کسی نہ کسی بہانے سے عفاف کے قریب چلا آتا۔ اس کے مہکتے ہوئے بال اسے بار بار اٹریکٹ کر رہے تھے۔

"عفاف! تم نے کون سا پرفیوم لگایا ہے۔" حوریہ پوچھنے لگی۔

"نہیں میں نے کوئی خوشبو نہیں لگائی۔" عفاف نے جواب دیا۔

"تمہارے بال بڑے شائن کر رہے ہیں جب تم آئیں تو رف لگ رہے تھے۔"

"میں تو بس "لائف بوائے شیمپو" استعمال کرتی ہوں۔" وہ عام سے لہجے میں بولی۔

"لیکن تمہارے بال تو بہت شائن کر رہے ہیں۔" بھابی نے بھی حوریہ کی بات کی تائید کی تو وہ ہنس پڑی۔

"امی...... امی سامنے والی ٹیبل پر دیکھیں عفاف بیٹھی ہے۔" سحرش بولی۔

"پاگل ہوگئی ہے اسے تو میں ٹرین میں چھوڑ کر آئی ہوں۔ وہ یہاں کہاں سے ہمارے رشتے داروں میں آجائے گی۔"

"سچ امی! وہ دیکھیں وہ بیٹھی ہے۔ اپنے پسندیدہ رنگ کے ڈریس میں۔"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئیں اتنا قیمتی ڈریس وہ کہاں سے لائے گی۔" انہوں نے جلدی سے اپنا چشمہ درست کر کے اس جانب دیکھا۔

"ارے ہاں یہ تو ہو بہو عفاف لگ رہی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی جڑواں بہن ہو۔ ورنہ وہ یہاں کہاں سے آجائے گی چلو چل کر پوچھتے ہیں کہ ماجرا کیا ہے۔"

"حوریہ ارد گرد نظر رکھو شہریار کے لیے کوئی لڑکی پسند آئے تو مجھے بھی دکھانا۔" شہریار نے ماں کی بات سنی تو اس نے مسکرا کر عفاف پر نظر ڈالی۔

"عفاف......!" اس کی سوتیلی ماں قریب آکر بولی۔

"امی آپ......!" عفاف گھبرا کر کھڑی ہوگئی۔

سبھی ایک دوسرے کو حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔ شہریار کی امی کے بھی عفاف کے والدین جاننے والے تھے۔

"ارے یہ ہماری عفاف ہے۔" شہریار کی امی نے اٹھ کر جھٹ عفاف کو سینے سے لگالیا۔

"سچ ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں میں سوچا کرتی تھی کہ وہ ننھی سی بچی اب کتنی بڑی ہوگئی ہوگی۔ میں تو اس کا نام تک بھول گئی تھی۔ آج اللہ نے ہمیں اچانک ملوا دیا۔ برسوں پہلے جب یہ پیدا ہوئی تھی تو میں نے اسپتال میں بھائی سے شہریار کے لیے اسے مانگ لیا تھا۔" عفاف کی سوتیلی ماں کا چہرہ اتر گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بول سکیں سحرش نے حسرت بھری نظر شہریار پر ڈالی۔

جب گھر واپسی کے لیے سب گاڑی میں بیٹھ رہے تھے تو شہریار دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر عفاف جب اندر بیٹھ رہی تھی تو شہریار آہستہ سے بولا۔

"عفاف! تم بہت ڈیفرنٹ ہو دوسروں سے۔"

"میں نہیں......" اس نے اپنے شانوں پر لہراتے خوشبو سے مہکتے بالوں کو جھٹکتے ہوئے بولا۔

"سارا کمال لائف بوائے شیمپو کا ہے جس نے آپ کو میرا دیوانہ بنا دیا۔" اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

☆......☆

فضائل قرآن

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

★ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن شریف کو سیکھے اور سکھائے۔

★ حق سبحانہ وتقدس کا یہ فرمان ہے کہ جس شخص کو قرآن شریف کی مشغولی کی وجہ سے ذکر کرنے اور دعائیں مانگنے کی فرصت نہیں ملتی، میں اس کو سب دعائیں مانگنے والوں سے زیادہ عطا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ شانہ کے کلام کو سب کاموں پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ خود حق تعالیٰ شانہ کو تمام مخلوق پر۔

★ حسد دو شخص کے سوا کسی پر جائز نہیں۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور دن رات اس میں مشغول رہتا ہے دوسرے وہ جس کو حق سبحانہ نے مال کی کثرت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو خرچ کرتا ہے۔

★ حق تعالیٰ شانہ اس کتاب یعنی قرآن پاک کی وجہ سے کتنے ہی لوگوں کو بلند مرتبہ عطا کرتا ہے اور کتنے ہی لوگوں کو پست، ذلیل کرتا ہے۔

★ قیامت کے دن صاحب قرآن سے کہا جائے گا کہ قرآن شریف پڑھتا جا اور بہشت کے درجوں پر چڑھتا جا۔ اور ٹھہر ٹھہر کر پڑھ جیسا کہ تو دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کرتا تھا۔ بس تیرا مرتبہ وہی ہے جہاں آخری آیت پر پہنچے۔

★ جو شخص ایک حرف کتاب اللہ کا پڑھے اس کے لئے اس حرف کے عوض ایک نیکی اور ایک نیکی کا اجر دس نیکی کے برابر ملتا ہے۔ میں نہیں کہتا کہ سارا (الم) ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف، لام ایک حرف، میم ایک حرف ہے۔

★ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے اسکے والدین کو قیامت کے دن ایک تاج پہنایا جائے گا جسکی روشنی آفتاب کی روشنی سے بھی زیادہ ہوگی اگر وہ آفتاب تمہارے گھر میں ہو۔ پس کیا گمان ہے تمہارا اس شخص کے متعلق جو خود عامل ہے۔

★ جس شخص نے قرآن پڑھا پھر اس کو حفظ یاد کیا اور اس کے حلال کو حلال جانا اور حرام کو حرام حق تعالیٰ شانہ اس کو جنت میں داخل فرمادیں گے اور اس کے گھرانے میں سے ایسے دس آدمیوں کے بارے میں اس کی شفاعت قبول فرمادیں گے جس کے لئے جہنم واجب ہو چکی ہو۔

★ جس شخص کے قلب میں قرآن شریف کا کوئی حصہ بھی محفوظ نہیں وہ بمنزل ویران گھر کے ہے۔

★ دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جیسا کہ لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگتا ہے پوچھا گیا کہ حضور ﷺ ان کی صفائی کی کیا صورت ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ موت کو اکثر یاد کرنا اور قرآن پاک کی تلاوت کرنا۔

★ تم لوگ اللہ جل شانہ کی طرف رجوع اور اس کے یہاں تقرب اس چیز سے بڑھ کر کسی اور چیز سے حاصل نہیں کر سکتے جو خود حق سبحانہ سے نکلی ہے یعنی کلام پاک۔

★ جو شخص ایک آیت کلام اللہ کی سنے اس کیلئے دو چند نیکی لکھی جاتی ہے اور جو تلاوت کرے اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگا۔

★ کلام اللہ کو آواز سے پڑھنے والا علانیہ صدقہ کرنے والے کے مشابہ ہے اور آہستہ پڑھنے والا خفیہ صدقہ کرنے والے کی مانند ہے۔

★ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک کلام پاک سے بڑھ کر کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا نہ کوئی نبی نہ فرشتہ وغیرہ۔

★ اگر تو صبح کو جا کر ایک آیت کلام اللہ شریف کی سیکھ لے تو نوافل کی سو 100 رکعات سے افضل ہے اور اگر ایک باب علم کا سیکھ لے خواہ اس وقت وہ معمول بہ ہو یا نہ ہو تو ہزار رکعات نفل پڑھنے سے بہتر ہے۔

★ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو اطلاع دی کہ بہت سے فتنے ظاہر ہوں گے۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ ان سے خلاصی کی کیا صورت ہے انہوں نے کہا کہ قرآن شریف۔

ماریہ عمران

افسانہ



وہ ایک چھوٹے علاقے سے ڈیفنس کے انتہائی خوبصورت اور وسیع بنگلے میں ٹیوشن پڑھانے آیا کرتی تھی، یہ ٹیوشن اسے اخبار میں چھپنے والے ایک اشتہار کے توسط سے ملا تھا، وہ صبح اسکول میں جاب کرتی تھی، اور شام میں یہاں ٹیوشن پڑھانے آجایا کرتی تھی، جتنی تنخواہ اس کو اسکول میں ملا کرتی تھی اس سے زیادہ وہ ڈیفنس کے اس ٹیوشن سے کماتی تھی، وہ خود کو خوش قسمت گردان رہی تھی کہ اتنا اچھا اور پارٹ ٹائم اسے جاب مل گیا تھا۔ وہ سوفٹ روڈ کے ایک چھوٹے سے مکان میں اپنی ماں اور تین چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ زندگی کے ایسے کسمپرسی کے اتار چڑھاؤ سے گزر رہی تھی جب باپ یا بڑے بھائی کا سایہ رحمت خداوندی سے کم نہیں ہوتا، ایسے میں وہ خود ایک بڑے بیٹے اور باپ کا فرض بخوبی نبھا رہی تھی، اچھے وقتوں میں اس کی لی گئی ماسٹرز کی ڈگری آج اس کے لئے بے انتہا کارآمد ثابت ہو رہی تھی، وہ بے تحاشہ پڑھنے کی شوقین تھی، بچپن میں باپ کا سایہ اٹھ جانے کے بعد ماں نے جتنا ممکن ہوا کچھ نہ کچھ کرکے اسے انگلش میں ماسٹرز کروایا تھا، اچھی تعلیم نے جہاں اس کے مزاج میں تبدیلی پیدا کی تھی، وہیں وہ اس حد تک مہذب ہوگئی تھی کہ ہر کوئی اپنے بچوں کو اس کی مثالیں دیا کرتا تھا، وہ انتیس سال کی دبلی پتلی گندمی رنگت کی ایک عام سی مگر جاذب نظر لڑکی تھی۔ اگر پیسے کی ریل پیل ہوتی تو شاید وہ بھی خود کو انتہائی بنا سنوار کے رکھتی۔ ذمہ داریوں اور حالات نے کبھی موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اپنے اوپر توجہ دیتی، شروع میں ماں نے شادی پر زور دیا، تو اس کے سختی سے انکار کے بعد شادی کا ذکر ہی ختم ہو گیا، ماں بھی بیمار تھیں اس پر اسکول جاتے بہن بھائی، ایسے میں وقت کی دھول نے اسے وقت سے پہلے ہی حد درجہ سنجیدہ اور میچور کر دیا، اب اس کی زندگی کا مقصد صرف کمانا تھا اور اپنے بہن بھائیوں کی قابل تحسین پرورش کرنا تھا، اس کی امی پورے محلے میں ثمینہ باجی کے نام سے مشہور تھیں، وہ بہت سالوں سے درزن کا کام کرتی تھیں، کپڑے تو اتنے خوشنما سیتی تھیں کہ ڈیفنس کی کئی خواتین کم سلائی کے چکر میں ان کے پاس آتی تھیں، باقی دو بہنیں اور تھیں جو نویں اور دسویں کی طالبہ تھیں اور ایک چھوٹا بھائی حسن جو چھٹی کلاس میں زیر تعلیم تھا۔ یہ کنبہ اس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا، وہ ہر ممکنہ محنت کرتی تھی تاکہ گھر کا خرچ خوش اسلوبی سے چل سکے، اس کے باوجود مہینے کے آخر میں ادھار کی نوبت آجاتی تھی، گھر کا کرایہ، فیسیں، بل، راشن اور دیگر مسئلے مسائل ان سب سے نمٹنا آسان نہ تھا، ایسے میں اتنی اچھی ٹیوشن کا ملنا ایک خوش قسمتی ہی تو تھی، وہ پہلے گھر میں ٹیوشن پر پڑھاتی تھی مگر دوستوں کے مشورے سے اس نے تگ و دو شروع کردی تھی کہ ڈیفنس میں کہیں ٹیوشن مل جائے، اور تھوڑی سی محنت کے بعد وہ



کامیاب بھی ہو گئی تھی۔

☆......☆

اسے دو دن ہوئے تھے اس بنگلے پر آتے ہوئے، پرائمری کلاسز کے دو بچوں کو کم سے کم دو گھنٹے ٹیوشن دینا ہوتی تھی، وہ دونوں جڑواں بھائی تھے، مگر صورت ایک دوسرے سے مختلف تھی، ان دونوں بچوں کی پھپھو نے اسے ہائر کیا تھا، نہ پھپھو نے زیادہ بات کی نہ بیٹھی بس بچے حوالے کئے اور اس کے بعد نظر نہ آئی، وہ خود ہی دو دن سے آ رہی تھی، وسیع و عریض ڈرائنگ روم میں بچے کتابیں کھولے موجود ہوتے اور وہ بڑی دلچسپی اور محنت کے ساتھ ان میں مشغول ہو جاتی آج بھی وہ ذیلی دروازے سے لان عبور کر کے اندر آئی تو بچے ہمیشہ کی طرح ٹیبل پر کتابیں پھیلائے پڑھنے میں مصروف تھے، انہوں نے اسے آتے دیکھتے ہی بیک وقت کہا۔

''ہیلو آنٹی! گڈ ایوننگ''۔

''گڈ ایوننگ گڈز!...... کیسے ہو آپ دونوں؟'' وہ مسکراتے ہوئے جواب دیتی کرسی پر بیٹھ گئی۔

''وی آر فائن، آنٹی! ہم نے سارا ہوم ورک کمپلیٹ کر لیا آپ پلیز چیک کر لیں''۔

''ویری گڈ بہت اچھا کام کیا ہے آپ دونوں نے تو۔'' اس نے مسکرا کر دونوں کو سراہا۔

''اچھا علی اور شافع آپ دونوں میتھس کی بک نکالو، آج ہم کچھ سمز کریں گے جو کہ بہت امپورٹنٹ ہیں۔''

''اوکے آنٹی!'' وہ فوراً اپنے بیگ پر جھک گئے، بہت ہی خوبصورت اور معصوم بچے تھے وہ، جب سے وہ ان سے ملی تھی ان پر بہت پیار آتا تھا، نہ ان کی ماں کا پتہ تھا نہ باپ کا، نہ کبھی اس نے پوچھنے کی ہمت کی، لیکن آج اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

''علی، شافع، چلو ایک بات بتاؤ مجھے جلدی سے، آپ دونوں کی مما کہاں ہیں؟ کیا وہ مجھ سے نہیں ملیں گی؟'' وہ بچے جواب دینے کے لئے لب ٹٹولنے لگے، اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس عالیشان بنگلے کی دیواروں میں کئی راز چھپے ہوئے ہیں، اسے بچوں سے نہیں پوچھنا چاہئے تھا وہ خود شرمندہ ہو گئی، ابھی علی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ پیچھے سے بھاری اور گرجدار آواز سنائی دی۔

''دیکھئے مس! آپ صرف اور صرف بچوں سے اسٹڈیز کو لے کر کنسرن رکھئے، پرسنل سوالات یا پرسنل ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، آپ کو یہاں پڑھانے کے لئے ہائر کیا گیا ہے، آپ کو کوئی بھی کام ہو آپ یہاں کسی بھی سرونٹ کو بتا سکتی ہیں، بچوں سے آئندہ کسی بھی قسم کے سوالات کرنے سے گریز کیجئے گا''۔ وہ اچانک مردانہ آواز سن کر گھبراہٹ میں کھڑی ہو گئی تھی، بولنے والا ایک لمبا چوڑا سونڈ بونڈ خوبصورت ترین آدمی تھا، وہ اب عین اس کے مقابل کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

''اوہ سوری، آئی ایم سو سوری سر! میں ہمیشہ اس بات کا خیال رکھوں گی۔'' وہ انگلیاں دباتی ہوئی بولی۔

''اوکے مجھے آپ سے یہی امید ہے''۔

''ہیلو بابا!'' علی شافع خوشی سے اچھلتے ہوئے اس سے لپٹ گئے، آج پہلی بار وہ ان دونوں بچوں کو اتنا خوش دیکھ رہی تھی۔

''ہیلو بیٹے! میرے بچے، میری جان۔'' اس نے دونوں بچوں کو گلے سے لگا کر چوم لیا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے بابا کہیں سے بہت دنوں بعد آئے ہیں، تبھی اتنا جوش و خروش نظر آ رہا تھا۔

''بابا! اتنے دن کر دیئے آپ نے آنے میں۔'' ہم تو بہت اکیلے ہو گئے تھے، پرامس کہ اب آپ ہمیں چھوڑ کر کبھی نہیں جائیں گے، ہم بالکل بھی خوش نہیں تھے یہاں، پھپھو بھی چلی جاتی ہیں انکل کے ساتھ ڈیلی، اور ہم یہاں بور ہو جاتے ہیں، مما بھی چلی گئیں ہمیں چھوڑ کر، سب کی مما ہوتی ہیں ہماری تو

مما بھی نہیں ہیں''۔ وہ دونوں مسلسل سسکیوں میں لگ گئے۔

''اچھا، اچھا پرامس! میں کبھی نہیں جاؤں گا آپ کو چھوڑ کے، پر آپ دونوں کو میں نے پرامس دیا تھا نا کہ کبھی بھی مما کی بات نہیں کرو گے، میں ہی آپ کی مما بھی ہوں اور بابا بھی، اب بابا کو بھی کبھی کام سے جانا بھی پڑتا ہے نا، اب میرے بہادر بچے نہیں سمجھیں گے تو کون سمجھے گا، اور ابھی ساری باتوں کو چھوڑو، آپ کی مس کھڑی ہیں پہلے پڑھائی کرو پھر خوب باتیں کریں گے اوکے''۔ انہوں نے پیار سے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کن آنکھوں سے سامنے نظریں جھکائے کھڑی اس کی طرف دیکھا، جو بہ غور ساری باتیں سن رہی تھی مگر انجان بنی نظریں جھکائے پین سے کھیل رہی تھی، اتنی باتیں سننے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ علی اور شافع کس مشکل کے دور سے گزر رہے ہیں، اسے بے انتہا دلی ہمدردی بچوں سے محسوس ہونے لگی، یقیناً ان بچوں کی ماں ان کے ہمراہ نہیں تھی، تبھی اس گھر میں اتنا سناٹا اور خاموشی کا بسیرا رہتا تھا، بچے بالکل مشینی انداز میں زندگی گزارتے نظر آتے تھے، وہ معصوم سے بچے انتہائی محبت اور شفقت کے متمنی تھے، وہ دل سے ان دونوں کے لئے ہمدردی محسوس کرنے لگی، ان کے بابا کے جانے کے بعد وہ پھر ان کو پڑھانے میں مصروف ہو گئی، اب بھی کئی سوالات اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے جن کو جاننے کے لئے وہ بے تاب تھی۔

☆......☆

آج خلاف معمول کچھ چہل پہل تھی، ورنہ اس بنگلے میں سناٹے کا عالم چھایا رہتا تھا، وہ شام پانچ بجے ہمیشہ پہنچتی تھی، آج تھوڑا لیٹ ہوئی تو جلدی جلدی اندر داخل ہوئی، دائیں بائیں خوبصورت سالان تھا، اور بیچ میں ایک پیسج اور کار پورچ، وہ تیزی سے پرس سنبھالے آگے بڑھی کہ بری طرح کسی سے ٹکرائی، سامنے جو کوئی تھا وہ بہت جلدی میں تھا تبھی زبردست ٹکر ہوئی۔

''اوہ سوری، میں دیکھ نہیں سکی''۔ وہ فوراً دوپٹہ سنبھالتی ہچکچاتے ہوئے معذرت کرنے لگی، سامنے کھڑے فیصل سلیم کے چہرے پر ابھرتے برہمی کے تاثرات نے اسے اور کنفیوژ کر دیا۔

''مس سحرش! آپ اتنا اندھا دھن کیوں سارے کام کرتی ہیں، میں اکثر نوٹ کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہیں، وہ دیکھئے، اتفاق سے میرے کمرے کی کھڑکی اسی سمت کھلتی ہے اور میں اکثر آپ کو جلدی میں ہی دیکھتا ہوں''۔ فیصل سلیم نے اپنی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا، اس کی بے ساختہ نظر اوپر گئی، وہ اتنے سالوں سے جاب کر رہی تھی مگر جب بھی فیصل سلیم سے سامنا ہوتا، اس کی بارعب اور حسین شخصیت کے سامنے وہ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہو جاتی تھی، فیصل سلیم کا اسٹائل، آواز، رعب اور سنجیدہ مزاج یہ تمام خصوصیات وہ ابھی تک اخذ کر پائی تھی، اسے ہمیشہ اپنا آپ انتہائی کمتر محسوس ہونے لگتا تھا، ابھی بھی وہ سوائے اسے تکنے کے کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی، تبھی انہوں نے چٹکی بجا کر اپنی طرف متوجہ کیا، اس نے چونکتے ہوئے جواب دیا۔

''جہ......جی......سوری، بس وہ آج لیٹ ہو گئی تبھی جلدی میں تھی، پر میں آئندہ خیال رکھوں گی''۔ وہ سرعت کے ساتھ سر پر دوپٹہ صحیح کرتی اندر بڑھ گئی، فیصل سلیم اسے جاتا دیکھ کر خود بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

وہ لاؤنج میں سے گزر کر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنے لگی وہاں سے کسی خاتون کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی، اس نے اندر موجود ایک ضعیف انتہائی باوقار خاتون کو وہیل چیئر پر بیٹھے علی

اور شافع کے ساتھ کھیلنے پایا۔ آج اتنے دنوں میں پہلی بار کوئی اسے نظر آیا تھا، جن کے دم سے خوب رونق ہورہی تھی، اس نے آگے بڑھ کر فوراً سلام کیا۔

"السلام علیکم آنٹی جی!"

"وعلیکم السلام! جیتی رہیے۔ بیٹے جی آپ ہی کا انتظار ہورہا تھا، آپ تھوڑا لیٹ ہوگئیں تو ہم اپنے پوتوں کے ساتھ کھیل میں لگ گئے، جاؤ بچوں اسٹڈیز اسٹارٹ کرو"۔ انہوں نے بچوں کو فوراً پڑھنے کے لئے کہا، وہ مسلسل سحرش کو بغور اوپر سے نیچے تک دیکھ رہی تھیں، چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ اس بات کی عکاسی کررہی تھی کہ وہ خاتون بہت کچھ کہنا چاہ رہی تھیں۔

"بھئی میں تو ہوں ان دونوں شیطان کی دادی، آج صبح ہی میں آسٹریلیا سے واپس آئی ہوں، اور ابھی پتہ چلا کہ ماشاء اللہ ایک ماہ سے آپ میرے پوتوں کو پڑھانے آرہی ہیں، یہ بچے تو بس سارا دن آپ کے گن گاتے رہتے ہیں، آپ کی محبت نے تو لگتا ہے جادو کردیا ان بچوں پر"۔ وہ آٹومیٹک وہیل چیئر پر قریب آکر بولیں، ان کا انداز نہایت شفقت بھرا تھا، وہ بہت باتونی نظر آرہی تھیں۔

"بس آنٹی! اللہ کا احسان ہے مجھ پر کہ اس نے میری خامیوں کو بس پردہ رکھا ہوا ہے، ورنہ ہم گنہگار کس لائق ہیں، اور رہا سوال ان بچوں کا تو یہ ہیں ہی محبت کے مستحق"۔

"بہت خوب کہا تم نے، یہ بچے بہت معصوم ہیں، نہیں جانتے کہ کس مقام پر موجود ہیں، اس عمر میں جب والدین کا سایہ سب سے زیادہ ضروری ہے ایسے میں بن ماں کے پلنے والے بچے سب کی محبت اور شفقت کے مستحق ہوتے ہیں، میرا علاج کے لئے جانا بے حد ضروری تھا، ورنہ میں انہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاتی، مگر آنے کے بعد انہیں مختلف ایکٹیویٹیز میں مصروف دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، سحرش نام ہے نا تمہارا؟ بیٹا کیا کرتی ہو، کہاں رہتی ہو کتنے بہن بھائی ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے بارے میں تفصیل بتانے لگی، خاتون بہت دلچسپی سے باتیں سن رہی تھیں، علی اور شافع کے لئے سحرش کے دل میں اتنی محبت دیکھ کر انہیں دلی مسرت ہورہی تھی، وہ بہت متاثر ہونے لگیں۔

"بس بیٹا! اپنی اپنی قسمت کی بات ہوتی ہے، ان بچوں کی قسمت...... سحرش آؤ بیٹا ہم باہر چل کر بات کرتے ہیں، بچوں کو اسٹڈیز کرنے دو بلاوجہ ہماری بات چیت سے ڈسٹرب ہورہے ہیں"؟ وہ بچوں کے سامنے بات نہیں کرنا چاہ رہی تھیں، تبھی سحرش کو لے کر لاؤنج میں آگئیں، سحرش بھی ان سے بہت کمفرٹیبل ہوکر اب بات کررہی تھی۔

"آنٹی! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ ان کی مما کہاں ہیں؟ میں بچوں سے بہت فرینک ہوں مگر میں نے ان سے کبھی پوچھا نہیں کہ کہیں میری وجہ سے وہ دکھی نہ ہوں"۔

"بس بیٹے جی! کیا بات بتاؤں، ان بچوں کو تو اپنی ماں کی شکل بھی یاد نہیں، یہ بے چارے تو آیا اور گورنس کے ہاتھوں میں پلے بڑھے ہیں یا پھر ان کا باپ ان کی ماں کا فرض نبھاتا آیا ہے، پر ماں تو ماں ہوتی ہے، اس کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا، بھلا کیا عمر تھی ان کی، آئی تھنک دو سال جب جویریہ ان دونوں کو چھوڑ کر چلی گئی"۔

"وہاٹ، ان کی مما زندہ ہیں؟ اوہ...... میں تو سمجھی کہ وہ اس دنیا میں ہی نہیں ہیں"۔ سحرش نے حیرانی سے پوچھا۔

"بالکل زندہ ہے، سلامت ہے، ہم نے بچوں کو یہ کہا ہوا ہے کہ ان کی مما اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں، وہ تو زندہ ہے اور خوش باش ہے اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ، یہ سب فیصل کی نادانی کی وجہ سے ہوا

ہے، آج سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اپنے خاندان کی لڑکی سے اس کی منگنی کی، سب صحیح چلتا رہا مگر اس جویریہ سے عشق و عاشقی کے چکر میں سب برباد ہوگیا۔

فیصل نے جویریہ سے محبت کے چکر میں اپنی منگنی توڑ کر خاندان میں دراڑ پیدا کی، ہمیں رسوا الگ کروایا اور اس کمبخت کو اس گھر میں لے آیا، آئی ایم سوری سحرش اگر میں نازیبا الفاظ استعمال کروں تو......بس جویریہ کا ذکر آتے ہی میرا پارا ہائی ہونے لگتا ہے۔'' وہ سحرش کو دیکھ کر معذرت خواہانہ لہجے میں بولیں، وہ جو بہت دلچسپی سے بات سن رہی تھی ایک دم بولی۔

''اٹس اوکے آنٹی! آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گی میں''۔

''تھینکس بیٹے جی! بس فیصل کی ضد کی وجہ سے ہم نے انتہائی دھوم دھام سے شادی کی اور اسے گھر لے آئے، جویریہ نے اس گھر کو کبھی اپنا گھر سمجھا ہی نہیں، میں بارہ سال سے وہیل چیئر پر ہوں، نہ اس نے کبھی مجھ پر توجہ دی نہ گھر پر، اس کے لئے ضروری تھے تو اپنے سوشل سرکلز، پارٹیز، دوست، فیشن اور عیاشیاں، دن بدن مسئلے مسائل بڑھنے لگے اور فیصل اور جویریہ میں آئے دن جھگڑے ہونے لگے، اسی دوران علی اور شافع اس دنیا میں آگئے، ہمارے لاکھ سمجھانے پر بھی اس نے اپنے بچوں کو نہیں اٹھایا، وہ بچے شروع دن سے ہی آیا کے ہاتھوں پلے بڑھے، میں جتنا ممکن ہوتا نظر رکھتی تھی مگر میں مجبور تھی، کیا کرتی بہر حال ایک دن جویریہ آدھی رات کو گھر لوٹی، وہ مکمل نشے میں تھی، اس دن فرسٹ ٹائم فیصل نے اس پر ہاتھ اٹھایا، وہ ہاتھ اٹھانے پر اس حد تک مجبور ہوگیا تھا کہ اگر میں جویریہ کو نہ بچاتی تو وہ اسے مار ہی ڈالتا، بالآخر یہ انجام ہوا اس شادی کا کہ اس رات کے بعد وہ جب گئی تو لوٹ کر نہ آئی، آئے

تو ڈائیورس پیپرز، فیصل کو بچوں کی کسٹڈی مل گئی، اب وہ دفت ہے اور آج کا وقت، اس جویریہ کو اس گھر سے گئے چار سال ہوگئے ہیں، فیصل کو شادی کے نام سے ہی چڑ ہے، وہ شادی اور عورت کی ضرورت کو سمجھتا ہے مگر ڈرتا ہے کہ نئی آنے والی عورت کہیں دوسری جویریہ نہ ہو، مجھے فکر ہوتی ہے تو ان بچوں کی، میں نہ رہی تو کیسے مینج ہوگا سب گاڈ نوز''۔ وہ انتہائی افسردہ ہوگئی تھیں، سحرش انہیں ہمت دلانے لگی، سحرش کا پیار سے بات کرنا، انہیں ہمت دینا یہ سب زدیا سلیم کو بہت بھا رہا تھا، وہ آہستہ آہستہ سحرش کی طرف گامزن ہوتی جارہی تھیں اور ان کی دلچسپی سحرش سے بھی پوشیدہ نہیں تھی۔

☆......☆

اب یہ ہر روز کا معمول تھا، سحرش جب بھی پڑھانے آتی، زدیا سلیم اس کو لے کر کبھی لان میں آجاتیں کبھی لاؤنج میں، دونوں خوب باتیں کیا کرتیں، زدیا سلیم نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ایک شادی شدہ بیٹی بھی ہے کرن جو بہت کم آتی جاتی ہے، وہ بھی کافی پروفیشنل اور لبرل قسم کی ہے، اسی طرح کئی باتیں وہ دونوں شیئر کرنے لگیں، اب تو پڑھائی کے علاوہ بھی وہ کافی وقت زدیا سلیم کے ساتھ گزارتی تھی، بچے بھی اس حد تک مانوس ہوگئے تھے کہ سحرش کی کہی گئی ہر بات ان کے لئے لازم ہوتی، وہ خود بھی بچوں سے اور زدیا سلیم سے محبت کرنے لگی تھی۔

☆......☆

''مام پلیز! آپ ہمیشہ کچھ نیا ڈھونڈ کے لاتی ہیں، جب سے آیا ہوں بس سحرش کی تعریفوں کے پل باندھے جارہی ہیں، مانا میں نے کہ بچے بہت مانوس ہیں اس سے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس سے شادی کرکے بیٹھ جاؤں، آپ کا تو کوئی کیلیبر ہی نہیں رہا شاید، نہ کلاس دیکھتی ہیں نہ اسٹینڈرڈ،

بس لڑکی پسند کرکے بیٹھ جاتی ہیں۔ فیصل سلیم چڑتے ہوئے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے بولا۔

''شرم کرو فیصل شرم، ابھی بھی تم کلاس کی بات کررہے ہو؟ ارے ان اسٹینڈرڈ گھروں کی لڑکیوں سے یہ غریب گھر کی لڑکیاں قدرے بہتر ہیں، جن میں ایٹ لسٹ حسن اخلاق، گھر بنانے کا ہنر، تہذیب تو ہے، ورنہ یاد ہے نا وہ جویریہ کیسی ذلت کرکے گئی ہے وہ ہماری''۔

''مام پلیز! جویریہ کا نام مت لیں، وہ میری غلطی تھی جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں''۔

''بیٹے جی، بس اسی غلطی کو بھلانے کا وقت آ گیا ہے، سحرش سے اچھا جیون ساتھی، اور بچوں کی ماں تمہیں کبھی نہیں مل سکتی۔'' زویا سلیم نے بارعب لہجے میں حتمی فیصلہ سنایا۔

''مام! آپ سمجھنے کی کوشش کریں، میں اب لڑکا نہیں رہا، مجھے لائف پارٹنر کی ضرورت نہیں ہے، میرے لئے ایک تجربہ ہی بہت ہے، جس کی تلخی میں آج تک محسوس کرتا ہوں، آپ مجھے ایسے رشتے میں مت باندھیں جو میں نبھا نہ سکوں اور کسی کے ساتھ زیادتی کر بیٹھوں''۔

''تمہیں ابھی ایسا لگتا ہے کہ تمہیں بیوی کی ضرورت نہیں ہے مگر درحقیقت تمہیں بیوی کی بھی ضرورت ہے اور اپنے بچوں کے لئے ماں کی بھی، مگر تم ڈرتے ہو کہ کہیں تمہارا کوئی غلط فیصلہ تمہارے بچوں کی زندگی کیلئے نقصان دہ ثابت نہ ہوجائے، مگر ہم بوڑھے لوگوں کا تجربہ بھی کچھ معنی رکھتا ہے کہ نہیں، سحرش تمہاری زندگی کو جنت بنادے گی، اس دفعہ مجبوری میں ہی صحیح مگر یہ فیصلہ لے کر دیکھو، انشاء اللہ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی''۔

''مام! میرے لئے بہت مشکل ہے، مجھے سوچنے کے لئے کچھ وقت درکار ہے''۔

''ٹھیک ہے، مگر مجھے کل مثبت جواب چاہئے۔''

زویا سلیم بغیر کچھ جواب سنے کمرے سے باہر آ گئیں، ان کا کمرہ نیچے تھا، مگر آج وہ بہت عرصے بعد اوپر آئی تھیں، تاکہ فیصل سے بات کرسکیں وہ دل ہی دل میں دعا گو تھیں کہ فیصل حامی بھر لے، ابھی دوسرا مرحلہ تو سحرش سے بات کرنے کا تھا، فیصل جیسے ہی حامی بھرتا وہ پہلی فرصت میں رشتہ لے کر ڈائریکٹ سحرش کے گھر چلی جاتیں، کچھ دنوں کی بحث کے بعد تنگ آ کر مجبوراً فیصل نے سحرش سے شادی کی حامی بھر لی۔

☆.....☆

فیصل سلیم کا رشتہ سحرش کے لئے ایک بم کی صورت تھا، اس نے گمان بھی نہیں کیا تھا کہ زویا سلیم خود اس کے گھر رشتہ لے کر آئیں گی، سحرش بہت سمجھدار تھی وہ وقت کی نزاکت کو اچھی طرح سمجھتی تھی، اس نے خوش دلی سے یہ رشتہ قبول کیا، اس کے لئے یہ ہی بہت تھا کہ علی اور شافع کو اس کے روپ میں ماں مل جائے گی، وہ تہہ دل سے ان بچوں کے لئے دل میں ہمدردی کے جذبات رکھتی تھی اور یہ ہی جذبات بھانپ کر زویا سلیم اسے سادگی سے دو کپڑوں میں گھر لے آئیں، شادی کے ہلکے پھلکے جوڑے میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی، چند رشتہ داروں نے اسے خواب گاہ تک پہنچایا، وہ جانتی تھی کہ فیصل سلیم کبھی بھی کمرے میں نہیں آئے گا اسی لئے وہ چینج کرکے علی اور شافع دونوں کو اپنے کمرے میں لے آئی، وہ اپنے بابا کی شادی اپنی فیورٹ ٹیچر سے کرا کے خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے، سحرش نے ان دونوں کو جی بھر کے پیار کیا اور ان سے وعدہ لیا کہ وہ اب ہمیشہ اسے مما کہہ کر پکاریں گے۔ ان کے منہ سے مما، سننا اسے اس قدر اچھا لگ رہا تھا کہ بس، وہ مطمئن تھی کہ اس نے شادی کا فیصلہ کرکے بہت اچھا کیا تھا، اس کا کمرہ سپریٹ تھا، جو کہ بہت کشادہ اور انتہائی خوبصورت تھا، وہ جانتی تھی کہ فیصل

سلیم نے مجبوری کے تحت یہ شادی کی ہے زویا سلیم نے اسے پہلے ہی ہر بات سے آگاہ کر دیا تھا، وہ سب جانتے ہوئے بھی صرف بچوں کی خاطر اس شادی کے لئے راضی ہوئی تھی، اس کا اور فیصل کا کمرہ الگ الگ تھا، وہ دونوں بچوں کو سارا دن اپنے کمرے میں رکھتی تھی، وہ سوتے بھی ساتھ تھے، وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ تین دن ہو گئے تھے اور اس کا ابھی تک اپنے شوہر سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ فیصل نہ چاہتے ہوئے بھی سحرش سے گریز کرتا تھا کہ کہیں اس کے سوالوں کے جوابات نہ دینے پڑ جائیں۔

☆......☆

"کوئی چائے وائے ملے گی کہ نہیں یا تو اروالے دن بھی باہر سے چائے پینی پڑے گی"۔ فیصل سلیم نے سرونٹ کو دیکھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی لان میں چیئر گھسیٹ کے بیٹھ گیا۔ سامنے رکھا اخبار اٹھایا اور انگریزی اخبار کا مطالعہ شروع کر دیا، تبھی کسی کی کھنکتی چوڑیوں والے ہاتھ نے چائے عین اس کے سامنے کر دی، فیصل نے چونک کر دیکھا تو سامنے سحرش کو کھڑا پایا۔

"تھینکس...... آپ نے کیوں زحمت کی؟" وہ نظریں چراتے ہوئے بولا اور کپ تھام لیا، سحرش بھی اپنی چائے لے کر وہیں بیٹھ گئی۔

"میں اپنے لئے چائے بنا رہی تھی، سوچا آپ کے لئے بھی بنا دوں۔ آپ کو اٹھتے ہوئے دیکھ لیا تھا میں نے"۔

"اوہ...... تھینکس، کوئی کام ہو تو آپ مجھ سے بغیر کسی جھجک کے کہہ سکتی ہیں، آپ کے اکاؤنٹ میں ہر مہینے پیسے جمع ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو، بلا جھجک کہیے گا"۔ وہ چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کے بات کرنے لگا، وہ بھی آہستہ آہستہ چائے پیتے ہوئے لاتعلقی سے اخبار پڑھ رہی تھی، دھیان وہیں تھا۔

"مجھے بس اپنے اور بچوں کے خرچے کے لئے پیسوں کی ضرورت ہوگی، اس کے علاوہ میں کچھ رقم ہر مہینے اپنے گھر میں دینا چاہتی ہوں، اگر آپ کی اجازت ہو تو؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے سحرش۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

اس کے منہ سے اپنا نام سننا اس قدر دلفریب لگا کہ اس کا دل چاہا بس اس کی زبان سے اپنا نام سنتی رہے۔ جب سے وہ فیصل سلیم کے نکاح میں آئی تھی، ایک عجیب سا احساس اسے لپیٹ میں لئے رکھتا، آج بھی فیصل کو سامنے پا کر وہ وہیں بیٹھ گئی، اس کے پاس سے اٹھتی مسحور کن برانڈڈ پرفیوم کی خوشبو اسے مبہوت کر رہی تھی، پہلی پہلی محبت کا یہ احساس اسے پاگل کر رہا تھا، وہ جذبات پر قابو رکھتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ یکطرفہ محبت اسے خوار کر دے گی، درد کے سوا کچھ نہ دے گی اس کے باوجود وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی، اس کی نگاہیں ہر وقت اپنے مجازی خدا کو ڈھونڈتی رہتیں، زویا سلیم کی گھاگ نظریں پہچان گئی تھیں کہ یکطرفہ ہی صحیح، محبت کی کونپل پھوٹ چکی ہے، اب یہ کب پروان چڑھتی ہے یہ وقت ہی بتائے گا۔

☆......☆

فیصل سلیم واقعی کچھ دنوں میں ہی اپنے گھر اور زندگی میں تبدیلی محسوس کر رہا تھا، سحرش واقعی ایک بہترین ماں ثابت ہو رہی تھی، وہ صبح خود بچوں کو اسکول بھیجتی، ان کو پڑھاتی، نہلاتی اور اپنے سامنے کھانا کھلاتی تھی، نیز وہ ایک مثالی ماں ثابت ہو رہی تھی، وہ اس تبدیلی اور بچوں کی خوشی کو دیکھ کر بہت خوش رہنے لگا تھا۔

"سحرش مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے"۔ وہ لان میں اکثر رات میں بیٹھ جایا کرتی تھی اور کسی

کتاب کا مطالعہ کرتی تھی، آج بھی وہ مو جود تھی، تبھی فیصل سلیم نے وہیں بیٹھے ہوئے کہا۔

''جی کہیے''۔

''میں وہ...... آپ کے لئے ایک پریزینٹ لایا تھا''۔

''پریزینٹ؟ میرے لئے؟'' سحرش کو کانوں پر یقین نہیں آیا، تبھی فیصل نے گفٹ آگے بڑھا دیا۔

''اوہ تھینکس۔'' وہ گفٹ لے کر گود میں رکھ کے اسے دیکھنے لگی۔

''آپ نے یوں اچانک میرا مطلب...... گفٹ دینے کی کوئی خاص وجہ؟''

''ہمہ...... نہیں...... بس دل چاہا تو خرید لیا، امید ہے آپ کو پسند آئے گا''۔

''جو بھی ہوگا، میرے لئے بہت قیمتی ہوگا، میرے لئے یہ ہی بہت ہے کہ آپ نے میرے لئے اتنا سوچا''۔ وہ نگاہیں نیچی کئے بولی، فیصل سلیم کو شرمندگی نے آگھیرا، وہ جانتا تھا کہ اس نے اتنے دنوں میں کوئی حقوق نہیں نبھائے اس کے باوجود سحرش اس سے مسکرا کر گفتگو کر رہی تھی۔

''آپ کو شرمندہ کرنا میرا مقصد نہیں تھا، میں جانتی ہوں کہ کن حالات میں آپ نے مجھ سے شادی کی ہے، مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے، پتہ ہے مسٹر فیصل! میری زندگی کا مقصد کمپرومائز کرنا ہے، میں نے ساری زندگی بس قربانیاں ہی دی ہیں، بچپن میں بچپن کی قربانی، پھر تمام تر آرام، مستیوں اور دوستیوں کی قربانی، اور اب ایسا لگتا ہے کہ یہ شادی بھی ایک سیکریفائز ہی ہے اور بخدا میں بہت خوش ہوں۔ علی اور شافع کو میری صورت میں ایک ماں مل گئی اس سے بڑھ کر میرے لئے کچھ نہیں ہے، پلیز آپ یہ مت سمجھئے گا کہ میں آپ کی ہمدردی بٹورنا چاہ رہی ہوں، بس آج ایسے ہی بہت زیادہ بول گئی۔'' وہ نگاہیں نیچے کئے اپنے ہاتھوں کو گھورتی بہت کچھ بول گئی تھی، فیصل سلیم حیرانی سے سن رہا تھا۔

''اچھا لگا، تم نے کچھ باتیں شیئر کیں مجھ سے''۔ فیصل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''اچھا اب گفٹ تو دیکھو اور بتاؤ کہ تمہیں پسند آیا کہ نہیں؟'' سحرش نے سرعت کے ساتھ چھوٹا سا گفٹ کھولا، اندر ویلویٹ کے باکس میں ایک بہت خوبصورت چین اور لاکٹ موجود تھا، فیصل، سحرش کے بدلتے تاثرات سے محظوظ ہو رہا تھا، وہ سادی سی لڑکی رات کے اس پہر بہت پیاری معلوم ہو رہی تھی، سحرش نے چین دیکھ کر بے ساختہ تعریف کی۔

''واؤ، یہ بہت خوبصورت ہے''۔

''پسند آیا تمہیں، اب خود پہن لوگی یا مجھے پہنانا بھی پڑے گا؟'' فیصل کا شرارت میں کہا گیا جملہ سحرش کو پانی پانی کر گیا، وہ تیزی سے کھڑی ہوگئی، فیصل سلیم جان چکا تھا کہ وہ بھاگ جائے گی تبھی وہ بھی کھڑا ہوگیا۔ وہ سحرش کے بے تحاشہ قریب تھا، اس کے پاس سے ہمیشہ کی طرح اٹھتی پرفیوم کی مہک، اسے پاگل کر رہی تھی، وہ گفٹ ہاتھ میں لئے تھر تھر کانپ رہی تھی، نگاہیں مسلسل نیچے گھاس پر جمی ہوئی تھیں، فیصل سلیم اس کی اس کیفیت سے مسلسل محظوظ ہو رہا تھا۔

''تم نے بتایا نہیں خود پہن لوگی، یا میں، پہنا دوں؟''

''نہ...... نہیں میں خود پہن لوں گی''۔ وہ کہتی ہوئی سرعت سے بھاگ نکلی، اس کی دھڑکنیں اس کے قابو میں نہیں تھیں، وہ بستر پر گری عجیب سی سرشاری کے عالم میں تھی، فیصل سلیم کا ایسا رویہ، ایسا روپ وہ بہت کنفیوز تھی۔

اب اکثر ایسا ہونے لگا تھا، فیصل سلیم اس سے چھیڑ چھاڑ کرتا اور وہ شرما کر بھاگ جاتی۔ فیصل خود سحرش سے دلی وابستگی محسوس کرنے لگا تھا، اور یہ انسیت اسے سحرش کے اخلاق، اور اس کی اچھائیوں

کی وجہ سے محسوس ہو رہی تھی، کہاں وہ شادی کے نام سے خوفزدہ تھا اب چند دنوں میں ہی وہ سحرش کی سنگت کا متلاشی رہنے لگا، بچوں کی طرف سے تو وہ مکمل بے فکر ہو گیا تھا، وہ ساری توجہ اب بزنس پر دیتا، روز ایک یا دو دفعہ بچوں اور سحرش سے اس کی ملاقات ہو جاتی تھی، آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔

☆......☆

فیصل کو اچانک کام کے سلسلے میں دبئی جانا پڑ گیا تھا، وہ ایک ہفتے بعد گھر واپس لوٹا تھا، یہ ایک ہفتہ اس کی زندگی میں بہت اہمیت کا حامل تھا، اس دوران وہ فیصلہ کر کے لوٹا تھا کہ زندگی کو پھر ایک موقع دینا ہے، رات کے دو بجے اس نے فون کر کے سحرش کو اٹھایا، وہ فریش ہو کر نیچے آئی، یوں اچانک آمد پر وہ بھی حیران تھی۔

''آپ تو دو دن بعد آنے والے تھا نا! یوں اچانک''۔

''بس آپ کی یاد آئی تو ہم جلدی آ گئے، اب ہماری کچھ خاطر کرو، بھوک سے برا حال ہے کچھ ملے گا؟'' وہ شرارت سے گویا ہوا۔ آج اس کا موڈ حد درجہ اچھا تھا۔

''جی...... میں ابھی لائی۔'' وہ کھانا گرم کرنے لگی اور ٹرے میں سجا کر ٹیبل پر لے آئی، فیصل کو نہ پا کر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی، تبھی اوپر سے آواز آئی۔

''کھانا میرے بیڈروم میں لے آؤ، میں یہاں ہوں''۔ وہ ٹرے لے کر اوپر فیصل سلیم کے بیڈروم میں آ گئی، وہ آج پہلی بار اس کے کمرے میں آئی تھی، اے سی کی کولنگ سے ٹھنڈا ٹھار کمرہ، فیصل کے سینٹ کی بسی خوشبو، کمرے میں فیصل موجود نہیں تھا، وہ جانے لگی تبھی واش روم سے سر پر تولیا لیے وہ باہر آیا، اسے بنا شرٹ کے دیکھ کر وہ منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی، تبھی اسے کان کے بہت قریب آواز سنائی دی۔

''میں غیر ہوں کیا، جو تم مجھ سے نظریں چرا رہی ہو۔ شوہر ہوں تمہارا۔'' وہ اس قدر قریب تھا، سحرش کے تو روم روم سے پسینہ نمودار ہو گیا، اتنے کول کمرے میں بھی اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے، وہ ہمیشہ کی طرح بھاگنے والی تھی مگر سامنے والا مکمل راستہ روکے کھڑا تھا۔

''مجھے صبح اسکول...... اسکول کے لیے اٹھنا ہے۔''

''شش...... شش...... ابھی صرف ہماری بات کرو، نو کڈز، نو اسکول، بلاہ بلاہ۔''

''فیصل پلیز!''

''لیکن آج کے بعد سے میں تمہیں کبھی کہیں نہیں جانے دوں گا، یہ ہمارا کمرہ ہے، اور ہم آج سے یہیں سوئیں گے''۔ وہ مسلسل اس کے کان میں سرگوشی کر رہا تھا، وہ شرم سے دوہری ہوئی جا رہی تھی، جانتی تھی کہ آج اس کے صبر کا ثمر اسے مل گیا ہے، آج اس کے شوہر نے اسے دل سے اپنا لیا ہے، وہ مسلسل کان میں سرگوشی کر رہا تھا، اپنی محبت کا اقرار کر رہا تھا، وعدے وعید کر رہا تھا، اور وہ آنکھیں بھینچے وہ محبت کی اتاہ گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جا رہی تھی، آج زوبیا سلیم کے یقین کی جیت ہوئی تھی، واقعی بڑوں کے کیے گئے فیصلے ہمیشہ صحیح ثابت ہوتے ہیں، فیصل سلیم کو بھی بہت جلد اس بات کا احساس ہو گیا تھا، وہ اپنی ماما کا دل سے مشکور تھا کہ انہوں نے ایک بہت سلجھی ہوئی سمجھدار جیون ساتھی اور ایک بہت پرواہ کرنے والی ماں کا انتخاب سحرش فیصل کی صورت میں کیا تھا۔ ایک شادی اس نے اپنی مرضی کی کی تھی جو کہ ناکام ثابت ہوئی، اور ایک شادی اس نے مجبوراً ماں کی مرضی سے کی اور اوپر والے نے دنیا کے سارے سکھ اسی رشتے میں سمو دیے۔

......☆......

سحرش فاطمہ

افسانہ

دل کے ہاتھوں مجبور

''تمہاری زندگی کا مقصد کیا ہے؟'' اس کے اچانک سوال کرنے پر میں نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اسے دیکھا اور اس سوال کو سمجھنے کی کوشش کی۔



''ایک تو تمہاری آنکھیں اتنی بڑی ہیں کہ دیکھے ہی دیکھو تو ڈر جائیں ان کو مزید بڑی اور پھیلانے کی ضرورت نہیں''۔ اس نے مجھے ناک آؤٹ کرنے کی پھر سے کوشش کی اور میں ہاتھ باندھ کر منہ بسورے بیٹھی رہی۔

''سچ کہہ رہی ہوں، تم نے اپنا خود ستیاناس کیا ہوا ہے، تم ان لڑکوں کے چکر سے کب نکلو گی؟'' اس نے وہ بات کر دی جس پر میرا معصوم موی دل پگھل جاتا ہے۔ ایسی بات نہیں تھی کہ میں غلط تھی لیکن اس بات پر میرا دل کٹ کر رہ جاتا ہے جب بھی سوچتی ہوں۔

''منہ میں زبان نہیں ہے کیا؟ ویسے تو ان محترمہ سے ٹک ٹک میسجز کروالو اور چیٹنگ بھی سب کو سنا دے گی لیکن ویسے گنگ ہوئی زبان لئے بیٹھی رہے گی۔'' اس کی بات سن کر میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ ابھی کے ابھی اس کے بال نوچ لوں اور وہ مزے سے بولے جا رہی تھی۔ ہم دو دوستیں تھیں، ہمارے خیالات شاید ہی کبھی ملے ہوں آپس میں لیکن دوستی میں ضروری نہیں کہ خیالات بھی ملیں، خیر میں اس شام اپنے کمرے کے ٹیرس پر بیٹھی ہوئی تھی چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے موسم کا مزا لے رہی تھی، ابر آلود ہونے کے باوجود بھی بارش نہیں ہوئی لیکن آسمان کو دیکھ کر بھی مزا بھی آتا ہے، میری دوست جو میرے ساتھ والی گلی میں رہتی تھی لیکن میرے پاس



جب بھی آتی یوں لگتا کہ یہ اس کا گھر ہو، ابھی بھی وہ میرے گھر میں ہی موجود تھی۔

"میں تو تھک گئی ہوں تم سے کہہ کہہ کر خدا کا واسطہ ہے نکل آؤ ان سب سے کیوں تم اپنی زندگی خراب کر رہی ہو؟"

"میں نے کیا کیا ہے بھئی؟ کب سے بولے جا رہی ہو، دو گھڑی سانس نہیں لے سکتیں تم؟" بالا آخر میں نے لب کشائی کر ہی لی اس کی پٹر پٹر کرتی زبان کو چپ کروانا تھا۔ چائے تک سکون سے پینے نہیں دی اس نے مجھے "نہ لیکچر دو کیا کرنا ہے کیا نہیں، اپنے آپ کو دیکھا ہے؟" میری بات سن کر وہ بھونچکی رہ گئی اور میں اس کی شکل پر بارہ بج رہے تھے اور میں مزے سے دیکھ رہی تھی۔

"لو میں نے کیا کر دیا؟" وہ بھی کنگ سی مجھے دیکھنے لگی۔

"اچھا، مجھے کہتی ہو کہ میں لڑکوں کے پیچھے ہوں اور تم جو لڑکوں کو اپنے پیچھے لگائے ہوئے ہو وہ کیا ہے؟" مجھے لگ رہا تھا کہ بس اب میں نے اس کی بات بتا کر اس کے بال نوچنے کے مترادف کر لیا ہے حالانکہ مجھے یہ سب کہنا تو نہیں چاہئے تھا پر وہ مجھے سنائے جا رہی تھی تو میں کیوں چپ رہتی؟"

"کیا بکواس کر رہی ہو میں نے کسی کو بھی اپنے پیچھے نہیں لگایا"۔ اف یہ جھوٹ کے کتنے رنگ ہوتے ہیں؟ سفید کالا نیلا پیلا، خیر جو بھی اس کا جواب نہیں کیا مزے سے جھوٹ بولنے کی شروعات کی ہے اور میں اسے ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔

"اچھا..... وہ یاد ہے تمہاری گلی میں ہی رہتا تھا وہ تو آج بھی منتظر ہے کہ تم اس سے ایک دفعہ اظہار افسوس کر لو"۔ میں نے اسے لڑکا یاد دلایا جس کے بارے میں اس نے مجھے بتایا تھا اور ابرو اچکائے اسے بغور دیکھا۔

"توبہ ہے یار! میں اسے بھائی سمجھتی تھی اب وہی مجھ سے امیدیں باندھنے لگ گیا تو میرا کیا قصور؟"

"واہ کیا بات ہے ان کی بھی"۔ وہ اپنے کانوں کی لو پہ ہاتھ لگانے لگی اور میں اسے دیکھنے میں مگن تھی۔

"اچھا اور وہ اسکول میں جو تھا تمہارے ساتھ بلکہ بیٹھتا بھی تمہارے ساتھ تھا بے چارہ کتنا بدنام ہوا تھا تم نے ہی تو اسے فیئر ویل میں وہ ایک ٹائٹل دے دیا تھا یاد ہے؟" میں نے ایک اور بات یاد دلائی۔

"ہاں ناں بھائی بہن کی جوڑی تھی اور وہ اس میں بھی پیار لے کر آ گیا یہ تو اچھا ہوا مجھے پتا چل گیا تھا اور میں نے اسے سب کا بھائی ایک ہی بھائی کے نام کا ٹائٹل دے دیا تھا"۔ ایک کمینی سی ہنسی آئی اسے اور میں اس کی باتیں سن کر کھول رہی تھی۔

"کیا تم صرف بھائی بنانی ہو؟ وہ بھی تب جب وہ تمہیں کہہ دیں کہ تمہیں پسند کرتے ہیں؟ واہ کیا بات ہے تمہاری؟" مجھے اس کی یہ بات عجیب ہی لگی۔

"اچھا تو کیا کرتی؟ تمہاری طرح سب کو اپنا دل دے بیٹھتی؟ اور دو تین سال تو چھوڑو ایک سال بھی گزارنے کے بعد بے دردی سے چھوڑ دیتے ہیں اس پر آنسو بہا بہا کر ٹب بھر دیتی؟" اس نے پھر مجھ پر چوٹ کی، میں سلگ گئی کیوں نہ سلگتی اس نے میرے دل پر میری دکھتی رگ پر وار کیا تھا۔

"تمہارے پاس تو دل ہی نہیں ہے آج بھی جو تمہیں پسند کرے اس کے ساتھ باتیں کرتی ہو ٹل بھی لیتی ہو اور جب وہ شادی کی بات کریں یا اظہار کریں تو تم انہیں فضول باتیں سنا کر بھائی کا لفظ چپکا دیتی ہو۔" میں نے فرح کو دیکھا اور کہا اور وہ پھر ہنسی۔

"اور تم اپنا حال نہیں بتانا پسند کرو گی کہ کیسے تم سے دوستی کر کے تمہیں پیار کا کہہ کر تمہیں آخر میں چھوڑ جاتے ہیں مس عائزہ ارے یہ تو کچھ نہیں ان کی محبتیں تو عید کی طرح ہوتی ہیں ہر سال پیار ان کا جاگ جاتا ہے اور یہ واپس آپ سے رابطے میں آ جاتے ہیں اور بس پھر وہی باتیں شروع اور کیا ہوتا ہے پتا ہے ناں"۔ میری ہنسی ایک دم رک گئی وہ مجھے سب یاد دلا رہی تھی جو میں خود بھول نہیں پا رہی تھی، سچ کہہ رہی تھی لیکن میں اب کیا کہوں؟ فرح مجھے گھوری دے رہی تھی۔

"میں صرف اتنا کہوں گی کہ میرے دل میں ان کے لئے کبھی برا نہیں آیا ہاں یہ مانتی ہوں کہ میں ان کے واپس آنے کا انتظار کرتی ہوں۔ انہیں بھلا نہیں سکتی بس اور کیا کہوں؟" میرا اداس چہرہ دیکھ کر وہ میرے پاس آئی۔

"تمہیں اندازہ ہے تم کتنی بڑی بے وقوف ہو؟ تم ان لڑکوں کی فطرت کو سمجھ نہیں رہی ہو یا سمجھنا نہیں چاہتیں؟" اس کا لیکچر شروع ہو چکا تھا وہ سمجھا رہی تھی

کہ لڑکوں کی فطرت کیسی ہوتی ہے لیکن لڑکیوں میں اگر میں کہوں کہ کوئی غلط ہے تو اس وقت فرح تیمور میرے سامنے تھی۔

"تم مجھے لڑکوں کی فطرت بتاؤ گی اور اپنے بارے میں کب لیکچر دو گی؟" میں نے اسے ہی پیچ دیا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" شاید وہ سمجھ گئی تھی لیکن ڈرامہ تو میرے سامنے ہی کرنا تھا۔

"مطلب یہ کہ لڑکیوں کی فطرت مجھے سمجھاؤ گی یا لڑکوں کی لڑکیاں کیسے دل توڑتی ہیں؟" میں نے صاف بات کر دی۔

"میں نے کبھی دل نہیں توڑا اگر خود ٹوٹ جاتا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"انہیں ایلفی تو دے سکتی ہو نا؟" میری بات سن کر اس نے بھنویں اچکا لیں۔

"بی بی رہنے دو، عورت پر الزام نہیں آتا مرد ذات پر ہی آتا ہے کہ وہ ہی دل توڑنے کے ایکسپرٹ ہیں"۔ اس کی بات پر میرا دل پتا نہیں کتنے آنسو رونے لگا۔

"ہاں اور تم ان کے ہی نقش قدم پر تو چل رہی ہو، وہ بھی تو بہن بنا دیتے ہیں یا تو کہتے ہیں کہ ہم نے شادی کا وعدہ کیا ہی نہیں تھا تو امید کی گٹھڑی کیوں باندھی"۔ یا میں کم تھوڑی نا تھی سنانے پر آؤں تو رکتی نہیں تھی۔

"میں ان کے نقش قدم پر کیوں چلوں گی بھئی؟ میری عقل کیا گھاس چرنے گئی ہے؟ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں، لڑکوں کی اپنی مرضی ہوتی ہے وہ جیسا سمجھیں۔ پر میں تو یہی کہوں گی کہ میں انہیں بھائی ہی سمجھتی ہوں"۔

"ہاں اپنے شوہر کو بھی بھائی ہی سمجھنا"۔ میں نے اس کی بات پوری کرنے کی جسارت کی۔

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ تم ہی ایسی فضول سوچ رکھ سکتی ہو میں نہیں"۔ اس نے پھر مجھ پر گولی چلائی میں نے بھی پانی والی گن اٹھانے کا سوچ لیا۔

"لڑکیاں چالاک ہو جائیں جتنی بھی، لیکن ان کی فطرت میں معصوم پن اور بھولا پن تو کہیں نہیں جانا، اس ہی کا فائدہ وہ اٹھا سکتی ہیں کسی کا دل جیت کر تو کسی کا دل توڑ کر"۔ میں نے فرح کو کہا۔

"اچھا تو تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم بھی چالاک ہو؟" اس نے تو یہ پانی والی گن میری طرف کر دی۔

"میں چالاک ہوں بھی تو اس چالاکی میں بھی پیار جھلکے گا اور لوگ سمجھ بھی جائیں گے پر تم اپنے آپ کو کوئی چالاک لومڑی کہو گی" میری بات پر وہ میرے پاس آ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور مجھے گھورنے لگی۔

"چالاک ہونے کے باوجود ان میں عقل نام کی چیز ہوتی ہے جس سے وہ سمجھ جاتی ہیں کہ کون اسے بے وقوف بنا رہا ہے، تم لڑکیاں بھی ناں بس جو بیٹھے بول بولے، اسے اپنا خیر خواہ سمجھ کر دل کی بازی ہار جاتی ہو اور اس کا خمیازہ تم لڑکیوں کو عمر بھر بھگتنا پڑتا ہے"۔ میں اب اسے غور سے سن رہی تھی۔

"پر میں پھر بھی کہوں گی کہ ان کا احساس جاگتا ہے، آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ترسوں"۔

"مرسوں مرسوں مرسوں"۔ میں بول ہی رہی تھی کہ مجھے مرسوں مرسوں یاد آ گیا۔

"جب انسان کا پیٹ بھر چکا ہوتا ہے تو اسے پھر کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی طرح ایک دفعہ لڑکی سے دل بھر جائے وہ دوبارہ اس کی چاہ نہیں رکھتا۔ یہ انسان کی فطرت سمجھ لو کہ اسے من پسند جب کھانا ہوتا ہے وہ کافی دن انتظار کے بعد کھاتا ہے روز کھائے گا تو بور ہو جائے گا، لڑکے بھی جب روز روز بات کرتے ہیں انہیں وقتی شاید اچھا لگے پھر وہ اکتا جاتے ہیں جیسے ہم ایک ہی چیز کھا کھا کے اکتا رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے تو وہ دور ہو جاتے ہیں اور جب ان کا دل کرتا ہے تب ہی بات کرتے ہیں"۔ یہ فرح کے لیکچر کی ٹیپ تھی شاید جو وہ خالصتاً میرے گوش گزار کر رہی تھی۔

"مجھے اس کی کہی ہوئی بات پر وہ لوگ یاد آنے لگے جنہوں نے پیار کا اظہار کیا پھر کوئی مجبوری آ گئی ظالم سماج کی طرح اور دور کر گئی، لیکن پھر معافی تلافی کر کے واپس جوڑ دیتی اور پھر کچھ عرصے میں پھر دوری آ جاتی۔

"میں اب بھی کہوں گی فرح کہ اگر ہم لڑکیاں سزا بھگت رہی ہیں تو لڑکے بھی خوش حال تو نہیں ناں رہتے ہوں گے۔ کہاں ناں انہیں ہماری یاد ستاتی ہو گی، کبھی تو وہ شادی کے بعد بھی ہم سے رابطے میں رہتے ہیں"۔ میرا یہ خام خیال تھا اور میں ہی دھجیاں اڑانے میں مگن تھی۔

"لڑکیوں کا دل آج تک سمجھ نہیں آیا، ان کی طرف ہی زیادہ مائل ہوتا ہے جو انہیں محض اس وجہ سے چھوڑ دیتے ہیں کہ انہیں اب وہ پیار وہ چاہ نہیں رہی

کیونکہ وہ گھر کے کاموں میں الجھے ہوتے ہیں گھر کی ذمہ داریاں ہوتی ہیں اس لیے وہ دور ہو جاتے ہیں اور جب ان کی کہیں اور شادی ہو جاتی ہے تو انہیں پھر وہ پرانی لڑکی یاد آتی ہے پھر زندگی کے کسی موڑ پر وہ لڑکی مل جائے یا رابطہ بحال ہو جائے تو ان کا دل اٹھکھیلیاں کرتا رہتا ہے۔ یہیں سے ان لڑکیوں کا دل ان کی طرف آنے لگتا ہے کہ یہ بے وقوف قوم سمجھتی ہیں کہ انہیں اب بھی ان سے پیار ہے، ان لڑکوں کو کیوں سمجھ نہیں آتی کہ بیوی کے آجانے کے بعد کیسے اور کیوں احساس جاگ جاتا ہے؟'' اور یہ میڈم فرح تیمور نے زوردار چھکا مارا تھا کہ گیند ہی باؤنڈری کے باہر چلی گئی تھی میں ہاتھ مل رہی تھی اب کیا جواب دیتی مجھے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا۔ ''چلو یہ تو تم نے کہہ دیا کہ لڑکیاں بے وقوف ہیں اور لڑکوں کا بھی سمجھ نہیں آتا واقعی''۔ میں دل میں سوچ رہی تھی کیونکہ ایسا واقعی میرے ساتھ ہوا تھا۔''

''پر یہ بتاؤ کہ لڑکیاں کیوں دھوکہ دیتی ہیں؟'' میں نے بھی گیند زور سے پھینکنے کے بعد سوچا کہ وہ کھیل ہی نہ سکے۔

''وہ اس لئے کہ انہیں لگتا ہے کہ وہ اپنی لڑکی ہونے کا فائدہ اٹھا رہی ہیں جبکہ وہ خود اپنے آپ کو ذلیل و خوار اور رسوا کرنے پر تلی ہوئی ہیں''۔ ہیں یہ کیا کہہ گئی؟ میں بس فرح کو دیکھ رہی تھی۔

''عائزہ...... یہ لڑکیاں اگر اپنے آپ کو ڈھیل نہ دیں اور کسی بھی لڑکے کو اجازت نہ دیں تو وہ ان کے معصوم دل سے کھیل ہی نہیں سکتا''۔ یہ فرح کہہ رہی تھی؟ اور میں سن رہی تھی۔

''لیکن فرح، لڑکیاں کیوں ایسا کرتی ہیں وہ بھی تو لڑکوں کو دھوکہ دیتی ہیں ان کا دل توڑ دیتی ہیں۔ اس حساب سے دونوں قومیں ہی غلط ہوئیں ہیں ناں؟'' اگر فرح دونوں کو ہی قصوروار ٹھہرا رہی تھی تو پھر ہم بھی تو لڑکیاں ہی تھیں ہم صرف لڑکوں کو ہی کیوں کہتے ہیں؟ میں جس جگہ بیٹھی ہوئی تھی جائے کے ساتھ ساتھ میں سامنے بیٹھے کوے کی اچھل کود دیکھ رہی تھی۔ ہم نے دو مٹی کے برتن رکھے ہوئے تھے پرندوں کے لیے پانی بھر کر۔ کوے میاں کبھی ایک برتن میں جاتا کبھی دوسرے میں اور خود ہی مزے سے اپنے اوپر پانی کے چھینٹے گرا رہا تھا۔

''تم ایسا کرو دونوں کا رونا رولو، لڑکے بھی دھوکہ دیتے ہیں لڑکیاں بھی ٹھیک ہے ناں؟'' وہ کپڑے جھاڑتی ہوئی اچانک اٹھ گئی۔

''جا رہی ہو؟'' میں نے دل میں خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں ایک بھائی نے کام کہا تھا وہ کرلوں پھر آتی ہوں''۔ اس کی بات پر مجھے تپ چڑھ گئی اس لڑکی نے تو سب کو بھائی بنایا ہوا ہے جیسے سب اس کے سگے ہوں میں نے بھی اس کی بات پر ہنکارتے ہوئے منہ پھیر لیا۔ اس کی بات سمجھ نہیں آئی وہ کس طرف تھی؟ لڑکیوں کے یا لڑکوں کے؟ اور میں صرف ان یادوں میں ہی گھری رہتی ہوں افسوس بھی کرتی ہوں خود پر لیکن دل کے ہاتھوں مجبور بھی ہوں۔ مجھے ایک ایک کر کے وہ سب یاد آنے لگے جنہوں نے مجھ سے پیار کا دعویٰ کیا اور پھر چھوڑ دیا، جب چھوڑ ہی دینا تھا تو بقول فرح کے وہ واپس کیوں آتے ہیں یہ کیسا پیار تھا؟ کہ ساتھ بھی نا دو لیکن وقت بھی گزار لو۔ اور میں اس بات کو یہ سمجھتی ہوں کہ چلو بے وقوف ہی سہی شاید وہ سمجھ جائیں کہ میں اب بھی ان کی منتظر ہوں۔ وہ جا چکی تھی اور میں وہیں جائے کی چسکیاں لیتے ہوئے ان ہی لوگوں کی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً غلطی ہماری ہوتی ہے جو بنا سوچے سمجھے ایسا قدم اٹھا لیتی ہیں اور پھر عمر بھر اس کا روگ پال کر سوگ مناتی ہیں۔ فرح اگر غلطی پر تھی یا ہے تو عائزہ بھی ہے لیکن یہ ابن آدم بھی کسی کے سمجھ میں نہیں آتا تو بنت حوا بھی نہیں، بنت حوا نازک ہے، بے وقوف ہے، اسے بہکانا بہت آسان ہے اور یہ آدم کے بیٹے جن پر شیطان غالب آ جاتا ہے تو وہ بھی بہک جاتے ہیں، تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی، اگر تو ہم مردوں کو کہیں گے کہ وہ برے ہیں تو یہی مرد عورت کو کہیں گے کہ وہ بری ہیں ایک دوسرے کو الزام کے ترازو میں تولتے تولتے یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ایک حد مقرر کر رکھی ہے۔ جو اس حد کو پار کرے گا وہ خود ہی اس کا ذمہ دار ہوگا۔ ہم لوگ خود اپنی عزت کو مجروح کر دیتے ہیں اور الزام ایک دوسرے پر لگا دیتے ہیں۔ خود کو ایسے شیلڈ میں ڈھال دیں کہ کوئی چھو بھی نہ سکے یہی بہتر ہے، آپ کا کیا خیال ہے؟

......☆......

عمارہ خان

افسانہ

ایسا بھی ہوتا ہے

"کاش گھروں میں کچن نامی جگہ ہی نہ ہوتی تو دنیا میں کتنا سکون ہوتا نا۔ نہ ہی روز کا سوال ہوتا آج کیا پکے گا؟ نہ ہی ساسیں اپنی بہو سے سوال کرتیں۔ کیا کیا پکانا آتا ہے؟ نہ بیویوں کو پریشانی لاحق ہوتی۔ آج میاں کے لیے کیا پکا کے معدے کے راستے مزید اندر گھسیں اور اور اور......" اشنا کے روز کے دکھ جاری و ساری تھے وہ ہمیشہ کی طرح بلند آواز میں اپنے اقوال زریں گھر والوں کی سماعت تک پہنچانے کی کوشش میں تھی۔ لیکن گھر والے بھی اس حرکت کے عادی ہو چکے تھے۔ سو کسی کے کانوں پہ جوں بھی نہیں رینگتی تھی۔

جب اشنا نے دس پندرہ منٹ کے واویلا مچانے کے بعد دیکھا کوئی متوجہ ہی نہیں، تو شرافت سے کچن میں جا کے برتن دھونے اور شام کی چائے کی تیاری کرنے میں ہی عافیت جانی۔

☆......☆

امی، ابو، اشنا اور علی اس چھوٹی سی متوسط طبقے کی فیملی میں صرف ایک فرد کا اضافہ ہوا تھا جو علی کی زوجہ حیات بن کر اس گھر کی رونق میں اضافہ کرنے کا باعث بنی تھیں۔ سعدیہ بھابی ایک پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ امی بھی بیٹے کی شادی کے بعد ہر ممکن کوشش کرتیں کے روائتی طرز کی ساس بہو کے اختلاف سے پرہیز ہی کریں۔ تا کہ گھر کا ماحول نہ خراب ہو اور چھوٹی سی فیملی سکھ و سکون سے رہ سکے۔

اسی لیے انہوں نے بہو کے آتے ہی کام بانٹ دیے تھے۔ بیٹی اشنا اور بہو سعدیہ کی آسانی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے۔ جھاڑو پوچا ہمیشہ کی طرح ماسی ہی کرتی تھی۔ صرف بہو کے ذمہ کھانا لگا دیا تھا۔ تا کہ صبح اپنے حساب سے اٹھ سکیں۔ کیوں کہ امی اور ابو فجر کے بعد ہی ناشتہ کر لیتے تھے جو امی بنا لیتی تھیں اور آج بھی اسی روٹین پہ قائم تھیں۔

امی ہر گز بھی ان خواتین میں اپنا نام نہیں لکھوانا چاہتی تھیں جو بہوؤں کو ایک روبوٹ سمجھ کے دن رات گھر کے کاموں میں جھونک دیتی تھیں۔

اس گھر کی جو روٹین تھی امی نے وہ برقرار رکھی اور ناشتہ وہی بناتی رہیں جب کہ دوپہر کا اور رات کا کھانا سعدیہ کے حوالے کر دیا اور اشنا کے ذمہ چھوٹا موٹا کام یعنی کھانا لگانا، اٹھانا، برتن دھونا اور شام کی چائے لگا دی، لیکن اشنا کے لیے یہ کام بھی پہاڑ سر کرنے کے مترادف ہوتے۔

☆......☆

شام کی چائے بنانے سے پہلے اشنا کا معمول تھا پانچ منٹ کی تقریر کرنا۔ اپنے سنہرے خیالات سعدیہ کو سنانا جو رات کے کھانے کے لیے یا مینو مرتب کر رہی ہوتی یا آٹا گوندھ رہی ہوتی کے مغرب کے فوراً بعد کھانا کھا لیا جاتا تھا۔

اشنا کے سنہرے خیالات میں سرفہرست یہ تھا۔

"میری شادی کرتے وقت دھیان رکھا جائے، میاں چٹورا نہ ہو، سسرال چھوٹی ہو، ماسیاں لگی ہوں،



کوک ہو تو بات ہی کیا ہے۔ کسی بہانے سے بتا دیا جائے کہ اشنا کو کچن سے الرجی ہے وغیرہ وغیرہ۔"
سعدیہ بھی معمول کے مطابق گردن ہلا ہلا کے بتاتی وہ سب سن رہی ہے اور عمل کرنا نہ کرنا تو بعد کی بات تھی نا۔

☆......☆

خیر انہی سکون و آرام کے ماحول میں B.A کے آخری پیپرز کے بعد جب اشنا نے گھر میں قدم رکھا تو کچھ غیر معمولی سا محسوس ہوا۔
امی آنکھوں میں نمی لیے اسے تک رہی تھیں۔ بھابی کے چہرے پہ شرارتی مسکان تھی۔ اور تو اور ٹیبل پہ چائے برتن اور مٹھائی بھی رکھی تھی۔
"کیا ہوا بھابی! خیر تو ہے۔"
آخر زیادہ دیر تک برداشت نہ ہوا تو پوچھ ہی لیا۔
"بنو! اب آپ پرائی ہونے جاری ہیں۔" بھابی نے شرارتی لہجے میں میٹھی سی مسکان چہرے پہ سجا کے بولا۔
"ہیں......" اشنا نے ہونق بن کے پوچھا۔
"فکر نہ کرو میرے کزن ہیں اور اکلوتے ہی ہیں۔ نو سسرال نو زیادہ کام۔" بھابی نے قہقہہ لگاتے ہوئے مزید تفصیل دی۔ اور امی بھی ساتھ مسکرا دیں تو اشنا کو احساس ہوا یہ تو شرمانے کا موقع ہے اور ساتھ ہی اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

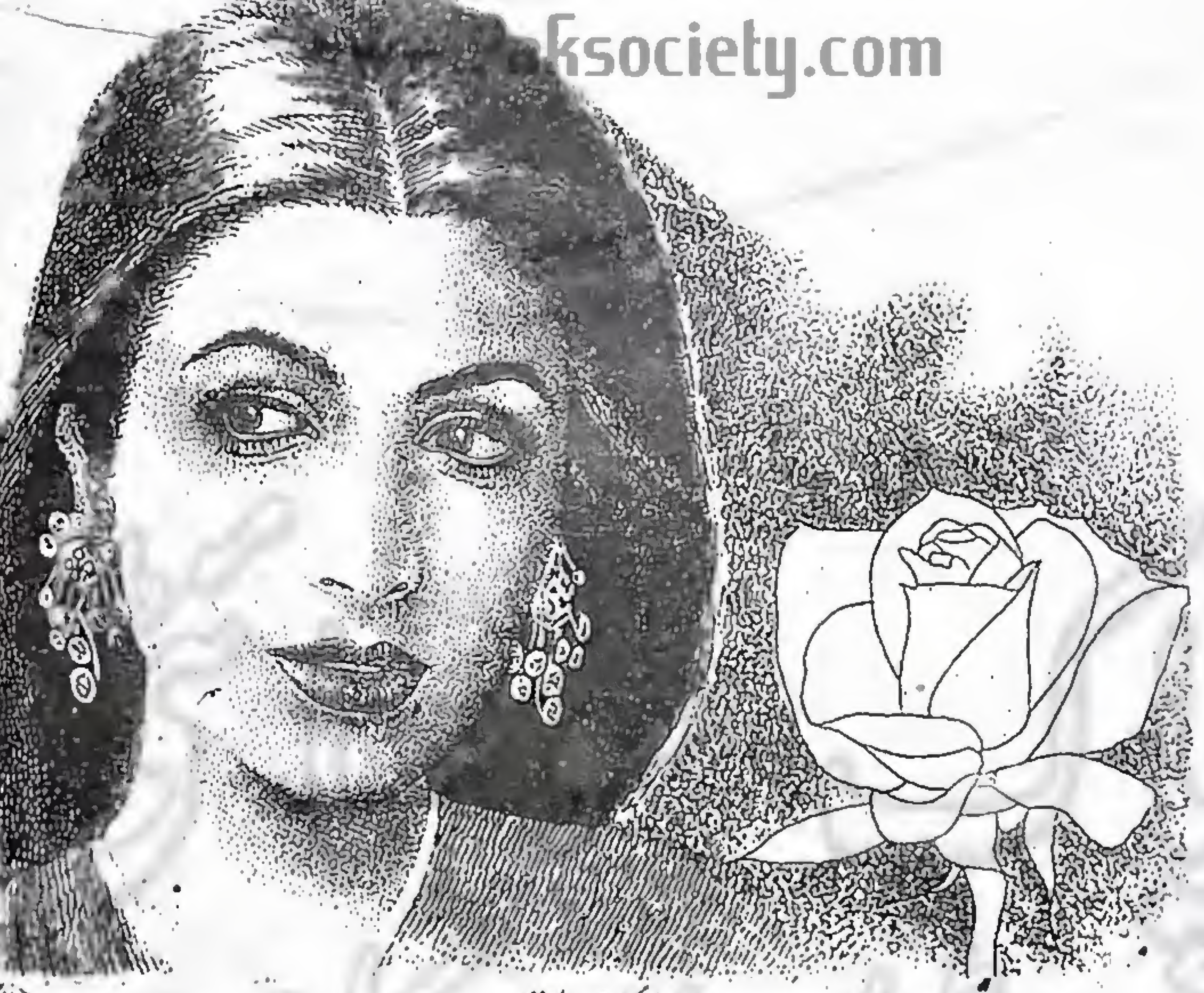
☆......☆

رشتہ پکا ہوتے ہی کاموں کی ایک نا ختم ہونے والی فہرست آ گئی۔ حالانکہ سفیان نے سختی سے جہیز جیسی خرافات کا منع کر دیا۔ اکیلے تھے اور آفس کی طرف سے ایک فلیٹ ملا ہوا تھا فل فرنش تو کسی مزید فرنیچر کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن پھر کراکری اور پرسنل کپڑے، پارلر جیسے ہی کام بے تحاشہ تھے۔ اللہ اللہ کر کے رخصتی کا دن آن پہنچا تو معلوم ہوا دن تو پر لگا کے اڑ گئے تھے جیسے۔
شادی کے بعد ہی ہنی مون کے نام پہ مری، کاغان بھی گھوم آئے اور زندگی ایک دم جیسے پرسکون جھیل کی مانند ہو گئی۔
اس جھیل میں پہلا پتھر شادی کے بیس دن بعد پڑا جب سفیان کے آفس کا پہلا دن تھا۔

☆......☆

"اشنا، اشنا۔" کوئی بہت دور سے آوازیں لگا رہا ہو جیسے۔
"اشنا۔" اچانک کانوں کے پاس بلاسٹ سا ہوا۔
"کیا ہوا؟" اشنا نے ایک دم گھبرا کے آنکھیں کھول کے دیکھا تو میاں جی پاس کھڑے اسے پکار رہے تھے۔
"او ہو حد ہو گئی کتنی گہری نیند سوتی ہو۔ کب سے آوازیں لگا رہا ہوں۔" اشنا جس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ زرا سنبھل کر کہ میاں جی شاید پیار سے جگا جگا کے تھک گئے ہوں گے اسی لیے زرا زور سے آواز لگا دی ہو گی۔ جو اشنا کو بم کی آوازیں لگی تھیں۔
"کیا ہوا، بتائیں تو؟" اشنا نے آخر کار سوال پوچھا۔
"ارے بھئی اٹھ جاؤ آٹھ بج رہے ہیں۔ ناشتہ نہیں بنانا کیا نو بجے میں نکل جاتا ہوں۔ لنچ ساتھ لے کے جاتا ہوں، واپس آنا مشکل ہو جاتا ہے میرے لیے۔"
"جی؟" اشنا کی رہی سہی نیند ایک ہی جھٹکے میں اڑ گئی۔ اور آنکھیں باہر ابلنے کو تھیں۔
"اور ہاں بات سنو۔" میاں جی نے باتھ روم جاتے جاتے پلٹ کے کہا۔ اشنا جو مرے مرے انداز میں بیڈ روم کے دروازے تک آئی تھی فوراً اسی آس میں مڑ کے جی بولا شاید ارادہ بدل گیا ہو۔ اور جان بچ جائے کچن میں جانے سے۔
"وہ یار پہلے میں اکیلا تھا تو آفس والوں کے ساتھ ان کا لنچ شیئر کر لیتا تھا اب تم ایسا کرنا 2,3 لوگوں کا لنچ بھی بڑھا دینا۔ آخر معلوم تو ہو سب کو سفیان بھی اب بیوی والا ہو گیا ہے۔" میاں جی جیسے صور پھونک کے باتھ روم میں چلے گئے اور اشنا کے کانوں میں سعدیہ ہی کی آواز گونج رہی تھی۔
"اکلوتے ہیں نو سسرال نو کچن۔" بھابی نے یہ تو بتایا نہیں تھا آفس لنچ جاتا ہے۔

☆......



عائشہ ذوالفقار

سلسلے وار ناولٹ

اُڑ جا اب تیری باری ہے

"کہاں گم ہے۔ چائے کب کی ٹھنڈی ہوگئی۔" سلمان اس کے آگے پڑے چائے کے کپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ حارث نے چپ چاپ کپ اٹھالیا۔

"کیا بات ہے، پریشان ہے۔" سلمان نے پوچھا۔

"نہیں بس ایسے ہی۔" اب اسے کیا بتاتا۔ وہ ابھی ابھی عمیر راؤ کی جانب سے Get well soon کے دو کارڈز وصول کر کے بیٹھا تھا۔ دل اداس ہوا جارہا تھا۔

"کچھ تو ہے، بتادے۔ بوجھ ذرا کم ہوجائے گا۔" سلمان بھی آخر اس کا دوست تھا۔

"بس یار! حائقہ کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ اچانک آنکھ کھلی اور خواب ٹوٹ گیا۔" حارث کی آواز خالی خالی ہو رہی تھی۔



''ابھی تو شروعات بھی نہیں ہوئی تھی سلمان! ابھی تو میں نے خوش ہونا سیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ بہت ہو گیا عمیر کا راج۔ بہت حکومت کرلی اس نے، اب شاید میری باری ہے۔ حائقہ کی صورت میں ایک کرن ملی تھی کہ شاید اب میں اس اکیڈمی کو اس کا وہ مقام دلا سکوں گا جو کئی سال پہلے ختم ہو گیا تھا مگر......'' حارث نے گرنے کے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔

''مگر سب کچھ سوچوں میں ہی رہ گیا۔ خیال سے حقیقت بن ہی نہ سکا۔'' سلمان نے ایک لمبی سانس بھری۔

''شاید ابھی ہمارا وقت ہی نہیں آیا تھا حارث! شاید ہم نے غلط وقت کو صحیح سمجھ لیا۔'' حارث نے ہولے سے سرہلایا۔

''نہیں سلمان! ہمارا وقت آیا تھا لیکن شاید عمیر کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لیے آکے جلد ہی چلا گیا۔ عمیر کا راج ابھی باقی ہے۔ ابھی اور بادشاہت کرنی ہے اسے، اس کا وقت ختم ہوگا تو ہمارا آئے گا۔'' سلمان آگے کو ہوا۔

''اور اس کا وقت کب ختم ہوگا۔'' حارث نے کندھے اچکائے۔

''خدا جانے، پر ابھی تو ہوگا ہر عروج کو زوال آتا ہے۔ اسے بھی آئے گا اسی امید پر تو اب تک ڈٹا ہوا ہوں

قسط نمبر 5

میں، ورنہ اندر سے تو کب کا ختم ہو چکا، کب کا مر چکا۔" حارث نے گھٹنوں میں آیا پانی صاف کیا تھا۔



کئی دن لگ گئے مجھے اس خالی پن سے نکلنے میں، عالیہ اور میڈم ثمینہ دونوں کا رویہ بہت بہتر ہو گیا۔ وہ بے شک عمیر کی والدہ تھیں مگر زمانہ شناس تھیں۔ اپنے بیٹے اور میرے شوہر میں فرق اچھی طرح سمجھ چکی تھیں۔ اس دن میں برتن دھو رہی تھی۔ جب عالیہ نے بتایا کہ F.sc کا رزلٹ آ گیا ہے۔ اسی نے مجھے عارش کے مارکس بتائے۔ 92% میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس رات کے بعد میں آج پہلی بار ہنسی تھی۔ F.sc کے رزلٹ کے پانچ دن بعد انٹری ٹیسٹ کا رزلٹ بھی آ گیا۔ کلیئر نہ ہونے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اس رات میں نے ہمت کر کے خود عمیر سے بات کی۔

"عمیر! میرے اکاؤنٹ میں ڈھائی لاکھ روپے ہوں گے اس وقت، مجھے ایک بار عارش سے ملوا دیں، میں اسے سب سمجھا دوں گی۔ فرسٹ ایڈمیشن تو ہو ہی جائے گا اس کا آگے پھر دیکھا جائے گا۔" مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ میں اس شخص سے بات کر رہی تھی جس کے دل میں میرے لیے صرف ایک جذبہ تھا نفرت کا۔ جس کی زندگی کا اب صرف ایک ہی مقصد تھا۔ مجھے اذیت دینا۔ میں اس شخص کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کر رہی تھی جس کے نزدیک میری ہی کوئی وقعت نہ تھی تو میری خواہش کی کیا ہوتی اب بھی اس نے کوئی نوٹس نہ لیا۔

"ملوا دیں گے ناں مجھے عارش سے۔" میں نے کوئی جواب نہ پا کے دوبارہ پوچھا تھا۔ عمیر نے قہر بار نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"بس اس کے بعد اور کچھ نہیں کہوں گی۔" میں نے سہم کر کہا تھا۔ وہ چند لمحے میری طرف دیکھنے کے بعد منہ دوسری طرف کر کے لیٹ گیا۔ میں چپ بیٹھی رہ گئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس نے مجھے چوتھی مرتبہ مارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگلے دن تقریباً عصر کے وقت مجھے عالیہ نے آ کر بتایا کہ عارش آیا ہے۔

"عارش!" خوشی کی انتہاؤں کو چھوتی ہوئی میں بھاگ کر نیچے آئی تھی۔ عارش ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں کوشش کے باوجود اس کے چہرے پر خوشی نہ کھوج پائی، اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید رو کر آیا تھا۔

"عارش! میرے پاس پیسے۔" میرے بولتے ہی اس نے انگلی اٹھا کے مجھے خاموش کروا دیا۔

"پتا ہے حاری! اس رات جب ابو جی تجھے مار رہے تھے ناں مجھے بہت دکھ ہوا تھا۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد بھی مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ تو نے وہ سب کیا ہے۔ جب تیرا خون نکلا تھا تب بھی مجھے بہت دکھ ہوا۔ جب ابو جی نے زبردستی تجھ سے سر عمیر کے پاؤں چومنے کو کہا۔ تب بھی میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ جب ابو جی تجھے گھسیٹ کے دروازے تک لے گئے تب میرا اتنا دل چاہا کہ انہیں روک دوں۔ انہیں کہوں کہ حاری نے کچھ نہیں کیا۔ جب ابو جی نے تجھے گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر دیا تو میں بہت رو یا حاری! میرا بہت دل دکھا۔" عارش کی آواز بھرا گئی۔ میں نے بمشکل اپنے آنسو روکے ہوئے تھے۔ نہ جانے وہ یہ سب کیوں کہہ رہا تھا۔

"لیکن پتا ہے حاری! سب سے زیادہ دکھ مجھے یہ دیکھ کر ہوا۔" اس نے صوفے پر پڑا ڈبہ میری طرف اچھالا تھا۔

"سب سے زیادہ میں اسے دیکھ کر رو یا حاری!" عارش اب بھی رو رہا تھا۔ میں نے تیزی سے ڈبہ کھولا۔ اس میں صرف راکھ بھری ہوئی تھی۔

"حاری! تو نے صرف ڈھائی لاکھ نہیں جلائے، تو نے مجھے جلا دیا۔" عارش کی بات میرے ہوش اڑا گئی۔ وہ

ذرا سی راکھ میرے ڈھائی لاکھ تھے۔ عمیر نے انہیں بھی جلا دیا اور راکھ عارش کو بھجوا دی۔ میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔ بے یقین آنکھوں سے اس راکھ کو دیکھتی رہ گئی۔

''حاری! میرا کیا قصور تھا۔ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ مجھ سے کس چیز کا بدلہ لیا ہے تو نے یہ بھجوا کے۔'' آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان عارش سے بولنا دوبھر ہو رہا تھا۔

''عارش! میری بات سن، میں نے نہیں جلائے یہ پیسے، میں کیوں کروں گی بھلا ایسا۔'' دکھ اتنا شدید تھا کہ مجھ سے بولا ہی نہ گیا۔''

''حاری! میں نے تو تجھے نہیں کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔ میں نے تو نہیں کی تھیں تیری منتیں تو نے مجھے زبردستی یہ خواب دکھائے تھے۔ تو نے مجھے زبردستی ہاتھ پکڑ کر اس رستے پر چلایا۔ تو نے مجھے بائیو رکھوائی۔ ابو جی اور اماں کی ایک نہ سنی۔ یاد ہے ناں میری ہر بات کے جواب میں تو کیا کہا کرتی تھی۔ عارش اور کچھ نہیں صرف ڈاکٹر......'' عارش پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں اسے چپ بھی نہ کروا سکی۔

''کہا تھا کہ مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔ میں نے تو نہیں کی تھیں تیری منتیں۔ تو نے مجھے زبردستی یہ خواب دکھائے تھے۔ تو نے مجھے زبردستی ہاتھ پکڑ کر اس رستے پر چلایا۔ تو نے مجھے بائیو رکھوائی، ابو جی اور اماں کی ایک نہ سنی۔ یاد ہے ناں میری ہر بات کے جواب میں تو کیا کہا کرتی تھی۔ عارش اور کچھ نہیں صرف ڈاکٹر۔'' عارش پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں اسے چپ بھی نہ کروا سکی۔

''پیچھے سے دھکا لگا کے تو نے مجھے میڈیکل کی طرف چلا دیا۔ میری آنکھوں میں صرف ڈاکٹر بننے کے خواب سجا دیے اور جب میں نے جان مار دی، میڈیکل کے علاوہ ہر رستہ اپنے اوپر بند کر لیا۔ ڈاکٹر بننا اپنا جنون بنا لیا۔ کنگ ایڈورڈ میں جانے کا رستہ ڈھونڈ لیا تو نے کیا کیا حاری۔'' میں ایکدم عارش کے قریب آئی تھی۔

''عارش میں نے کچھ نہیں کیا۔ خدا کی قسم میں نے کچھ نہیں کیا۔'' میں نے عارش کے دونوں بازو پکڑے تھے جنہیں اس نے بری طرح جھٹک دیا۔

''میں کل سے رو رہا ہوں حاری! ہر چیز مکمل ہے، ہر شرط پوری ہے، بتیسواں نمبر پر نام ہے میرا، K.E کا گیٹ کھلا ہے مگر میں نہیں جا سکتا جو کچھ تو نے کیا ہے اس کے بعد تو کوئی سیدھے منہ بات نہیں کرتا نہ کہ ادھار دے دے، جتنی نفرت آج تجھ سے ہو رہی ہے اتنی کبھی نہیں ہوئی تو مر بھی رہی ہو گی ناں تو معاف نہیں کروں گا تجھے۔'' عارش دونوں آنکھیں رگڑتے ہوئے بولا تھا۔

''عارش! میری بات سن، مجھے سچ میں نہیں پتا۔'' عارش نے مجھے دونوں کندھوں سے پکڑ کے جھنجھوڑ دیا۔

''بس کر دے حاری! میں اس دکھ سے مر گیا ناں تو قاتل ہو گی اور اگر نہ مرا تو ہر سانس کے بدلے تجھ سے صرف نفرت کروں گا، صرف نفرت۔ تیرے مرنے کے بعد تیری قبر بھی دیکھنے نہیں آؤں گا۔'' انتہائی نفرت سے کہتا وہ باہر نکل گیا تھا۔ میں اسے روکتی رہ گئی۔ آج ایک اور دفعہ درگور ہو گئی تھی میں۔

☆......☆

عارش پورے ڈسٹرکٹ کا ٹاپر تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اس کا انٹری ٹیسٹ کلیئر ہو گیا تھا۔ اس کے میڈیکل میں نہ جانے کی خبر واقعی بے یقین تھی۔ حمزہ نے تو باقاعدہ اسے اپنے پاس بلایا۔ اس کی اکیڈمی کی جان تھا وہ۔

''عارش! لوگ ترس جاتے ہیں یہ وقت پانے کے لیے کئی کئی سال ضائع کر دیے جاتے ہیں مگر دروازہ نہیں

کھلتا اور تم کھلے دروازے سے واپس پلٹ رہے ہو۔'' عارش کے آنسو نکلے تھے۔

''سر! شاید میری قسمت میں نہیں لکھا۔'' حمزہ نے سانس بھرا۔

''دیکھو عارش! میں ترس نہیں کھا رہا۔ کوئی احسان بھی نہیں کر رہا، میں کروا دیتا ہوں ایڈمیشن۔'' عارش نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں سر! اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی آپ اتنی بڑی بات کہہ رہے ہیں یہ بھی بہت ہے تھینکس بٹ نو......'' حمزہ نے سانس بھر کے اسے دیکھا۔

''حائقہ! نے کوئی رسپانس نہیں دیا۔'' عارش اس کی بات سن کے چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

''دیا تھا ڈھائی لاکھ روپے، جلا کے ان کی راکھ بھجوا دی ہے، بقول اس کے جب ہم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تو وہ کیوں کرے؟'' حمزہ اس کی بات سن کر دنگ رہ گیا۔

''یہ سب اس نے خود تم سے کہا؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں سر عمیر نے بتایا ہے۔'' حمزہ بول نہ سکا۔ کتنی عجیب بات ہے ناں کہ کبھی کبھی ہمیں سب کچھ ٹھیک پتا ہوتا ہے اور سامنے والے کو غلط لیکن پھر بھی ہم اسے ٹھیک نہیں سمجھا پاتے، حمزہ بھی سب کچھ سمجھ جانے کے باوجود عارش کو کچھ نہ سمجھا سکا، شاید عارش آج اس جگہ کھڑا تھا جہاں چند ماہ پہلے وہ خود کھڑا تھا۔ جب حارث سب کچھ ٹھیک جانتا تھا اور وہ غلط اور حارث کوشش کے باوجود اسے ٹھیک سے سمجھا نہیں پایا تھا۔

''سر! آئی وش کے کسی کی بہن ایسی نہ ہو۔'' حمزہ کو لگا جیسے وہ آنسو روک رہا ہو۔

''ورنہ نہ ہو۔'' کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

☆......☆

اس دن وہ حمزہ سے ملنے آیا تھا۔ حمزہ اسے دیکھ کے خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔

''آج میری یاد کیسے آ گئی؟'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ایک کام تھا تم سے، اس لیے آ گئی۔'' حارث ہولے سے ہنسا۔

''بولو......!'' حمزہ نے کہا۔

''سلمان آج کل یہاں ہے نہیں ورنہ میں تمہارے پاس کبھی نہ آتا، تمہیں شاید میری بات بری لگے بلکہ بہت بری لگے مگر تمہارے علاوہ اور کوئی نظر بھی نہیں آیا۔'' حمزہ آگے کو ہوا تھا۔

''بولو حارث!'' حارث نے ایک لمبا سانس لیا۔

''تمہیں تو پتا ہے کہ ناعمہ کی ڈیٹ فکس ہو گئی ہے۔ چھ دن بعد اس کی شادی ہے اس لیے میں اکیلا شاید مینیج نہ کر سکوں۔ تم سے ایک چھوٹی سی ریکویسٹ ہے کہ تم عارش کا ایڈمیشن کروا دو۔ جیسے ہی میں ناعمہ......'' حمزہ نے اس کی بات کاٹی۔

''حارث! وہ میرا سب سے اچھا اسٹوڈنٹ ہے، میرے چھوٹے بھائیوں جیسا، اللہ کا بہت شکر ادا کرتا ہوں میں کہ شروعات ہی عارش جیسے اسٹوڈنٹ سے ہوئی اس کے میڈیکل میں نہ جانے کا سن کے جتنا دکھ مجھے ہوا تھا میں بتا نہیں سکتا۔ تم سے پہلے ہی میں اسے یہ بات کہہ چکا ہوں۔'' حارث ایکدم چونکا۔

''پھر کیا کہا اس نے؟'' حمزہ نے اسے دیکھا۔

''منع کر دیا، شاید حائقہ کے ردعمل سے بہت زیادہ دکھی ہوا ہے وہ۔'' حائقہ کے ذکر پر حارث بری طرح چونکا۔

''حائقہ سے کب ملاوہ؟'' حمزہ نے چند لفظوں میں اسے ساری بات بتادی۔ حارث سن سا بیٹھا رہ گیا۔

''شاید وہ میری بات مان لیتا اگر یہ سب نہ ہوا ہوتا مگر وہ بہت زیادہ اپ سیٹ تھا۔ آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ حارث یار! میرا دل کٹ گیا اسے دیکھ کے۔'' حمزہ بولا۔

''حائقہ ایک طرف اس کا کیا دھرا ایک طرف۔ لیکن سزا عارش کو نہیں ملنی چاہیے تھی۔'' حارث چپ تھا۔

''حائقہ سے نفرت اس کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔'' حارث نے اس کی طرف دیکھا۔

''ایسے ہی ہوگا اب، ہر نفرت اب اس کے حصے میں ہی آئے گی۔ اس کے اپنے گھر والوں کی۔ تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی اور شاید عمیر اور اس کے گھر والوں کی بھی۔'' حارث وہاں سے اٹھ آیا۔

دعوے تو بڑے تھے اسے حائقہ سے محبت کرنے کے مگر آج تک اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ کسی ایک کے دل سے بھی اس کی نفرت نہیں مٹا سکا تھا۔ حمزہ کی دفعہ بھی اس نے بہت کوشش کی تھی، عارش کی دفعہ بھی وہ صرف کوشش ہی کر سکا۔

''عارش بیٹے! پلیز اس سے اتنی نفرت نہ کرو کہ جب اس کے داغ دھلیں تو تم نظریں نہ اٹھا پاؤ، وہ میری کچھ نہیں لگتی مگر پھر بھی میں اسے بے قصور مانتا ہوں۔ تمہاری تو سگی بہن ہے پھر کیوں یقین نہیں کرتے ہو اس پر۔'' عارش اس کی بات سن کے ہنسا تھا۔

''کیونکہ 92 فیصد مارکس لینے کے باوجود بھی میں کنگ ایڈورڈ نہیں جا سکا۔ صرف اس کی وجہ سے۔'' حارث چپ رہ گیا۔

''پوری زندگی پاکبازی کی زندگی گزارنے کے باوجود آج میرے ابو جی کسی کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ صرف اس کی وجہ سے۔'' عارش کی آواز بھر آئی تھی۔

''آج میری ماں اسے بیٹی کہنے سے ڈرتی ہے۔ صرف اس کی وجہ سے آج میں سر حمزہ کے سامنے نظریں نہیں اٹھا پاتا۔ صرف اس کی وجہ سے۔'' عارش کی باتوں کا اس کے پاس شاید کوئی جواب نہیں تھا۔

''اور سر! رہ گئی یہ بات کہ اتنا سب ہو جانے کے بعد بھی آپ اس پر کیوں یقین کرتے ہیں۔ تو سر میں نہیں جانتا کہ کیوں کرتے ہیں؟'' عارش آنکھیں رگڑتے ہوئے باہر نکل گیا۔ حارث نے بے جان ہو کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی۔ آج ہر فرد حائقہ سے نفرت کرتا تھا۔ اس کے والدین کے نزدیک وہ مر گئی تھی، عارش کے لیے وہ صرف قابل نفرت تھی۔ حمزہ کے گھر والوں کے نزدیک وہ گھٹیا پن کی انتہا تھی۔ حمزہ خود چاہے جتنا مرضی اپنے ظرف کو بلند کرتا مگر دل کے کسی کونے سے اس کی نفرت نکال نہیں سکا تھا۔ صرف وہ تھا جو اسے غلط نہیں کہتا تھا جو اسے بے قصور مانتا تھا۔ اس کی دو وجہ تھیں جس لڑکی کو اس نے پہلی بار ٹوٹ کر چاہا وہ حائقہ ارشد تھی اور جس شخص سے اس نے ٹوٹ کر نفرت کی وہ عمیر راؤ تھا جس کی وہ رگ رگ سے واقف تھا۔

☆......☆

بڑے بوڑھے کہتے ہیں۔ وقت ہر زخم کے لیے مرہم کی طرح ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے مندمل کر ہی دیتا ہے۔ لیکن میرے لیے وقت نشتر ثابت ہوا۔ رفتہ رفتہ مجھے ادھیڑتا ہی چلا گیا۔ میرے وجود کا کوئی حصہ نہ چھوڑا جہاں گھاؤ نہ ہو۔ جہاں سے خون نہ رستا ہو۔ جہاں درد نہ ہوتا ہو۔ عمیر نے پہلے دن سے مجھے مارنے کا جو کام اپنے سر لیا۔ اسے بخوبی نبھایا۔ اس نے مجھے ایک ہی دفع ختم نہیں کیا۔ ہزار بار ختم کیا میری روح تک چھلنی کر دی مجھے اس گھر تک محدود کر دیا۔ باہر کی دنیا سے میرا ہر رشتہ، ہر رابطہ ختم کر دیا۔ میرے خوابوں، امنگوں، خواہشوں

امیدوں اور ارمانوں کو کچل کر ختم کر دیا۔ ہر صبح کی پہلی کرن کے ساتھ وہ مجھے میری اوقات یاد کروا کے اٹھتا تھا اور ہر رات کے پہلے ستارے کے ساتھ ہی مجھے میری اوقات یاد کروا کے سوتا تھا۔ اس کی ذات کا پیار، محبت، رحم، انسیت، ترس نہ جانے کس کے لیے تھے۔ میرے لیے نہیں تھے۔ میرے لیے کیا تھا۔ اس کی ذات کی نفرت، بغض، دشمنی، ظلم، بے حسی، تنفر، بے رحمی یہ سب میرے لیے تھا۔ جو ہر روز ملتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس قید خانے میں میری پہلی سردیاں آ گئیں۔ عمیر کی مرضی ہوتی، دل چاہے تو بیڈ...... نہیں تو فرش۔ میں خدا خدا کر کے رات کاٹتی۔ میرے جسم پہ کوئی نیا کپڑا برداشت نہیں ہوتا تھا اس سے۔ میں خود ہی کہہ کر عالیہ کے پرانے کپڑے اور جرسیاں استعمال کرتی۔ سردیاں اپنے جوبن پہ آ گئیں۔ کینو کافی اور کمبل...... میرے لیے یہ تینوں چیزیں ہی پرانی ہو گئیں اور جیسے ہی سردیوں کا زور ٹوٹا، بہار نے ہر طرف قبضہ کیا۔ کینو کم ہونے لگے۔ کافی پھیکی لگنے لگی۔ کمبل تہہ ہونے لگے تو میرے وجود کا پہلا حصہ اس دنیا میں آ گیا۔ میری پہلی بیٹی...... جسے جنم دیتے میں ایک اور بار مر گئی۔

☆......☆

اس دن کوئی بھی گھر پہ نہیں تھا۔ تینوں اپنے اپنے سکول گئے ہوئے تھے۔ اچانک ہی درد اٹھا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ برداشت کرتے کرتے میری بس ہو گئی۔ نہ جانے کیسے میں خود کو گھسیٹتی ہوئی بیرونی دروازے تک آئی تھی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرہ چھانے لگا۔ دیوار کا سہارا لے کر میں خود ہی ایک طرف چلنا شروع ہو گئی اور چند قدم چل کے ہی گر گئی۔ تکلیف کی انتہا پہ پہنچ کہ میری آنکھیں بند ہوئی تھیں۔ نہ جانے کس نے مجھے نزدیکی اسپتال تک پہنچایا تھا۔ کوئی بھی نہیں تھا میرے پاس۔ بس مجھے اتنا یاد ہے کہ درد کی حدوں کو چھوتے ہوئے میں نے اللہ کے بعد عمیر کو پکارا تھا۔ پتہ نہیں کتنی دیر میں اسپتال میں پڑی رہی۔ ذرا ہوش آیا تو خود ہی اٹھنے کی کوشش کی شام ہو رہی تھی۔ اسپتال والوں نے ہی مجھے گھر تک پہنچایا۔ مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں جب میں اس چند گھنٹوں کے وجود کو آغوش میں لیے گھر میں داخل ہوئی۔ عمیر ادھر سے ادھر صحن میں چکر کاٹ رہا تھا۔ عالیہ سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ تیر کی طرح میری طرف آیا۔

''کہاں گئی تھیں تم......؟'' میرے بازوؤں میں چھپے وجود کو دیکھ کے اس کا اٹھا ہاتھ فضا میں ہی رہ گیا۔ میں نے شکوہ کناں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''بھائی میں نے کہا بھی تھا کوئی مسئلہ ہو گیا ہوگا۔'' عالیہ تیزی سے میری طرف آئی تھی۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے ہمدردی کرنے کی جاؤ اندر خود چلی جائے گی یہ اندر جب یہاں تک آ گئی ہے تو......'' عمیر نے اسے بازو سے پکڑ کے اندر دھکیلا تھا۔

''آپ بھی جائیں۔'' عالیہ کے پیچھے کھڑی ثمینہ راؤ کو بھی اندر جانے کا اشارہ کیا۔

''میری بس ہو گئی عمیر ابھی اور کتنا سہنا ہے مجھے سب کچھ تو چھین لیا تم نے۔ اب اور کیا بچا ہے میرے پاس؟'' بس وہیں گر گئی تھی۔

''بہت کچھ باقی ہے ابھی حائقہ ارشد! بہت کچھ......'' عمیر مجھے وہیں چھوڑ کے اندر چلا گیا۔ اندر تک میں خود آئی تھی۔ اور اوپر تک مجھے عالیہ نے پہنچایا۔

☆......☆

پھر بہار کو رفتہ رفتہ زوال آنے لگا۔ ہریالی ماند پڑنے لگی۔ رنگ کم ہونے لگے۔ آہستہ آہستہ گرمیوں نے پر پھیلانے شروع کر دیے۔ دوپہریں گرم ہونے لگیں۔ میری بچی کے ساتھ بھی میرے سے زیادہ بہتر سلوک نہ

ہوا۔ بس مجھے اتنا سکون تھا کہ عمیر کم از کم اس پر ہاتھ نہیں اٹھاتا تھا۔ عالیہ اور میڈم ثمینہ دونوں کا رد یہ نہ بہترین تھا۔ نہ بدترین تھا۔ وہ دونوں اگر مجھے کوئی سکھ نہیں دیتی تھیں تو دکھ بھی نہیں دیتی تھیں۔ عالیہ نے میری بیٹی کا نام ماریہ رکھا، ماریہ ثناء۔ نومبر میں عالیہ کی ڈیٹ فکس ہوگئی عمیر نے صرف اتنا کہا کہ بس شادی میں کم سے کم لوگوں سے ملوں۔ اپنا منہ بند رکھوں اور زیادہ بکواس نہ کروں۔ نہ جانے ان دونوں ماں، بیٹا نے میرے بارے میں کیا کچھ بتایا تھا عالیہ کے سسرالیوں کو بہرحال میں نے واقعی کوئی بکواس نہ کی۔ جیسے ہی گرمیوں کا زور ٹوٹا، خزاں، نے پھیلائے۔ آسمان پیلا ہونے لگا تو عالیہ اپنے گھر رخصت ہوگئی اس روز میں نے پہلی بار عمیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ بہت دیر تک عالیہ کو اپنے ساتھ لگا کر کھڑا رہا۔ میں اس دن بھی اس چار دیواری سے باہر نہ آئی۔ عالیہ کو دیکھ کر مجھے میرا وقت یاد آگیا۔ یہ جو کچھ عالیہ کو ملا تھا۔ یہ سب میرا نصیب بھی تھا۔ میرا بھی حق تھا کہ میری ماں مجھے ساتھ لگا کر روتی، میرا باپ میرے سر پہ ہاتھ رکھتا۔ میرا بھائی مجھے گاڑی تک آغوش میں لے کر جاتا۔ میں بھی دعاؤں میں رخصت ہوتی۔ پر مجھے ملا بھی تو کیا؟

''مر گئیں تم آج سے ہمارے لیے۔'' وہ رات میں نے عمیر کے بازوؤں میں سسکیاں لیتے ہوئے گزاری۔ اس نے بھی کچھ نہ پوچھا۔ پوچھتا بھی کیا؟ اسے کیا پتہ نہیں تھا۔

☆......☆

خزاں کے پیچھے پیچھے ہی سردیاں پھر لوٹ آئیں۔ سال ہوگیا مجھے قید تنہائی سہتے سہتے۔ یہ سردیاں تو بہت ہی مشکل سے گزریں۔ نہ عمیر رحم کھاتا نہ سردیاں رحم کھاتیں۔ میں اپنی تکلیف کو پی پی کر بے حال ہوجاتی۔ مجھے یاد ہے اس دن بھی شدید سردی تھی۔ میڈم ثمینہ اپنے کمرے میں تھیں۔ میں ماریہ کو ان کے پاس ہی سلا کر کچن میں آگئی۔ برتن دھونے والے تھے۔ اچانک مجھے باہر عمیر کی آواز آئی۔ عموماً وہ اس وقت گھر آتا ہی نہیں تھا۔

''کہاں ہے حائقہ؟'' انتہائی غصے سے بولتا وہ اندر آیا تھا۔ میں حواس باختہ سی کچن سے باہر نکلی۔ عمیر کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔

''کیا لینے آیا تھا یہ یہاں؟'' وہ اونچی آواز میں بولا۔

''کون......؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جسٹ شٹ اپ۔ اچھی طرح جانتی ہو تم کہ کون؟'' عمیر ایک دم میرے قریب آیا۔

''عمیر! مجھے نہیں پتہ کہ کون آیا۔'' میری آواز لبوں میں ہی رہ گئی۔ عمیر کے زناٹے دار تھپڑ سے میں دیوار سے ٹکرا گئی تھی۔

''تم نے بلایا تو وہ یہاں آیا ہے ناں۔ بھولی نہیں ہو ناں آج بھی اسے۔'' عمیر دھاڑا تھا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال حمزہ کا آیا۔

''حمزہ آیا تھا؟'' میں نے باریک سی آواز میں پوچھا۔ عمیر کا دوسرا تھپڑ میرے چودہ طبق روشن کر گیا۔

''حمزہ اس کی طرح بے غیرت نہیں ہے۔ دنیا جہاں کا گھٹیا پن صرف اسی میں ہے۔ اور ایک تم ہو اس جیسی۔''

''عمیر! پلیز خدا کا واسطہ پلیز رحم کریں۔ مجھے نہیں پتہ کون آیا تھا۔ میں نے کسی کو نہیں بلایا۔ پلیز میرا یقین کریں۔'' بغیر کوئی رحم کھائے۔ وہ میرے بدن پہ بیلٹ کے نشان ڈالتا چلا گیا۔ سخت سردی ٹھنڈا فرش، زخم میں تکلیف میں مرنے والی ہوگئی۔

''تمہاری خاطر تو میرے آگے ہاتھ بھی جوڑ لیے تھے اس نے بڑے دعوے کرتا تھا تم سے پیار کرنے کے۔ تمہاری خاطر ایک ایک کا دل صاف کرتا پھرتا ہے، سب پتہ ہے مجھے۔'' میڈم ثمینہ نے بمشکل اس کا ہاتھ روکا۔ میرے بدن پہ جگہ جگہ خون رسنے لگا تھا۔ ماریہ سہمی ہوئی دروازے کو پکڑے کھڑی تھی۔ میرے لبوں سے سسکیاں بھی نہ نکل سکیں۔

''دنیا میں جتنی نفرت مجھے حارث سے ہے نا۔ اتنی کسی سے نہیں ہے آئندہ یہاں نظر آیا ناں وہ تو کھال ادھیڑ دوں گا تمہاری۔'' ایک جھٹکے سے مجھے زمین پہ پھینکتے ہوئے وہ باہر نکل گیا تھا۔ میں بے جان سی وہیں گری رہ گئی۔ سہارا پا کر بھی اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔

''حارث آیا تھا۔'' میرے ذہن میں عمیر کی آواز گونجی۔

''حارث کو کب مجھ سے پیار ہوا۔ وہ کب گیا تھا عمیر کے پاس میری خاطر ہاتھ جوڑنے۔ اسے کیسے پتہ میں بے قصور تھی؟'' مجھے عمیر کی باتوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔

''میں نے تو نہیں دیکھا کبھی اس کی آنکھوں میں پیار......'' ذہن سوچے جا رہا تھا۔

''تم نے تو کبھی اس کی آنکھوں میں ہی نہیں دیکھا حائقہ پیار کیسے نظر آتا؟ نہ جانے دل کے کس کونے سے آواز آئی تھی۔ میں رات تک سنبھل نہ سکی۔ تکلیف ناقابل برداشت ہو رہی تھی اور فجر کی اذانوں کے ساتھ ہی مجھے ایک بار پھر جڑواں بیٹیوں کا تحفہ مل گیا۔



زندگی اور مشکل ہوگئی۔ صبح سے لے کر شام تک مجھے ایک لمحے کا بھی سکون نہ ملتا۔ عمیر کے رویے میں کوئی فرق نہ آیا۔ خدا خدا کر کے سردیاں ختم ہوئیں۔ ایک بار پھر بہار نے پر پھیلائے اور اس دن عالیہ نے مجھے فون کر کے بتایا۔ Pcs نے ٹیسٹ کی ڈیٹس اناؤنس کر دی تھیں۔ میرے اندر ایک بار پھر پرانی حائقہ جاگ گئی۔ وہ بائیس سال والا جنون ایک بار پھر زندہ ہوگیا۔ ایک بار پھر سر شوکت راؤ والی فزکس یاد آگئی۔ ایک بار پھر چار سو بچوں کی کلاس کو پڑھانے کا دل کرنے لگا۔ ایک بار پھر انگلیوں میں مارکر پکڑنے کا دل کرنے لگا۔ میں نے عمیر کی بہت منتیں کیں۔ اس کے قدموں سے لپٹ کر میں رو رو کر بے حال ہوگئی۔ اس کے تھپڑ سہہ لیے۔ اس کی دی ہر تکلیف برداشت کر لی مگر ضد کرنے سے باز نہ آئی۔ عالیہ نے مجھے میری رول نمبر سلپ بھی بھجوادی۔ میری ضد اور بڑھ گئی۔ ''عمیر! خدا کے لیے مان جائیں۔ خدا کا واسطہ میں نے بہت انتظار کیا ہے اس دن کا پلیز میری بہت پرانی خواہش ہے یہ۔ میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کالج دوبارہ جانے کا اب وقت آیا ہے تو مجھے نہ روکیں پلیز۔'' عمیر نے میری ایک نہ سنی۔ میں روتی رہ گئی۔ اسے ذرا ترس نہ آیا۔

''حائقہ! تم پاگل ہو گیا جو تمہیں اپنی مرضی سے سانس لینے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ وہ کالج جانے کی اجازت کیسے دے گا۔'' میڈم ثمینہ شائد اپنی جگہ درست تھیں مگر میں اپنے دل کا کیا کرتی جو روئے جا رہا تھا۔ ٹیسٹ والے دن عمیر نے مجھے اوپر کمرے میں بند کر دیا۔ میں دروازہ بجا بجا کر پاگل ہوگئی۔ کہنیوں سے خون رسنے لگا مگر عمیر کو ترس نہ آیا اسے کیسے ترس آتا؟ ترس تو ان پر آتا ہے جن کے لیے دل میں ذرا سی بھی محبت ہوتی ہے اور اس کے دل میں میرے لیے صرف نفرت تھی۔ بے تحاشہ نفرت میں رو رو کہ تھک گئی اور دن گزر گیا۔ دل رو رو کر خود ہی چپ کر گیا۔ عمیر نے شام تک دروازہ نہ کھولا۔ پورا دن بھوکی پیاسی رو رو کر مجھ پہ بے ہوشی سی طاری ہونے لگی۔ اور نہ جانے کب میری آنکھیں بند ہوگئیں۔

☆......☆

تقریباً رات کے دس بج رہے تھے جب وہ لاہور سے واپس آیا۔ آج اس کا Pcs کا ٹیسٹ تھا۔ لاؤنج کی لائٹ جلاتے ہوئے وہ کچن میں آیا۔ فریج سے بوتل نکالی اور پانی پینے لگا۔

''کیسا ہوا ٹیسٹ؟'' ثمینہ راؤ نہ جانے کب دروازے میں آ کے کھڑی ہوئی تھیں۔

''اچھا نہیں ہوا دیکھیں کیا بنتا ہے؟'' اس نے کرسی گھسیٹتے ہوئے کہا اور وہیں بیٹھ گیا۔ ثمینہ راؤ بھی اسے کھانا گرم کر کے دینے کے بعد وہیں بیٹھ گئیں۔ وہ چپ چاپ کھانا کھانے لگا ثمینہ راؤ چند لمحے اسے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔

''کیا تھا جو اسے بھی لے جاتے۔ سارا دن دروازہ بجا بجا کے روتی رہی ہے۔ اس نے کونسا لازمی پاس کر لینا تھا۔'' عمیر نے ایک نظر انہیں دیکھا۔

''اور اگر کر لیتی تو......؟'' اس نے پوچھا۔

''تو تمہارا کیا جاتا عمیر! کوئی شخص کسی کے حصے کا نہیں چراتا۔ سب اپنے اپنے حصے کا کھاتے ہیں۔'' عمیر نے ایک دم ان کی بات کاٹی۔

''ماما پلیز! مجھے دوسروں کا نہیں پتہ لیکن وہ میرے حصے کا ہی چھینتی ہے۔'' ثمینہ راؤ چپ ہو گئیں۔ عمیر نے کھانا ختم کر لیا۔

''جاؤ جا کر دیکھو کہ زندہ بھی ہے یا مر گئی۔'' وہ کھانے کے برتن اٹھاتے ہوئے بولیں۔

''زندہ ہی ہو گی۔ بہت ڈھیٹ ہے اتنی جلدی تھوڑی ناں مرے گی۔'' مسکراتے ہوئے وہ اوپر آیا۔ لاک کھول کے اندر آیا تو پورا کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے موبائل کی سرچ لائٹ آن کی اور نظر بیڈ پہ پڑی حائقہ کے چہرے پہ آ کے رک گئی۔ منظر نظر انداز کرنے والا تھا بھی نہیں۔ دائیں ہاتھ سے بائیں کندھے کو پکڑے وہ دوپٹے سے بے نیاز سمٹی ہوئی بیڈ پہ پڑی تھی۔ بال چہرے پہ گرے ہوئے تھے اور گالوں پہ آنسوؤں کی مٹی مٹی سی قطاریں اب بھی باقی تھیں۔ عمیر لائیٹ جلانا بھول گیا۔ ہولے ہولے چلتا ہوا اس کے عین سامنے آ بیٹھا۔ وہ ہولے سے کسمسائی تھی۔ عمیر نے جیسے کسی ٹرانس کے زیر اثر آہستہ سے اس کے چہرے پر سے بال ہٹائے اور...... بہت دیر تک نظریں نہ ہٹا سکا۔ نظریں تو وہ بہت دیر تک اس دن بھی نہیں ہٹا پایا تھا جب ٹریننگ کے پہلے دن یکھا تھا۔ جب ٹریننگ کے آخری دن دیکھا تھا۔ جب اسے اپنے سامنے روتے ہوئے دیکھا تھا جب اسے اپنے انتہائی قریب محسوس کیا تھا۔ جب اس کے پھول چہرے کو روتے دیکھا تھا۔ جب پہلی رات اس کی بھیگی آنکھوں کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ مانے یا نہ مانے۔ جادو تو اس پر بھی ہوا تھا۔ نظروں کے ارتکاز سے وہ دوبارہ کسمسائی اور عمیر کی بس ہو گئی۔ "How dare you to sleep without me." تم میرے بنا کیسے رہ سکتی ہو؟'' سرگوشی میں کہتے ہوئے اس نے ایک دم اسے دونوں بازوؤں میں بھرا تھا۔ حائقہ نے یکدم آنکھیں کھولیں۔ عمیر پاگل ہوا جا رہا تھا۔ حائقہ اس کی سانسوں کی شورش سے ہار سی گئی۔

''عمیر میں نے واپس وہاں جانا تھا۔'' وہ کہتی ہوئی عمیر کی دھڑکنیں اوپر کر گئی۔

''وہ میری لیب تھی عمیر وہ میری جگہ تھی۔'' عمیر نے اسے مزید بولنے ہی نہ دیا۔ اسے اپنے اندر گم کرتا چلا گیا۔

☆......☆

بہار کو مار بھگا کے گرمیاں ایک بار پھر حکومت کرنے لگیں۔ میں نے خود کو وقت کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا۔

ماریہ نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ عالیہ بھی کبھار چکر لگا لیتی۔ گرمیاں ختم ہوتے ہی ساون شروع ہو گیا۔ ہر طرف بوندیں، ہر طرف بارش...... پتے جیسے ہی پیلے ہو کر جھڑے۔ میری گود میں ایک اور بیٹی آ گئی۔ قدرت کو بھی رحم نہ آ رہا تھا۔ میں اس رات عمیر کے قدموں میں گر گئی اس کے پاؤں پر گرے ہوئے اپنے آنسوؤں سے گیلے کرتے ہوئے۔ منتیں کرتے ہوئے میں بے حال ہو گئی۔ ''عمیر! خدا کا واسطہ بس کر دیں۔ میں مر گئی ہوں اندر سے عمیر اب بس کر دیں چار بیٹیاں ہو گئی ہیں اب رحم کر دیں مجھ پر۔'' پر عمیر کو رحم کہاں آتا تھا۔

''ایک بیٹا دے دو بس۔'' مجھے پاؤں سے پیچھے کرتے ہوئے بولا۔ جیسے بیٹا دینا میرے بس میں تھا اور عمیر کو بیٹے سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اسے صرف میری موت چاہیے تھی۔ ایڑیاں رگڑ رگڑ کے سسکتی ہوئی موت، بے رحم سردیاں پھر لوٹ آئیں۔ میں حد سے زیادہ بیمار ہو گئی منہ سے تھوک کے ساتھ خون بہنے لگا۔ موت میری نظر دل کے سامنے سے ہو کر پلٹ گئی۔ اسے بھی مجھ پر ترس نہ آیا۔ فروری میں میڈم ثمینہ کی پروموشن ہو گئی سردیوں کے بعد بہار اور پھر سے لمبی، سلگتی گرمیاں اگست کے آخر میں قدرت نے پھر امتحان لے لیا۔ جڑواں بیٹیوں کو دیکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پتہ نہیں مجھ سے کیا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ جس کی سزا ختم ہونے میں ہی نہ آ رہی تھی ایسی کونسی سنگین غلطی ہو گئی تھی مجھ سے جو اللہ کو رحم ہی نہ آ رہا تھا۔

کہتے ہیں پروردگار کسی پر اس کی اوقات سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اب نہ جانے بوجھ زیادہ ہو گیا تھا یا شاید میری اوقات ہی اتنا بوجھ سہنے کی تھی۔ نہ جانے کب یہ سزا ختم ہونی تھی۔ نہ جانے کب یہ عذاب ٹلنا تھا میں نے تو رو رو کر معافیاں بھی مانگیں۔ اپنی دعائیں لمبی سے لمبی کرتی چلی گئی۔ طاق راتوں میں گڑگڑاتی سخت سردیوں میں تہجد پڑھ کے ماتھا رگڑا۔ لبوں پر بس ایک ہی جملہ ہوتا۔ ''اللہ مجھے معاف کر دے۔ میری آزمائش ختم کر دے۔''

وقت گزرتا چلا گیا۔ میڈم ثمینہ کی وجہ سے میری بڑی بیٹیاں اسکول جانے لگیں۔ بارشیں ختم ہوئیں تو ظالم سردیاں ایک بار پھر لوٹ آئیں۔ مجھے برے طریقے سے شدید قسم کا نمونیا ہو گیا۔ آنکھیں کئی کئی انچ اندر اتر گئیں۔ خود کو آئینے میں دیکھتی تو خوف آتا، رو رو کر سردیاں ختم ہوئیں، موسم ذرا بدلا تو مجھے سکون آیا۔ گرمیاں شروع ہوئیں تو خون کی الٹیاں آنے لگیں۔ بمشکل عمیر کی منت سماجت کر کے میڈم ثمینہ مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ رپورٹس دیکھ کر میں سن رہ گئی۔

ابھی تو شاید تکلیفوں کا ایک لمبا دور باقی تھا۔

ابھی مزید بہت امتحان باقی تھے۔

ابھی کہاں معافی ملنی تھی مجھے۔ شاید جرم ہی بہت سنگین تھا۔ مجھے بلڈ کینسر ہو گیا تھا۔

☆......☆

اس دن عالیہ کی ڈلیوری تھی۔ میڈم ثمینہ، عمیر کے ساتھ اسے دیکھنے اسپتال چلی گئیں۔ عمیر باہر سے دروازہ لاک کر گیا تھا۔ میں نے ہولے ہولے سارے کام نمٹائے۔ فارغ ہوئی تو تقریباً بارہ بج رہے تھے۔ جڑواں بیٹیوں کو گود میں لیے میں لاؤنج میں آ گئی۔ دونوں سو گئیں۔ انہیں صوفے پر لٹاتے ہوئے اچانک میری نظر ٹیلی فون ڈائری کے ساتھ پڑے بورڈ مارکرز پر پڑی۔ وہ یقیناً عمیر کے تھے۔ دل ایک دم چمک گیا۔ میں نے بہت کوشش کی خود کو روکنے کی مگر قدم ان کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ لرزتی انگلیوں سے میں نے دہ مارکر اٹھایا تھا۔ عجیب سا لگا۔ بہت عرصہ ہو گیا تھا انگلیوں سے اسے جدا کیے۔ میں ہولے ہولے چلتی ہوئی لاؤنج کی گلاس وال کے بالکل سامنے باہر کی طرف آ گئی۔ گیٹ کا سارا منظر اس میں واضح نظر آ رہا تھا۔ چند لمحے یونہی کھڑے رہنے

کے بعد میں نے مارکر کا ڈھکن کھولا۔ دل عجیب سے انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔ مارکر سیدھے ہاتھ کی انگلیوں میں دبا کے اس کی نوک میں نے گلاس وال سے لگائی۔ ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ کچھ یاد ہی نہ آیا۔ میں دھک سے رہ گئی۔ کیا واقعی میں سب بھول چکی تھی۔ آنکھوں کو یقین نہ آیا تو بے یقینی سی ہو کر بند ہو گئیں۔

وہ کیا چند دنوں کا سبق تھا جو میں بھول جاتی۔

ابو جی کی جھڑکیاں تھیں جو میں بھلا دیتی۔ وہ کیا کوئی حادثہ تھا جو میں چند دن ذہن میں رکھ کر محو کر دیتی۔

نہیں..... وہ میرے سولہ سال تھے۔ رل رل کے کندن کیے سولہ سال۔ وہ کوئی سبق نہیں تھا۔ کوئی کہانی نہیں تھی۔ کوئی افسانہ نہیں تھا جو میں بھول جاتی۔

وہ تو فزکس تھی۔ میرے خون میں شامل، میری سانسوں میں گھلی۔ میرا پہلا عشق..... کیسے بھول سکتی تھی میں۔

سولہ سال لمحوں میں زندہ ہو کے میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ میں نے یکدم آنکھیں کھولیں، مارکر چلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں لکھتی چلی گئی۔ گلاس وال سیاہ ہوتی جا رہی تھی۔ میری آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگیں۔ آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے۔

آنسو رکنے میں نہیں آ رہے تھے۔ میری تینوں بڑی بیٹیاں حیرت سے کھڑی مجھے دیکھ رہی تھیں۔

میرا پورا وجود کانپنے لگا۔ پوری گلاس وال سیاہ ہو چکی تھی۔ پیچھے کا منظر نظر آنا کم ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے لگا جیسے گلاس میں کسی کا عکس ہلا ہو۔ آنسوؤں کے درمیان آنکھیں پھاڑ کے میں نے غور سے گلاس وال میں دیکھا تھا۔ مارکر ایکدم رک گیا۔ عمیر نہ جانے کب میرے پیچھے آ کے کھڑا ہوا تھا۔ نہ جانے کب سے میرا پاگل پن دیکھ رہا تھا۔ مارکر میری انگلیوں سے گر گیا۔ بمشکل میں پیچھے کو مڑی تھی۔ عمیر بے یقین نظروں سے کبھی مجھے دیکھتا اور کبھی سیاہ ہوئی گلاس وال کو۔ میں ایکدم وہیں فرش پر گری تھی۔

''میرے دل سے کیسے نکالو گے یہ سب..... کیسے؟'' میں نے روتے ہوئے کہا تھا۔ عمیر بول نہ سکا۔

☆......☆

اور اس دن کے بعد مجھ پر جو دور آیا اس کا ایک ایک لمحہ گزرے ایک ایک سال کے برابر تھا۔ دسمبر نے آتے ہی ساتویں بیٹی کا تحفہ دے دیا۔ چھ بیٹیوں کے ساتھ گزارے چار سال ایک طرف اور ساتویں بیٹی کے ساتھ گزرا پانچواں سال دوسری طرف۔ وہ پھر بھی بھاری تھا مجھے سانس لینا دوبھر لگنے لگا۔ عمیر نے بات کرنا تو چھوڑ ہی دیا صرف تھپڑ، صرف ٹھڈے، صرف مار..... میں شکل سے بے شکل ہو گئی۔ بال سفید ہوتے چلے گئے۔ خون نچڑتا چلا گیا۔ رنگ ہلدی اور آنکھیں کئی کئی انچ اندر اتر گئیں۔ چہرے اور جسم پر نیل کے نشان جیسے مستقل ہو گئے۔ میں عمیر سے بات کرتے ہوئے بھی رو پڑتی۔ رو رو کے آنکھیں سوج گئیں۔ مستقل بخار جیسی کیفیت رہنے لگی۔ کھانسی کے دورے پڑنے لگے۔ بے خوابی کا مرض الگ سے لاحق ہو گیا۔ بلڈ پریشر انتہائی لو رہنے لگا اور کینسر رفتہ رفتہ بڑھتا ہی گیا۔

واقعی موت کی سزا تو بہت آسان ہے۔ عمیر نے میرے لیے یہ کی چنی میں پانچ سال جی جی کر مرگئی۔ ہر رات سونے سے پہلے وہ مجھے قبر میں اتار دیا اور صبح اٹھ کے واپس باہر کھینچ لیتا۔ دوبارہ سے درگور کرنے کے لیے۔

ان پانچ سالوں میں عمیر نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا۔ سب کچھ۔

عارش نے رونے دھونے کے بعد بی ایس سی میں ایڈمیشن لے لیا۔ شروع شروع میں تو دل ہی نہ لگا۔ کتابوں کی شکل دیکھنے کو ہی دل نہ کرتا، یونہی بیٹھے بیٹھے رونا آجاتا۔ جس چیز کے لیے آپ کوشش ہی نہیں کرتے اس کے نہ ملنے کا غم بھی زیادہ نہیں ہوتا لیکن جسے حاصل کرنے کے لیے انسان جان مار دے اور وہ چیز حاصل ہو کے لاحاصل ہو جائے۔ اس کے لیے غم بہت چھوٹا لفظ ہوتا ہے۔ عارش بھی بی ایس سی کرتے ہوئے سو سو بار مرا اور سو سو بار جیا۔ بی ایس سی اچھے نمبروں سے پاس کرنے پر اسکالرشپ ملی تو بیسک سائنس میں ایم ایس سی کرنے کی بجائے اس نے ایم ایس فوڈ سائنس میں ایڈمیشن لے لیا۔ وقت نے آہستہ آہستہ ان کے زخموں پر مرہم رکھ ہی دیا۔ رائل اکیڈمی عروج پر جا پہنچی۔ جہاں فزکس، وہاں سر عمیر راؤ۔ مگر عمیر کی بادشاہت کے سائے میں بھی حارث نے دی اسٹار اکیڈمی کو قائم رکھا۔ ناعمہ اور نمرہ کی شادیاں ہوگئیں تو ماں باپ نے اسے بہت زور لگایا مگر اس کا ایک ہی جواب ابھی نہیں اور شاید کبھی نہیں۔ حمزہ نے بھی پہلی محبت کو بھولنے میں پانچ سال لگا ہی دیئے اور پھر بیمار ماں کے انتہائی مجبور کرنے پر شادی پر راضی ہوا۔

☆......☆

اس دن میں اور میڈم ثمینہ لاؤنج میں بیٹھے عالیہ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے جب عمیر اندر داخل ہوا۔ میں اسے دیکھ کے ایک دم کھڑی ہوگئی۔ اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ میڈم ثمینہ کا سیل فون بجا تو وہ اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ عمیر چند لمحے یونہی مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔

"حائقہ! ایک بات بتاؤ۔ کیا ملا تمہیں مجھ سے پیار کر کے۔" میں اس کی بات کا فوری جواب نہ دے سکی۔

"کیا ملا تمہیں فزکس میں ایم ایس سی کر کے حارث کے کہنے پر دی اسٹار جوائن کر کے، سر شوکت راؤ کی جگہ کھڑے ہونے کے خواب دیکھ کے۔ ون اینڈ اونلی ہونے کے خواب دیکھ کے۔" وہ بولتا جا رہا تھا۔

"بولو! چپ کیوں ہو؟ کیا ملا تمہیں خوامخواہ میرے آگے کھڑے ہو کے میرے رستے کی رکاوٹ بن کے میری ذات پر انگلی اٹھا کے۔" مجھے لگا جیسے کچھ ہونے لگا ہو مگر کیا؟

بہت آرام سے میں نے تمہیں اس دن کہا تھا کہ میرے رستے میں مت آؤ۔ لیکن تم نہیں مانیں۔ پھر میں نے حارث سے کہا کہ تمہیں سمجھائے اس نے بھی میری بات ایک کان سے سن کے دوسرے سے نکال دی۔ کیا ملا تمہیں چند ماہ کے لیے اس کا ساتھ مل کر بولو۔ کیا ملا تمہیں کچھ عرصے کے لیے اتنا اونچا اڑ کر۔ مجھ سے الجھ کر۔ میرے حصے کا آسمان چھین کر۔ میری منزل میں حصے دار بن کر۔" عمیر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ دونوں انگلیوں سے میرا چہرہ اوپر اٹھایا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر پھر بولا۔

"کچھ بھی نہیں ہے ناں کچھ بھی نہیں ملا تمہیں مجھ سے چند ماہ کی دشمنی مول لے کر آج کیا ہے تمہارے دامن میں۔ ایک ذرہ بھی نہیں۔ ایک قطرہ بھی نہیں جسے تم اپنا کہہ سکو۔ نہ تو یہ زمین تمہاری ہے جس پر کھڑی ہو اور نہ ہی یہ چھت جس کے نیچے کھڑی ہو۔ کہاں ہے تمہاری وہ عزت، وہ غرور، جس پر کوئی بھی لڑکی ناز کر سکتی ہے۔ کہیں بھی نہیں کہاں ہے تمہارے گزرے سالوں کا صلہ۔ کہیں بھی نہیں سولہ سالوں کی پڑھائی۔ کہیں بھی نہیں کہاں ہے میرے ساتھ گزارے پانچ سالوں کا صلہ؟" میں نے بھیگی آنکھوں سے نظر اٹھا کے عمیر کو دیکھا تھا۔

"وہ پڑا ہے۔" عمیر نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ میرا دل ایک دم ساکت ہوا۔ کیا تھا وہ شاید وہ جو نہیں ہونا چاہیے تھا۔

''آج بالکل خالی ہاتھ ہو تم حائقہ! بالکل خالی ہاتھ اور میں ایسا ہی دیکھنا چاہتا تھا تمہیں۔ بے آسرا بے سرو سامان۔'' میرے آنسو ٹوٹنا شروع ہو گئے تھے۔ آگہی حقیقت سے زیادہ خوفناک لگ رہی تھی۔

''ویسے تم یہ بھی نہیں کہہ سکتیں کہ میں نے پانچ سالوں میں تمہیں کوئی صلہ نہیں دیا۔ یہ تمہاری سات بیٹیاں میرا ہی دیا تحفہ ہیں ناں۔'' وہ ہولے سے مسکرایا۔

''آج اگر میں تمہیں آزاد کرتا ہوں تو کیا کرو گی؟ کہاں جاؤ گی؟ اپنے گھر...... بالکل نہیں تمہارا باپ تمہارے لیے دروازہ ہی نہیں کھولے گا۔ حمزہ کے گھر جہ چہ کیا منہ لے کر جاؤ گی۔ اس کے گھر والے تم پر تھوکیں گے بھی نہیں اور ویسے بھی۔ کل رات اس کا نکاح ہے تو رہ گیا تمہارا اون اینڈ اونلی ہمدرد، حارث اسی کے پاس جاؤ گی ناں مگر اسے اپنی دو شادی شدہ بہنوں کے ہنستے بستے گھر تم سے زیادہ عزیز ہوں گے۔ صرف ایک ویڈیو اور تم تو جانتی ہو کہ ہمارے معاشرے میں غلط ہمیشہ لڑکی ہی ہوتی ہے۔'' میں کسی درخت کی طرح ساکت کھڑی اس سے اپنے آنے والی زندگی کا فلسفہ سن رہی تھی۔

''پھر تم کرائے کا مکان ڈھونڈو گی۔ اکیلی لڑکی کو سات بیٹیوں کے ساتھ کون اپنا گھر دے گا۔ کوئی نہیں کہاں پڑھاؤ گی۔ کیسے پڑھاؤ گی۔ کون تم سے پڑھنے پر راضی ہوگا۔ کوئی نہیں پھر کیسے اپنا اور اپنی بیٹیوں کا پیٹ بھرو گی۔ دوسروں کے گھروں میں کام کر کے مگر تمہیں کام کون دے گا۔ کوئی نہیں۔'' اب کے وہ ہنسا تھا۔

''ہر رستہ بند ہوگا حائقہ! یہاں سے نکلنے کے بعد کہاں جاؤ گی۔ کیا کرو گی؟'' عمیر میرے سامنے آیا۔

''میں جانتا ہوں تب تم کیا کرو گی۔ تم مر جاؤ گی۔ کیونکہ اس کے علاوہ تمہارے پاس اور کوئی رستہ نہیں ہوگا۔ کوئی نہیں۔'' عمیر نے زور سے ہنستے ہوئے میز پر پڑے کاغذوں پر سائن کیے تھے۔ میں اسے روک بھی نہ سکی۔''

''میں عمیر راؤ بہ ہوش و حواس حائقہ ارشد کو طلاق دیتا ہوں۔'' مجھے ایک دم ہوش آیا۔ اندر آتیں میڈم ثمینہ بھی اس کے الفاظ سن چکی تھیں۔

''عمیر! رک جائیں خدا کے لیے رک جائیں۔ میں کیا کروں گی۔ خدا کا واسطہ اتنا بڑا ظلم نہ کریں۔ جو چاہے سلوک کر لیں۔ میں اف تک نہیں کروں گی۔ آواز تک نہیں نکالوں گی مگر ایسا نہ کریں۔'' میں اس کے قدموں سے لپٹ کے رو رہی تھی۔

''طلاق دیتا ہوں۔'' اس نے دوسری بار کہا۔ میں اونچی آواز میں روتے ہوئے میڈم ثمینہ کے پاس آئی تھی۔

''میڈم پلیز! انہیں روکیں میں کہاں جاؤں گی پلیز۔'' اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں عمیر کے لب تیسری بار بھی ہل گئے۔

''عمیر......!'' اونچی آواز میں کہتی ہوئی میں تیر کی طرح عمیر کی طرف آئی تھی اور اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھا مگر...... دیر ہو چکی تھی۔ اس نے جو کہنا تھا کہہ چکا تھا۔ ہولے سے اس نے مجھے پیچھے کو دھکیلا۔ میرے آس پاس کی دنیا یکدم خاموش ہو گئی۔

''صرف آج رات تک کا وقت ہے تمہارے پاس۔ صبح تمہاری شکل نظر آئی تو خود باہر پھینک دوں گا۔'' وہ مجھے کہتے ہوئے اوپر چلا گیا۔ میں اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کر سکی۔ میڈم ثمینہ بے یقینی کی سی صورت میں صوفے پر آ کر گر گئیں۔ میں ہولے سے وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ واقعی آج کیا تھا میرے پاس، کچھ بھی

نہیں۔ایک ذرہ بھی نہیں۔ ہر رستہ بند تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس لمحے میں سچ مچ مر گئی تھی۔

واقعی......!

ایسی ہی ہوتی ہے موت،

انسان بے جان ہو جاتا ہے۔

بے سروسامان ہو جاتا ہے۔

خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

آنکھیں کھلی رہ جاتی ہیں۔

زبان خاموش ہو جاتی ہے۔

جسم خالی ہو جاتا ہے۔

اور......

روح ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔

وہاں اس لمحے اس فرش پر دیوار کے ساتھ گرے ہوئے میں بھی مر گئی تھی۔

☆......☆

نہ جانے میری کون سی بیٹی روئی تھی۔ میں جیسے ہوش میں آئی۔ وہ مسلسل رو رہی تھی۔ ہلکا ہلکا اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں نے لاؤنج میں چاروں طرف نظر دوڑائی، سب سے چھوٹی بیٹی صوفے پر پڑی رو رہی تھی اور ماریہ اسے تھپک تھپک کے چپ کروانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں یکدم اٹھی کچن سامنے ہی تھا۔ میں بھاگ کے کچن میں آئی۔ ریک سے چھری کھینچی۔ واپس باہر آئی۔ ماریہ کو بازو سے پکڑ کے ایک طرف کیا اور چھوٹی والی کے گلے پر چھری رکھ دی۔

''جانتی ہو حائقہ! جس رات یہ ننھا وجود تمہاری گود میں آنے والا تھا ناں اس رات اس نے روتے ہوئے سات آسمانوں کے پروردگار سے پوچھا۔ میں زمین پر جا کے لوگوں سے باتیں کیسے کروں گی؟ پروردگار نے کہا۔ ''میں نے پہلے ہی ایک فرشتہ زمین پر بھیج دیا ہے۔ وہ تمہیں سکھائے گا یہ پھر روئی اور اس نے پوچھا۔ میں آپ سے دعا کیسے کروں گی۔ پروردگار نے کہا۔ فرشتہ تمہیں سکھائے گا۔ اس نے پھر کہا۔ مجھے کھانا کھانا کون سکھائے گا؟ پروردگار بولا۔ وہی فرشتہ۔ اس نے پھر پوچھا۔ میں روئی تو چپ کون کروائے گا۔ پروردگار نے پھر کہا۔ وہی فرشتہ۔ اس نے ہولے سے پوچھا۔ میں اس فرشتے کو کیسے ڈھونڈوں گی۔ تو پروردگار نے مسکرا کر کہا۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ زمین والے اس فرشتے کو ماں کہتے ہیں۔ میرے ہاتھوں سے چھری گر گئی۔ میں میڈم ثمینہ کو دیکھتی رہ گئی۔

''پھر اس نے آخری سوال پوچھا۔ اور اگر فرشتے نے مجھے مارا تو؟ حائقہ رب مسکرا دیا اور بولا وہ میرا دوسرا روپ ہے۔ ماں صرف پیار کرنا جانتی ہے۔

میں جیسے بے آواز رو رہی تھی۔ میڈم ہولے سے میرے قریب آئیں۔

''تکلیفوں اور مصیبتوں کے عروج پر بے بسی کی انتہاؤں پر دکھوں کی حدوں پر اندھیروں کے بام پر۔ ہمیشہ موت نہیں چنی جاتی حائقہ۔ ضروری نہیں ہے کہ قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر ہم زندگی اور موت میں سے موت ہی چنیں۔ زندگی بھی چنی جا سکتی ہے۔'' انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''آخر کیسے؟'' میں بے جان سی ہوکر فرش پر گر رہی تھی۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''کیا مطلب ہے کیسے حائقہ! تم اس نبی کی امتی ہو جس نے لہولہان ہونے کے باوجود اپنے دشمنوں کو صرف دعائیں دیں۔ اس پاک ہستی سے زیادہ تنہا تو نہیں ہو ناں آج تم، اس سے زیادہ تکلیفیں تو نہیں سہی ناں تم نے۔ پھر کیوں اتنی مایوس ہو رہی ہو۔ کیا ہوا جو گھر چھن گیا رشتے چھن گئے۔ کھڑے ہونے کے لیے زمین تو ابھی بھی ہے ناں سر پر نیلا آسمان تو ابھی بھی سلامت ہے۔ سانس لے رہی ہو زندہ ہو۔ بے شک نہ جیو اپنے لیے اپنے دجود کے ان ٹکڑوں کے لیے جیو۔ ثابت کردو کہ قبر میں اتر کے بھی جیا جا سکتا ہے۔'' وہ مجھے حوصلے پر حوصلہ دے رہی تھیں۔

''مگر کیسے کیا کروں میں؟'' میرے اندر کی حائقہ زندہ ہی نہیں ہو رہی تھی۔

''جب حضور پاک پر دکھوں اور تکلیفوں کی انتہا ہو گئی تھی تو جانتی ہو انہوں نے کیا کیا تھا...... ہجرت! اپنا شہر چھوڑ دیا تھا۔ مدینہ چلے گئے تھے لیکن ہمت نہیں ہاری۔ حوصلہ نہیں کھویا۔ اللہ پر یقین نہیں کم کیا اور صلہ کیا ملا؟ اسی شہر میں فاتح بن کر واپس آئے۔ تم اسی رسول کی امتی ہو حائقہ۔'' وہ مجھے رستہ دکھا رہی تھیں۔ میں نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

''چلی جاؤ یہاں سے۔ بہت گھٹن ہے تمہارے لیے اس شہر میں۔ سانس لینا مشکل ہو جائے گا۔ چھوڑ دو اس شہر کو۔ کہیں اور چلی جاؤ۔ شاید وہاں کی مٹی کو تم پر ترس آجائے۔'' میں نے ان کی طرف دیکھا اندھیرا چھانے لگا تھا۔

''اٹھو شاباش! عمیر تم سے سب کچھ چھین سکتا ہے۔ تمہاری ہمت اور حوصلہ نہیں چھین سکتا۔ جاؤ اپنا سامان لو اور خود فیصلہ کرو کہ کہاں جانا ہے۔'' وہ میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں اوپر آئی۔ عمیر شاید باہر کہیں گیا ہوا تھا۔ میں نے اپنے اور بچیوں کے کپڑے باندھے۔ بمشکل دو بیگ ہوئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ تھا ہی نہیں۔ سامان باندھ کے میں نے کاغذ اور پینسل اٹھائی۔ چند سطریں لکھیں اور چادر اٹھا کے نیچے آگئی۔

''تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔'' میں نے میڈم ثمینہ کے کمرے میں جھانک کر کہا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔

''کچھ قرضے باقی ہیں اب تک۔ جانے سے پہلے چکا دینا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے ہولے سے سر ہلایا تھا۔ میں باہر آئی تو عشاء کی اذانیں شروع ہو گئی تھیں۔ آسمان سیاہ بادلوں سے بھر گیا تھا اور ٹھنڈی ہوا آر پار ہو رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میں اس کے گھر تک پہنچی۔ دروازہ اسی نے کھولا اور مجھے دیکھ کے حیران رہ گیا۔

''حائقہ......'' اس کی حیرانی سے لبریز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''آپ کے چند منٹ چاہئیں بس۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ بہت دیر تک خاموشی رہی۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا۔

''آپ نے میرے لیے عمیر کے آگے ہاتھ کیوں جوڑے تھے۔'' میرے سوال پر وہ کافی دیر تک بول نہ سکا۔ خاموش سا بیٹھا رہ گیا۔ میں نے پہلی بار غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور زیادہ دیر تک دیکھ نہ سکی۔ وہاں کوئی ایک آدھ ندی نالہ ہوتا تو ناں وہاں تو محبتوں کے طوفان انگڑائیاں لے رہے تھے۔ میں نظریں جھکا گئی۔ وہ شاید مسکرایا تھا۔

''کیونکہ پتا نہیں کب کس لمحے تم سے محبت ہو گئی تھی۔'' میں سن رہ گئی۔

(جاری ہے)

ردا کی ڈائری

افشاں علی کی ڈائری سے

نوشی گیلانی کی نظم

بیٹیاں بھی تو ماؤں جیسی ہوتی ہیں
ضبط کے زور آنچل میں
روتے روتے ہنس پڑتی ہیں
ہنستے ہنستے دل ہی دل میں رو لیتی ہیں
خوشی کی خواہش کرتے کرتے
خواب اور خاک میں اٹ جاتی ہیں
سو حصوں میں بٹ جاتی ہیں
گھر کے دروازے پر بیٹھی امیدوں کے ریشم بنتے
ساری عمر گنوا دیتی ہیں
میں جو گئے دنوں میں ماں کی خوش فہمی پہ
ہنس دیتی ہوں
اب خود بھی تو عمر کی گرتی دیواروں سے ٹیک لگائے
فصل خوشی کی بوتی ہوں اور
خوش فہمی کی کاٹ رہی ہوں
جانے کیسی رسم ہے یہ بھی
ماں کیوں بیٹی کو ورثے میں
اپنا مقدر دے دیتی ہیں

روشنی فیصل کی ڈائری سے

سعود عثمانی کی غزل

نہ گل رہے نہ کبھی کوئی شاہ پارہ بنے
سوچ تو یہ ہے کہ اب چاک بھی دوبارہ بنے
عجیب فیصلہ تھا روشنی کے خالق کا
کہ جو دیا بھی نہیں تھا وہی ستارہ بنے
یہ کیسے لوگ ہیں مٹی کی لاٹھیوں کی طرح
نہ خود بنے نہ کسی اور کا سہارا بنے
اور اب تو خواہشِ نظارہ یہ بھی چاہتی ہے
یہ کائنات میرے سامنے دوبارہ بنے
ہم ایسے لوگ تو اپنے بھی نہیں بن پاتے
تو خوب سوچ سمجھ کر کوئی ہمارا بنے

ریما نور رضوان کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی غزل

سزا پر چھوڑ دیا جزا پر چھوڑ دیا
ہر اک کام ہم نے خدا پر چھوڑ دیا
وہ ہم کو یاد رکھتا ہے یا بھلا دیتا
اس کا کام تھا اس کی رضا پر چھوڑ دیا
اب اس کی مرضی بجھا دے یا جلا رکھے چراغ
ہم نے جلا کر ہوا پر چھوڑ دیا
اب اس کا یاد بھی کرتے تو کس طرح کرتے
یہ مسئلہ دعاؤں کا تھا ہم نے دعا پر چھوڑ دیا

مہوش جواد کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد کا کلام

نصف صدی ہونے کو آئی
میرا گھر اور میری بستی
ظلم کی آگ میں جل جل راکھ میں ڈھلتے ہیں

میرے لوگ میرے بچے
خوابوں اور سرابوں کے ایک جال میں الجھے
کٹتے مرتے جاتے ہیں
چاروں جانب لہو کی دلدل ہے
گلی گلی تعزیر کے پہرے
کوچہ کوچہ مقتل ہے
اور یہ دنیا
عالمگیر اخوت کی تقدیس کی پہرے دار یہ دنیا
ہم کو جلتے کٹتے مرتے
دیکھتی ہے اور چپ رہتی ہے
زور آور کے ظلم کا سایہ پل پل لمبا ہوتا ہے
وادی کی ہر شام کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوتا ہے
لیکن یہ جو خون شہیداں کی شامیں ہیں
جب تک ان کی لو میں سلامت
تب تک ان کی آگ فروزاں
درد کی آخری حد پر بھی یہ دل کو سہارا ہوتا ہے
ہر ایک کالی رات کے پیچھے ایک سویرا ہوتا ہے

شہلا گل سحر صالح کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

میں نے دل
اور زیست کی کتاب پر
ہر پھول ہر گلاب پر
پلکوں کی چلمن اور
ہر خواب پر
مانگ کی افشاں
اور مہندی رچے ہاتھ پر
تیرے نام کے ساتھ
اپنا نام لکھا تھا
مگر
حقیقت کس قدر تلخ ہے جاناں
کہ
آج!
تمہاری شادی کے کارڈ پر
تمہارے نام کے ساتھ
کسی اور کا نام درج ہے

خالدہ عارف کی ڈائری سے

صدف غوری کا کلام

جس نے میری قسم کھا کے
اپنی وفاؤں کا یقین دلایا تھا
اور کہا تھا
وقت بدل جائے گا
موسم بدل جائے گا
دنیا کی ہر چیز بدل جائے گی
مگر
میں نہ بدلوں گی
آج
وقت بھی وہی ہے
موسم بھی وہی ہے
دنیا کی ہر چیز وہی ہے
بس
دو دل بدل گئے
ایک اس کا
ایک میرا
اس کے دل میں میرا پیار نہ رہا
میرے دل میں اس کا اعتبار نہ رہا

......☆......

اشعار

کنول خان ___ ہری پور ہزارہ

ہستی بستی زندگانی میری
ہنستے ہنستے اجاڑ گیا کوئی

فرزانہ شوکت ___ کراچی

کچھ اور بڑھ گئے جو اندھیرے تو کیا ہوا
مایوس تو نہیں ہیں طلوع سحر سے ہم
مانا کہ اس زمین کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

ماریہ یاسر ___ کراچی

محبتوں کے ہوں دن ہزار
جیے گی یہ سو سال
اس کے لیے نہیں ایک دن
یہ تو چاہیے بے شمار

ماریہ علی ___ گوجر خان

ہم تو محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں فراز
ایک ہی شخص کو محبوب بنائے رکھا

نوشین مدثر ___ لاہور

کی محبت تو سیاست کا چلن چھوڑ دیا
ہم اگر محبت نہ کرتے تو حکومت کرتے

عانیہ نیازی ___ ربوہ

اور پھر یوں ہوا کہ ٹوٹ گیا
وہ جو اک رشتہ محبت تھا

مریم نواز ___ فیصل آباد

دیار نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو مری وحشتوں کا ساتھی ہو

اریشہ ___ کمالیہ

نہ رنگ وروپ کی طرح نہ خود خال کی طرح
وہ میرے من میں آبسا کسی ملال کی طرح
میں رستہ ہوں اور تمہاری یاد قافلہ ہے جو
گزر رہی ہے مجھ سے میرے ماہ وسال کی طرح

حوریہ صادق ___ حیدر آباد

اب یہ سوچوں تو بھنور ذہن میں پڑ جاتے ہیں
کیسے چہرے ہیں جو ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں
کیوں تیرے درد کو دیں تہمت ویرانی دل
زلزلوں میں تو بھرے شہر اجڑ جاتے ہیں

دھنک ناز ___ کراچی

کیوں چپکے سے وہ لوگ اتر جاتے ہیں دل میں
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے

مریم قادر ___ اسلام آباد

ہر کوئی روکے رکھائے ضروری تو نہیں
خشک آنکھوں میں بھی سیلاب ہوا کرتے ہیں

یمنیٰ ناصر ___ اوکاڑہ

سوچا کہیں کہ ٹوٹ نہ جائے کسی کا دل
گزری ہے اپنی عمر اسی دیکھ بھال میں
خالد وہ بات تو اب اسے یاد بھی نہیں
ہم جی کو خون کر گئے جس کے ملال میں

نگہت توقیر ________ چیچہ وطنی
گزرے سالوں کی طرح سب کچھ ویسا ہی ہے
بس اک تو نہیں تیرا احساس نہیں

رمنا راحیل ________ ملتان
کوئی اس طرح سے میرے ساتھ عداوت کرتا
قید کرلیتا مجھے اور حکومت کرتا
میں نے یہ کب کہا تھا کہ وہ سب کو چھوڑے
وہ اپنے انداز سے کرتا پر محبت کرتا

علیز ے، زارا ________ راولپنڈی
اداس لمحوں کا نہ کوئی ملال رکھنا
طوفان میں بھی وجود سنبھال رکھنا
کسی کے لیے شرط زندگی تم ہو
کسی کی خاطر ہی اپنا خیال رکھنا

نور بانو ________ کوئٹہ
آپ کی چاہت میں ہم زمانہ بھول گئے
آپ کے بعد کسی اور کو اپنانا بھول گئے
آپ سے محبت ہے یہ بتایا سارے جہاں کو
مگر آپ ہی کو بتانا بھول گئے

صبا سحر ________ ہارون آباد
مجھ کو بھی راس آیا نہیں دوسرا کوئی
اس کو بھی میرے بعد سہارا نہیں ملا
برسوں سے پھر رہا تھا میں جس کی تلاش میں
وہ مل گیا تو اس سے ستارا نہیں ملا

عفاف ________ گجرات
تم کیا جانو کیا ہے تنہائی
اس ٹوٹے ہوئے پتے سے پوچھو کیا ہے جدائی
یوں ہی بے وفائی کا الزام نہ دے جاناں
اس وقت سے پوچھ کس وقت تیری یاد نہ آئی

بشریٰ خان ________ لاہور
تیرے بنا ہم جینا بھول جاتے ہیں
زخموں کو سینا بھول جاتے ہیں
تو زندگی میں سب سے عزیز ہے ہمیں
تجھ سے ہر بار یہی کہنا بھول جاتے ہیں

اریبہ کامران ________ لاہور
بہت چاہا مگر انہیں بھلا نہ سکے
خیالوں میں کسی اور کو لا نہ سکے
اس کو دیکھ کے آنسو تو پونچھ لیتے
پر کسی اور کو دیکھ کے مسکرا نہ سکے

زہرہ مگسی ________ سکھر
اترا ہے میرے دل میں کوئی چاند نگر سے
اب خوف نہیں کوئی اندھیروں کے سفر سے
وہ بات ہے تجھ میں کہ کوئی تجھ سا نہیں ہے
اے کاش کوئی دیکھے تجھے میری نظر سے

حنا علی ________ ملتان
اب کے برس کچھ ایسی تدبیریں کرتے ہیں
مل کے اک شہر محبت تعمیر کرتے ہیں
کچھ خواب یقین کی سرحد پر آ پہنچے
آنکھ کھلنے سے پہلے ان کی تعمیر کرتے ہیں

ثناء حیات ________ کراچی
میں پتھر ہوں مگر سچ بولتا ہوں
وہ آئینہ ہے اور سچا نہیں ہے
صراطِ عشق پر مڑ کر نہ دیکھو
پلٹنے کا کوئی رستہ نہیں ہے

ملالہ اسلم ________ خانیوال
بڑا زعم تھا مجھے اپنی چاہت پر مگر
ٹوٹ کر بکھیر دیا کیونکہ وہ اپنے اختیار میں تھا

.......☆.......

اس ماہ میں

اس ماہ کی خوب صورت بات

زندگی توقعات کے پورا نہ ہونے اور غیر متوقع حادثات و واقعات کا سامنا کرنے کا نام ہے جب آپ درست ہوں تو کوئی بھی آپ کو یاد نہیں کرتا مگر جب آپ غلط ہوں تو کوئی بھی آپ کو بھول نہیں پاتا۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

اس ماہ کی کرنیں

☆ اپنی مسرت کے لیے دوسروں کی مسرت کو خاک میں نہ ملاؤ۔

☆ ایک اچھی کتاب انسان کا بہترین سرمایہ ہوتی ہے۔

☆ بڑا قد سے نہیں کیے گئے کام اور اس کے معیار سے ہوتا ہے انسان، سمجھ کا تعلق عمر سے نہیں احساس سے ہوتا ہے۔

☆ پرائے لوگ ہوں یا معاملے ان سے دور ہی رہنا چاہیے۔

☆ زیادہ باتونی شخص پڑھنے کی طرف کم توجہ دیتا ہے۔

☆ ہر اچھے اور برے شخص کو ہنس کر قبول کرنا چاہیے کیونکہ یہ ہمارے نصیب (قسمت) کی وجہ سے ہوتا ہے۔

☆ برائی اور برے اعمال دیمک کی طرح ہوتے ہیں باہر سے کچھ نہیں بدلتا اندر سے سب کچھ مٹی ہو جاتا ہے۔

☆ ہر شخص ایک ضخیم کتاب ہے بشرطیکہ آپ کو پڑھنا آتا ہو۔

دھنک ناز۔ کراچی

اس ماہ کے شگوفے

مریض ڈاکٹر سے۔ ”کوئی لمبی عمر کا طریقہ بتا دیں؟“
ڈاکٹر۔ ”شادی کر لو۔“
مریض۔ ”کیا اس سے عمر لمبی ہو جائے گی؟“
ڈاکٹر نہیں۔ ”یہ شوق ختم ہو جائے گا۔“

☆

بیوی۔ ”اگر میں مر گئی تو کتنے عرصے بعد شادی کرو گے؟“
شوہر۔ ”مہنگائی کا دور ہے بیگم لہٰذا میری کوشش تو یہی ہوگی کہ ”قل“ کے ساتھ ہی ”ولیمہ“ بھی ہو جائے۔“

☆

پٹھان۔ ”میں تم سے آئی لو یو کہوں تو کیا کرو گی؟“
لڑکی۔ ”خوشی سے مر جاؤں گی۔“
پٹھان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بولا۔
”جا میری بہن جی لے اپنی زندگی۔“

☆

لڑکی۔ ”آپ مجھے منگنی پر کیا دو گے؟“

سردار۔ ''جو آپ کہو گی۔''

لڑکی۔ ''رنگ دے دینا۔''

سردار۔ ''ٹھیک ہے پر ریسیو مت کرنا ورنہ بیلنس کٹ جائے گا۔''

صبا سحر۔ ہارون آباد

اس ماہ کی مزاحیہ غزل

یوں مزاح کہنے پر اس کو خوش گمانی اور ہے
یار سے رخ سے جھلکتی شادمانی اور ہے
شادیاں کرنے کا میرے یار کو اک شوق ہے
پہلے تھیں وہ مانیاں یہ مہارانیاں اور ہے
گال پچکے بانس کی مانند چلے جاتے ہیں جو
کہہ دو ان سے پیارے بچو! نوجوانی اور ہے
گٹکے کھا کر جو سمجھتے ہیں بڑے ہیں پہلوان
وہ کیا جانیں درحقیقت پہلوانی اور ہے
یاد ہے قصہ ہمیں بھی شیریں و فرہاد کا
آج کے لیلیٰ و مجنوں کی کہانی اور ہے
بے ملاوٹ شے نہیں جو بیچتے بازار میں
آج وہ ہی کہہ رہے ہیں بے ایمانی اور ہے
راز یہ کھلتا ہے جب سرکاری آفس میں ہو کام
چائے پینا اور ہے یہ چائے پانی اور ہے

شاعر: صدیق راز

انتخاب: ثناء ملک۔ کراچی

اس ماہ کا افسانچہ

وہ پہلی بار مجھے میری آنٹی کے گھر ملا تھا۔ پھر کالج کینٹین میں، وہ جہاں بھی ملتا مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا ہو۔ مجھے وہ بہت برا لگتا۔ اب تو وہ میرے گھر تک پہنچ گیا تھا میں بے چاری صنف نازک اپنی عزت کی وجہ سے کسی کو نہ بتا پاتی۔

ایک دن میں کچن میں چائے بنا رہی تھی کہ اچانک وہ میرے سامنے آ گیا مگر میں نے ہمت کر کے ساری بات اپنی امی کو بتا دی۔ امی دوڑی دوڑی کچن میں آئیں مگر لگتا تھا کہ وہ امی کے ڈر سے بھاگ گیا تھا۔

ایک رات میں نیند میں مدہوش تھی کہ اچانک میرے گال پر گدگدی ہوئی۔ میں ڈر کے اٹھی اور میری نظر اس پر پڑی۔ میرے کمرے میں موجود اور میرے بستر پر آخر وہ کر کیا رہا تھا؟ میں نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ میری چیخ سن کر میرے گھر والے دوڑے چلے آئے آخر ان سب کو ساری بات پتا چل گئی۔

پہلے تو انہوں نے مجھے خوب ڈانٹا مگر پھر اس ''کاکروچ'' کا خاتمہ کر دیا۔ وہ دن تھا اور آج کا دن میں اپنا بستر ہمیشہ جھاڑ کر سوتی ہوں۔

نوشین مدثر۔ لاہور

اس ماہ کی غزل

قصے میری الفت کے جو مرقوم ہیں سارے
آ دیکھ تیرے نام سے موسوم ہیں سارے
بس اس لیے ہر کام ادھورا ہی پڑا ہے
خادم بھی میری قوم کے مخدوم ہیں سارے
اب کون میرے پاؤں کی زنجیر کو کھولے
حاکم میری بستی کے بھی محکوم ہیں سارے
شاید یہ ظرف ہے جو خاموش ہوں اب تک
ورنہ تو تیرے عیب بھی معلوم ہیں سارے
سب جرم میری ذات سے منسوب ہیں محسن
کیا میرے سوا شہر میں معصوم ہیں سارے

کلام: محسن نقوی

انتخاب: ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان

اس ماہ کان کہیں جنہیں......!

انسان کے اہم ترین جسمانی اعضاء میں کان شامل ہیں۔ یہ سونے، ہیرے اور کوئلے کی کان والے نہیں بلکہ یہ وہ کان ہیں جن سے سنائی دیتا ہے۔ کان اگر نہ ہوتے تو علم کا حصول ناممکن ہوتا۔ بھئی آخر عینک کیسے لگائی جاتی۔ خواتین شادی بیاہ پر اس قدر بنتی سنورتی ہیں کان بھی سجاوٹ میں کم نہیں ہوتے۔ اس قدر بھاری بھاری بندے، جھمکے پہنتی ہیں کہ کان لٹک جاتے ہیں۔ جب یہ جھمکے اتارتی ہیں تو کان بکری کے کان جیسے لمبے ہوجاتے ہیں۔

جو لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے ان کے کان لمبے اور بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ جب وہ چھوٹے ہوتے ہیں اور اسکول نہیں جاتے بہانے بناتے ہیں اور جانے سے انکار کرتے ہیں تو ان کے والد انہیں کان سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اسکول لے کر جاتے ہیں۔ جب اسکول پہنچ جاتے ہیں تو پھر استاد بھی سزا کے طور پر اتفاق سے اسی کان سے پکڑ لیتا ہے اور خوب کھینچتا ہے۔ اس طرح ان کے کان لمبے لمبے خرگوش کی طرح سے ہوجاتے ہیں۔

اگر کان نہ ہوتے تو وہ بچے اللہ کا شکر ادا کرتے جو گھر سے ہوم ورک کر کے نہیں جاتے اور ان کو کان پکڑنے پڑتے ہیں۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے کوئی بات کہی جائے تو وہ ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے یا ان کے ذہن میں بات بٹھانے کے لیے پہلے ان کا موڈ ان کا دھیان ان کی دلچسپی دیکھنی چاہیے۔ بعض لوگوں کو اگر کوئی راز کی بات بتا دی جائے تو یہ باتیں ان کے کان میں پڑتے ہی ان کا پیٹ پھولنے لگتا ہے، جب تک وہ کسی کو بتا نہ دیں، ان کو چین نہیں آتا۔ اب قطعی طور پر یہ بھی نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ جن لوگوں کے پیٹ بڑے بڑے ہیں انہوں نے ابھی تک راز کی باتیں نہیں بتائیں اور وہ ابھی تک ان کے پیٹ میں ہیں۔

کہتے ہیں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کان ہوتے ہیں تو منہ، ناک، آنکھیں کیوں نہیں ہوتیں۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں کہ اگر ان کو کوئی بات بتائی جائے تو کہتے ہیں کہ میرے کان نہ کھاؤ، یہ بالکل غلط کہتے ہیں اگر ایسا ہوتا تو کئی لوگ کان کٹے ہوتے۔

کان، باتوں اور ارادوں کے امین ہوتے ہیں۔ اگر یہ اپنی ذمہ داری نہ نبھائیں تو دنیا میں فساد کھڑا ہو جائے۔ کانوں کے اندر ایسا پردہ موجود ہوتا ہے جو کبھی بھی نہیں ہٹتا۔ پتا نہیں اس کے پیچھے کون سا خوب صورت چہرہ چھپا بیٹھا ہے؟

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ انجیر کے فوائد

☆ رنگ نکھارنے کے لیے: رنگت نکھارنے کے لیے روزانہ نہار منہ تین دانے انجیر کا استعمال کریں۔ ایک ماہ میں رنگ نکھر جائے گا۔

☆ چہرے کے داغ: چہرے کے داغ دور کرنے کے لیے انجیر کے دودھ میں جو کا آٹا گوندھ کر داغ پر لگائیں۔ چند ہفتوں میں داغ دور ہوجائیں گے۔

☆ موٹاپا دور کرنے کے لیے موٹاپا جسم کا بھدا پن ختم کرنے کے لیے: نہار منہ تین دانے انجیر کھائیں چند ہفتوں میں بھدا پن زائل ہوجائے گا۔

☆ قبض دور کرنے کے لیے: قبض دور کرنے

کے لیے نہار منہ پانچ دانے انجیر کے کھائیں چند دنوں میں قبض دور ہو جائے گا۔

پتے کی پتھری: اس مسئلے کے لیے دس دانے انجیر نہار منہ دو ماہ تک استعمال کریں۔

گردے فیل ہونا: اگر زندگی اتنی مہلت دے کہ کچھ عرصہ انجیر کھا سکیں تو چند ہفتے انجیر کھائیں فائدہ ہوگا۔

بواسیر کا علاج: اس مرض کے لیے انجیر کو بہت مفید قرار دیا گیا ہے۔ اس مرض کے لیے نہار منہ تین ماہ تک چار دانے انجیر کھالیا کریں بواسیر کا مرض رفع ہو جائے گا۔

احتیاط: انجیر اور کھجور کبھی بھی ایک ساتھ استعمال نہ کریں۔

ریما نور رضوان۔ کراچی

اس ماہ کی ہری مرچیں

☆ کیبل کے سائے میں پلنے والے محمد بن قاسم یا ٹیپو سلطان نہیں بلکہ شاہ رُخ اور عامر خان بنیں گے۔

☆ جس شادی کی مووی نہ بن رہی ہو اُس شادی میں شریک لڑکیاں ایسے لگتی ہیں جیسے صدیوں کی بیمار ہوں۔

☆ عورت ایک جھوٹا آنسو بھی بہادے تو مرد قربان ہونے کو تیار ہو جاتا ہے، پھر بھی صنفِ نازک کو شکوہ رہتا ہے کہ مرد وفادار نہیں۔

☆ عورت کو زبان درازی کا طعنہ دینے والے اس کی ایک لمحے کی خاموشی پر تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔

☆ بھائی کے پاس بہن کے لئے وقت نہیں جبکہ دوسرے کی بہن کے لئے وقت ہی وقت ہے۔

☆ مرد ہر حال میں رعب ڈالنا چاہتا ہے خواہ باپ ہو، بھائی ہو یا خاوند۔

نور بانو۔ کوئٹہ

اس ماہ لفظوں کے موتی

☆ قدر کرو ان کی جو تمہیں بنا مطلب کے چاہتے ہیں۔ کیونکہ دنیا میں خیال کرنے والے کم اور تکلیف دینے والے زیادہ ہیں۔

☆ رب کو عبادت سے اور مخلوق کو اخلاق سے راضی رکھو۔ دنیا اور آخرت میں خوش رہو گے۔

☆ ایسے شخص کو کبھی مت گنوانا جس کے دل میں تمہارے عزت، پیار اور چاہت ہو۔

☆ جب قرآن پاک پڑھتے ہو تو شیطان کے سر میں درد ہوتا ہے اور جب تم قرآن پاک کھولتے ہو تو شیطان پریشان ہو جاتا ہے اور جب تم قرآن پاک پڑھتے ہو تو شیطان کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لیے قرآن پاک کی تلاوت کثرت سے کیا کرو۔

☆ اگر کسی کی یاد شدت اختیار کرلے اور تم اسے کبھی نہ بھلا پاؤ تو یہ تمہارا کمال نہیں۔ کمال اس کا ہے کیونکہ اس کے پیار اور خلوص میں کوئی ملاوٹ نہیں۔

فرح جواد۔ کھاریاں

اس ماہ کا فلسفہ

زندگی بند دروازہ ہی سہی مگر جو لوگ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے ان کے لیے یہ بند دروازہ کھلنے پر کبھی مایوسی نہیں لاتا پس اللہ کے فیصلوں پر مکمل اعتماد اور رحمت کا کامل یقین ہی تو زندگی گزارنے کا اصل مقصد ہے۔

انبرین حیدر۔ اسلام آباد

......☆......

نورین ملک



حضور اکرمؐ نے فرمایا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم کا ارشاد ہے کہ ''جو شخص آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس پر لازم ہے کہ اپنے ہمسائے کو تکلیف نہ دے اور اسے چاہیے کہ مہمان کا احترام کرے اور اسے چاہیے کہ بولے تو بھلائی کی بات کرے ورنہ خاموش رہے۔ (بخاری شریف)

تم لوگوں کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو تو مومن بن جاؤ گے۔ (ترمذی)

سیدہ نورین۔ کراچی

اپریل فول ڈے سے اجتناب

اپریل فول ڈے کے اس جھوٹے کام میں کسی طرح سے حصہ نہ لیں۔

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا۔ ''اور وہ جھوٹ میں شریک نہیں ہوتے اور جب بے ہودہ کام کے پاس سے گزرتے ہیں تو پہلو بچا کر گزرتے ہیں۔'' (الفرقان: 27)

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: ''آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر لایعنی (بے فائدہ چیز) کو چھوڑ دے۔ (ترمذی)

سیدھی اور اچھی بات

اللہ کا فرمان ہے۔ ''اور لوگوں سے اچھی بات کرو۔'' (البقرہ: 88)۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ ''اور جب (کسی کی نسبت) کوئی بات کہو تو عدل و انصاف سے کیا کرو۔'' (الاسرا: 152)۔

یہی وہ درست رویہ ہے جس کا انعام بتاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ اے اہل ایمان اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور بات بالکل سیدھی کیا کرو۔ اللہ تمہارے کاموں کو درست فرما دے گا اور تمہارے گناہ معاف فرما دے گا اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا تو وہ عظیم کامیابی سے ہمکنار ہو گا۔ (الاحزاب: 71-70)

ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان

باتوں سے خوشبو

☆ عمر بھی ضمیر اور جوتے کی مانند ہے ان کی موجودگی کا احساس اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ تکلیف نہ دینے لگیں۔

☆ محبت اعتبار کے بغیر کچھ بھی نہیں جب کہ اعتبار محبت کے بغیر بھی بہت قیمتی ہے۔

☆ جب ناخن بڑے ہو جاتے ہیں تو ناخن ہی کاٹے جاتے ہیں۔ انگلیاں نہیں بالکل اسی طرح جب رشتے داروں میں رنجش پیدا ہوتی ہے تو رنجش ختم کرنی چاہیے نہ کہ رشتے۔

☆ غلطیاں بے وقوف اور عقل مند دونوں سے ہوتی ہیں۔ فرق بس یہ ہے کہ ایک کو آخر تک

احساس نہیں ہوتا اور دوسرے کو فوراً ہو جاتا ہے۔

☆ جب کبھی دل بھر آئے تو رو لو جیسے آسمان پر چھائے ہوئے بادل برستے ہیں کیونکہ اس کا نتیجہ ایک چمکتا اور ابھرتا ہوا سورج ہے۔

☆ نعمت ملنے پر فوراً اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے شکر ادا کرنے سے نعمت اور بڑھتی ہے۔

نورین نور۔ کراچی

کام

فقیر نے ایک خاتون کو روک کر کہا۔ ”خدا کے نام پر مجھے ایک روپیہ دے دو۔ ورنہ مجھے ایک ایسا خوفناک کام کرنا پڑے گا جس کے خیال ہی سے میری روح کانپ جاتی ہے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور بدن پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔“

خاتون نے دہشت زدہ ہو کر فقیر کو ایک روپیہ دے دیا اور ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”بتاؤ وہ کون سا کام ہے؟“

فقیر نے جواب دیا ”محنت مزدوری۔“

صبا سحر۔ ہارون آباد

سنگل

ایک آدمی کی بیوی مر گئی۔ رشتے داروں اور دوستوں نے اسے چپ کرانے کے بعد پوچھا۔

”تمہیں کچھ چاہیے؟“

آدمی نے جواب دیا۔ ”ہاں مجھے میرا لیپ ٹاپ لا دیں۔“

لوگوں نے وجہ پوچھی۔ ”اس کا کیا کرنا ہے۔“

آدمی بولا۔ ”فیس بک پر اپنے اسٹیٹس کو سنگل کرنا ہے۔“

نوشین مدثر۔ لاہور

زندگی کے ادوار

زندگی کے تین ادوار عجب رنگ میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔

1۔ اسکول لائف ٹائم ہے دوست ہیں لیکن پیسہ نہیں ہے۔

2۔ شادی شدہ لائف۔ دوست ہیں پیسہ ہے لیکن ٹائم نہیں۔

3۔ اولڈ لائف۔ ٹائم ہے پیسہ ہے لیکن دوست نہیں۔

امبرین حیدر۔ اسلام آباد

فضیلت نماز پنجگانہ

- نماز فجر: تمہاری خوب صورتی میں اضافہ کرتی ہے۔
- نماز ظہر: تمہاری آمدنی میں اضافہ کرتی ہے۔
- نماز عصر: تمہاری صحت میں اضافہ کرتی ہے۔
- نماز مغرب: تمہارا مستقبل سنوارتی ہے۔
- نماز عشاء: تم کو سکون کی نیند سلاتی ہے۔

انمول موتی

مشکلات ہمیشہ بہترین لوگوں کے حصے میں آتی ہیں کیونکہ وہ اس کو بہترین طریقے سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ (حضرت علیؓ)

مصباح مسکان رؤف اور امینہ رؤف۔ جہلم

کھوتی

ایک عورت نے ہرنی کا گوشت پکایا مگر بچوں کو اس کا نام نہیں بتایا کہ کس کا گوشت ہے لیکن ایک اشارہ دیتے ہوئے بولی۔

”بچوں! یہ وہ ہے جو تمہارے پاپا مجھے پیار سے کہتے ہیں۔“

اچانک ایک بچہ بولا۔

''اوئے نہ کھاؤ کھوتی پی اے تھوتی''

ریما نور رضوان۔ کراچی

جان لیں......!

☆ پچھتاوا بھی نصیب والوں کو ملتا ہے۔

☆ کتنے بدنصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جن تک محبت آتی ہے اور بنا نوازے پلٹ جاتی ہے۔

☆ جب ہم اپنی نفرت یا محبت کو پوری طرح ظاہر نہ کر پائیں تو پھر ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

☆ وہ لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں جو احسان تو کرتے ہیں لیکن اسے چکانے کا کوئی راستہ نہیں چھوڑتے۔

☆ وہ محبت ہی کیا جو جرأت نہ دے سکے۔

☆ جب ضبط کا بندھن ٹوٹتا ہے تو جذبات ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کی طرح بہہ نکلتے ہیں لیکن وقت گزرتا ہے تو ہر طغیانی کو قرار آجاتا ہے۔

☆ درد خرید کر درماں بیچنے والے کہاں گئے، زندگی سسک رہی ہے اور اس کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں۔

☆ زندگی کسی ایک فرد کے نہیں بلکہ ایک ایک شخص کے سدھرنے سے سدھرے گی۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

کردار

☆ انسانی شخصیت کی پہچان کردار ہے۔ یہ ایک ایسی دولت ہے جس کی ہر کوئی عزت کرتا ہے۔

☆ کردار وہ سرمایہ ہے جو پرسکون ماحول مہیا کرتا ہے۔ ایک ایسی دیوار ہے جس کو گرانا بہت مشکل ہے۔

☆ کردار ایک انسانی شخصیت کا حصہ بن کر رہے تو وہ انسان ستاروں کی طرح چمکتا ہے۔ بلند کردار والا انسان بلندیوں پر رہتا ہے اور پست کردار والا انسان پستیوں میں جا گرتا ہے۔ دنیا کی ہر خوشی حاصل کر لینا کوئی کمال نہیں، کردار کو اپنے اندر سمو لینا بہت بڑا فن ہے۔

خاموشی

ایک بند دروازہ ہے۔ جس کے پیچھے حماقت بھی ہو سکتی ہے اور لیاقت بھی۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

کرنوں کی روشنی

☆ اللہ سے رجوع کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ کرو۔ اس کے پاس تو گزرے ہوئے کل کی معافی بھی ہے اور آنے والے کل کا انعام بھی۔

☆ خلوص اور عزت بہت نایاب تحفے ہیں۔ اس لیے پھر کسی سے ان کی امید نہ رکھو کیونکہ بہت کم لوگ دل کے امیر ہوتے ہیں۔

☆ ڈاکٹر علامہ اقبال لکھتے ہیں میں نے زندگی میں صرف 5 باتیں سیکھیں۔

i۔ ماں کے سوا کوئی وفادار نہیں۔

ii۔ غریب کا کوئی دوست نہیں بنتا۔

iii۔ لوگ اچھی سیرت کو نہیں اچھی صورت کو ترجیح دیتے ہیں۔

iv۔ عزت صرف پیسے کی ہے انسان کی نہیں۔

v۔ انسان جس شخص کے لیے دل سے مخلص ہو وہی شخص زیادہ دکھ دیتا ہے۔

☆ انسان کی بربادی کا وقت تب شروع ہوتا ہے جب وہ اپنے مخلص دوستوں سے جدائی اختیار کر لیتا ہے۔

☆ انسان بڑی عجیب مخلوق ہے یہ جانور کو مصیبت میں دیکھ کر برداشت نہیں کرتا۔ لیکن کسی انسان کو مصیبت میں مبتلا کر کے خوش ہوتا ہے۔

ایم جے قریشی۔ ڈی آئی خان ☆

ذرا پیپر سن کہنا

نظم

میں نے تجھے پیار کا ساگر لکھا
میں نے تجھے خواب کا منظر لکھا
میں نے تجھے چاند سا سندر لکھا
میں نے تجھے یاد کا محور لکھا
مین نے تجھے پریت کا سمندر لکھا
میں نے تجھے وفا کا پیکر لکھا
میں نے تجھے وقت کا گوہر لکھا
میں نے تجھے زیست کا سفر لکھا
میں نے تجھے خواہش کا گھر لکھا
میں نے تجھے اپنا مقدر لکھا

شہلا گل سحر

نظم

خاموش ہے آنکھوں کا دریا
لوٹ کر آیا ہے
جب سے تنہا یہ دل
ٹوٹی ہے امید مگر
اب بھی دھڑکتا ہے یہ دل

نور الصبا

غزل

گل پوش نظاروں کی ادا خوب لگی تھی
اس شوخ کی آنکھوں میں حیا خوب لگی تھی
جب بام پہ آیا تھا قمر دیکھنے اس کو
اس شام ستاروں کی ادا خوب لگی تھی
جس روز قدم اس نے مرے گھر میں رکھا تھا
اُس روز مجھے گھر کی فضا خوب لگی تھی
سیکھے تو کوئی اس سے وہ انداز ستم کا
ہر دار پہ قاتل کی ادا خوب لگی تھی!
اک حبس کا موسم تھا مرے خانۂ دل میں
اُس رات جو برسی تھی گھٹا خوب لگی تھی
جب زہر بھرا جام دیا پیار سے اس نے
ہونٹوں پہ تبسم کی ادا خوب لگی تھی!
ہاتھ اپنے اٹھائے وہ مجھے مانگ رہا تھا!
ان پھول سے ہونٹوں پہ دعا خوب لگی تھی

حکیم خان حکیم

جرم خاص

خوبرو لڑکی تھی بیٹھی تھی کیے سولہ سنگھار
چار جانب تھے کھڑے
اپنے ہی اس کے رشتے دار
زہر کا پیالہ تھا ان کے ہاتھ میں
ساتھ ہی تھا ایک ٹوکا تیز دھار
سامنے بھی ان کی ہی لختِ جگر
جس کو بخشا تھا انہوں نے اختیار
زہر پی کر ختم کر لے زندگی
یا ہے پھر ٹکڑے ہونے کو تیار
لے پیالہ ہاتھ میں زہراب کا

دیکھا اس نے محسنوں کو ایک بار
پی لیا سارا پیالہ زہر کا
اس کی آنکھوں میں اتر آیا خمار
اور پھر تڑپی تڑپ کر مر گئی
قاتلوں کے چہروں پر آیا نکھار
نام اس کو خودکشی کا دے دیا
بچ سکیں قانون سے وہ نابکار
پسند کی شادی تھا اس کا جرم خاص
جس نے اس کو کر دیا تھا داغدار
تھی بڑی معصوم وہ بنت حوا
ہائے اس کے ساتھ کیا کچھ ہو گیا
ریاض حسین عمر

غزل

کسی کی عنایتوں نے یہ دن دکھائے ہیں
میرے اپنے بھی یوں پھر سے پرائے ہیں
کھل کے برستا نہیں آج یوں بھی ابر
ہم زمانے کے ہاتھوں سے ستائے ہیں
فریب دنیا ان کا ہے معیار زندگی
حسن والوں نے ہم پر ستم کئی ڈھائے ہیں
بچھڑ جائیں تو مڑ کے دیکھتا نہیں کوئی بھی
یاروں کی باتوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
دامن پر لگے داغ دیکھتا کوئی نہیں جاوید
شرارے بھی پھول بن کے پھر جگمگائے ہیں
محمد اسلم جاوید

برسوں بعد

آج میں برسوں بعد
ان راستوں کی طرف گیا تھا جاناں
جہاں کبھی رہا کرتے تھے
ہماری محبتوں کے موسم
مگر
وہاں اب صرف تنہائی کا ڈیرہ ہے
ویراں ویراں سا بھی وہاں کا سویرا ہے
جیسے برسوں سے وہاں نہیں کوئی ٹھہرا ہے
جیسے ایک شکست کھائے ہوئے دیوانے کے
دل پر چھایا ہوتا اندھیرا ہے
وہاں اب کوئی کسی سے
کرتا وعدہ نہیں
جیسے زمانے میں کسی کا
محبت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں
وقت کے بے رحم پنجوں سے جب بھی
تمہیں فرصت ملے جاناں
اک بار وہاں سے ہو کے آنا
شاید وہاں تمہیں محبت ملے جاناں
جہاں سے میں آج آنسو لے کے آیا ہوں
بھٹکتی، سسکتی ہوئی برسوں پرانی
کسی دیوانے کی آرزو لے کے آیا ہوں
تھکاوٹ سے چور
نڈھال زمانے سے ہاری ہوئی
ایک جستجو لے کے آیا ہوں
وقت کی دھول سے دبی ہوئی
کچھ قسمیں، کچھ یادیں
کچھ وعدے کچھ ارادے
جو اپنی اہمیت کھو چکے ہیں
کچھ مسکراہٹیں کچھ ادائیں
کچھ معصوم سی، حیراں سی
پریشان سی باتیں
اور کچھ درد میں ڈوبے ہوئے لہجے
آج بھی تیرے دیدار کے منتظر لگے
ایک بار ان سے مل کے آنا

کہ ہم ان کے قصوروار ہیں
ہم نے اپنی انا کی جنگ میں
اس محبت کا خون کر ڈالا
جواب بغیر لحد کے
کسی بے قرار روح کی طرح
اپنے وجود کو تلاش کرتی پھرتی ہے
''ساتھی'' زبیر پنہیار

غزل

بزم امکاں ہے میری ذات میں گم
اور میں دشت کائنات میں گم
کون پڑھتا نوشتہ دیوار
ساری خلقت تھی حادثات میں گم
خانقاہوں میں زندگی رقصاں
قصر شاہی تحفظات میں گم
منتظر ہیں کسی کرامت کے
آئینے گرد کائنات میں گم
امتیاز امروز کی تلاش میں ہے
اک مسافر اندھیری رات میں گم
ایس امتیاز احمد

غزل

آج پھر وہی دیدار سخن بنا ہوا ہے
کھل کے وہی دیوارِ چمن بنا ہوا ہے
میرا وجود خود ہی دیارِ چلن بنا ہوا ہے
رقیبوں کا دربار جلن بنا ہوا ہے
انہیں بھی درکار سمن بنا ہوا ہے
وہ میرا دلبہار رتن بنا ہوا ہے
دشمنوں کو میرا دستار چبھن بنا ہوا ہے
میرا دل اس کا دلدار سجن بنا ہوا ہے
مہرین کنول

نظم

یہ جو قصے اور فسانے ہیں محبت کے
انہیں ہم نے بہت دیکھا ہے زندگی میں
بہت سوچا، بہت جانچا ہے رویوں سے
کیا ہے ان کی سچائی دنیا میں حقیقت میں
کیا دیتے ہیں یہ کوئی خوشی کسی انسان کو
یا فقط دل کی لگی کے بہانے ہیں
جب ہم نے محبت کی وادی میں قدم رکھا تھا
بہت سوچا تھا، بہت جانا تھا جاناں کو
جب ہم اس کو ملے تو یہ بھول بیٹھے
نہیں کرنا کوئی کسی سے
بے غرض محبت اس دنیا میں
جو سوچا تھا جو جانا تھا جاناں کو
سب ایک فریب اور دھوکا تھا
یہ جو قصے اور فسانے ہیں محبت کے
انہیں ہم نے بہت دیکھا ہے زندگی میں
ماریہ یاسر

زندگی

الجھی الجھی سی رہی
بے ترتیب سی
بکھری سی ملی مجھے
سنوارتی تو بکھر جاتی
باوجود کوشش کہ نہ سنبھل پاتی
جب بھی چاہا اسے سایہ دوں
لگا مجھے جیسے بہت پرایا ہوں
عجب ڈھنگ رہے ہمیشہ اس کے
سدا رہے اس کے رنگ پھیکے
کبھی خوشی نہ اس سے منسلک رہی
تمام عمر ہی یہاں سے وہاں بھٹکتی رہی

کیا کہوں زبان سے اپنی
میری زندگی ہمیشہ مجھ سے خفا رہی

کوثر ناز

لوٹ آؤ

سنو تم لوٹ آؤ کہ لوٹ آنے سے
کبھی راہیں جدا نہیں ہوتیں
رابطے ختم ہو جانے سے
محبتیں کم نہیں ہوتیں
دوریاں بڑھ بھی جائیں
لیکن......!
دل سے جوڑے
بندھن ٹوٹ نہیں جاتے
سنو تم لوٹ آؤ
کہ......!
محبت کی مسافتیں
یوں اکیلے طے نہیں ہوتیں

کنول خان

تمہارا ساتھ

آج فلک انتہائی دلکش لگ رہا ہے
ہلکا ہلکا دودھیا نیلا آکاش
اور اس پر کہیں کہیں سفید روئی کے
گولے جیسے بادلوں کے ٹکڑے
کبھی ہلکی کبھی تیز سرد ہوا کے جھونکے
میری جان میرے رضوان جی
تمہاری سنگت میں ہر منظر ہر نظارہ
بڑا ہی دلفریب سا محسوس ہوتا ہے
تمہاری چاہت میں پور پور ڈوب کر
جب یہ حسین منظر دیکھتی ہوں
تو ایسا لگتا ہے یہ سارے حسین دلکش منظر
میرے ''معبود برحق'' کی حمد و ثناء میں
مشغول ہیں میں بھی من ہی من میں
اپنے باری تعالیٰ کا شکر ادا کرتی ہوں
کہ اس نے مجھے یہ حسین منظر دکھائے
اور تمہاری محبت میں سرشار ہو کر
اونچی نیچی راہوں میں چلتی جاتی ہوں
کبھی تم میرا ہاتھ تھام کر
لڑکھڑانے سے بچاتے ہو تو
کبھی کوئی شوخ سی شرارت کر جاتے ہو
تمہاری اس قدر چاہت پر سرشار
ہو جاتی ہوں آج فلک انتہائی دلکش رہا ہے
رب کے کرم سے تمہارے ساتھ سے
زندگی دلکش لگ رہی ہے

ریما نور رضوان

نظم

میں نے پیار کیا تھا اک بلبل سے
اک چہکنے والی کوئل سے
نجانے کہاں کھو گئی وہ مجھ سے
آئے کبھی تو ملنے مجھ سے
وہ جب بھی خیال میں آتی ہے
دل چہکنے گانے لگتا ہے
وہ جب بھی خیال سے جاتی ہے
دل پھر سکوت میں ہوتا ہے
اس پیاری کہانی کا امرت
میں قطرہ قطرہ پیتی ہوں
میں نے پیار کیا تھا اک بلبل سے
اک چہکنے والی کوئل سے

سعدیہ نواز

......☆......

سندیسے

عانیہ نیازی ـــــ ربوہ

سوئیٹ سی آپی اور میرے تمام قارئین و رائٹرز کو میرا پیار بھرا سلام قبول و مقبول ہو۔ سب سے پہلے "گوشہ آگہی" کو دل میں اتارا اور پھر "ردائے جنت" سے فیض یاب ہوئے۔ اس بار شازیہ جی کے ناول کی آخری قسط شامل تھی تمام کرداروں کے ساتھ شازیہ جی نے بھرپور انصاف کرتے ہوئے ناول کو ایک خوبصورت اختتام دیا، ویل ڈن۔ عائشہ ذوالفقار کا سلسلے وار جتنے بھرپور انداز سے شروع ہوا اتنے ہی عمدہ انداز سے آگے بڑھ رہا ہے۔ کہانی کا تانا بانا بہت خوب صورتی سے بنایا ہے انہوں نے۔ اس بار تو آپی کمال ہو گیا کہ تین تین مکمل ناول واہ دل خوش ہو گیا۔ مجھے نائیلہ طارق اور ایقان علی کے ناولز نے بہت متاثر کیا خاص کر ایقان علی کے ناول نے تو مجھے اپنا اسیر کر لیا۔ نائیلہ طارق کا اپنا ایک مخصوص انداز تحریر ہے جو ہمیں گرفت میں لیے رہتا ہے۔ خوب صورت ناول پر ڈھیروں مبارک باد۔ ناولٹ میں ثناء کنول نے اچھا لکھا مگر نہال چوہدری کے بارے میں تھوڑی اور تفصیل لکھی جاتی تو زیادہ اچھا ہوتا مگر ثناء آپ مجھے اتنی پیاری اور عزیز ہیں کہ میں نے آپ کے ناولٹ کو دل سے پڑھا ویل ڈن، اب بات ہو جائے افسانوں کی تو بہت دنوں بعد روشنی کی آمد بہت ہی پیاری لگی اور ان کا افسانہ بھی عمدہ تھا۔ نظیر فاطمہ، عائشہ انصاری، مصباح مسکان، تبسم فیاض، قرۃ العین نے بھی ماشاء اللہ بہت اچھا لکھا۔ سب کے لیے بہت سی دعائیں، خوش رہیں اور ردا کو یونہی اپنی آمد سے حسین سے حسین تر بناتی رہیں۔ ردا کے مستقل سلسلے ہمیشہ کی طرح خوب صورت و دلکش اور دل پسند رہے او کے اب اجازت۔ اللہ حافظ۔

فریدہ فرید ـــــ پاک پتن شریف

آپی جان، نورین جی اور پیاری سکھی سہیلیوں کو بے انتہا سلام خلوص۔ اس ماہ ردا نے وقت پر انٹری دے کر ہماری بھی سندیسے کی محفل میں حاضری کو ممکن بنا دیا ورنہ پچھلے دو ماہ سے ایک نشست میں رسالہ پڑھنے اور منٹوں میں لیٹر لکھنے کے باوجود پوسٹ کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔ بہر حال ہماری پیدائش کے مہینے کا ردا نہایت خوب صورت ٹائیٹل سے سجا آنکھوں کو خیراں کر گیا۔ ناول کا نام بھی افسانوی تھا "صائم"۔ ویسے بھی ہمارا ردا افسانوی سرزمین ہے اور فروری کے ردا نے افسانوی تڑکے کی نئی تاریخ رقم کر دی۔ ویلنٹائن پر مثبت و منفی ہر طرح کی کہانیاں بہت پاور فل تھیں اور افشاں جی کے مکمل ناول نے تو دل جیت لیا ناول کی ابتدا نہایت سنسنی خیز اور مدلل تھی۔ ضحاک اور درنجف کی پہلی ملاقات کی منظر نگاری اور رومانس انتہائی دلفریب تھا۔ رابعہ افضال خان کے محبت کے قلم نے نام نہاد محبت کے دن کی اصلیت خوب اچھی طرح اجاگر کی۔ گل جی (شہلا گل) کی تحریر ہر لحاظ سے پختگی کا اثر لیے ہوئے تھی۔ غوث پاک کا قول پوری تحریر کی جان تھا۔ مارچ کے ردا میں "گوشہ آگہی" سے نگاہیں تر کرتے

داخل ہوتے ہیں۔(خوشیاں ڈھونڈنے کے لیے فاصلوں کونہیں قرب کوڈھونڈتے ہیں) کیابات ہے آپی جان موتی پردئے الفاظ اسی کو کہتے ہیں۔شازیہ مصطفیٰ کی ہرلائن شرارتیں بکھیرتی تحریراپنے اختتام کو پہنچی۔شکر ہے اب ردا میں طویل تحریریں پڑھنے کوملتی ہیں۔ام کلثوم نے انتہائی حساس ٹاپک پر مختصراً لکھ کر کمال کردیا عورت نئی نسلوں کے لیے مثال ہوتی ہے۔نظیر فاطمہ بھی ام کلثوم ہی کے ٹاپک کی ایک اور صورت لیے حواس پر چھا گئیں۔عائشہ انصاری نے آری کی مشکل مگرتا ابد اچھے عادات کا مالک بنانے والی ٹریننگ پر خوب لکھا۔پیاری مصباح مسکان ایم اے اردو کرنا مبارک ہو،آپ ہماری ایم اے سکھی بھی بن گئیں آپ کی تحریر پردہ کے متعلق مثالی تھی۔ عبایا پردے کی علامت نہیں ہے کیسے اس لباس کے ساتھ مذاق کیا جاتا ہے آپ نے ابتدائے تحریر میں خوب اچھی طرح بیان کیا۔امبرین ناز،تبسم فیاض، ایقان علی،درخشاں ضیاء،سائرہ عبدالغفار،قرۃ العین سکندر ہماری ہر سکھی نے ردا میں چار چاند لگائے۔ مختلف موضوعات اور جامع انداز،ویل ڈن۔حورینہ سعد،عائشہ خان آپ ردا کے لاسٹ میں تھیں مگر انداز تحریر نے آپ کو فرسٹ کردیا۔آخر میں میری موسٹ فیورٹ نائیلہ طارق کے مکمل ناول کا مزے سے تسلی سے مطالعہ کیا۔نائیلہ جی کے جادوئی قلم نے ایک ہی ناول میں سمیٹ لیا گویا دریا کو کوزے میں بند کیا۔اشعار میں عانیہ نیازی کا انتخاب دل دہلا گیا۔ اس ماہ میں نورین جی کا شاہکاری انتخاب،ریمانور کی اہم معلومات سے مستفید ہوئے۔سندیسے میں ماریہ یاسر کرسی صدارت پر براجمان تھیں۔فروری کے ردا میں عانیہ جی کو یہ سعادت نصیب ہوئی عانیہ تو ویسے بھی نمبرون ہیں۔ان کا سندیسہ یک نگاہی مطالعہ والا نہیں ہوتا،دھیان سے پڑھتے ہیں۔افشاں جی ہمیشہ کی طرح محبتیں بکھیرتی نظر آئیں۔افشاں آپ کی تحریر میں بہت پختگی ہے۔سیدہ فرزین اور شبانہ زبیر کی مختصر انٹری تھی مگر ہمیں اچھی لگی۔صباء عبدالغنی کے تفصیلی تبصرے نے مجھے سندیسہ پوسٹ نہ کرنے کا دکھ کم کردیا کم وبیش ہماری ہی رائے ہمیں صباجی کے نام سے قرطاس پر نظر آئی۔جانے صباء آپ میں اتنا اخلاص کیسے موجود ہے کہ برتھ ڈے وش کرنا بھی نہیں بھولتیں۔مارچ کے مہینے کی برتھ ڈے وش میں نے بھی وصول کی شکریہ قبول کرو۔ہماری پیاری رابعہ افضال یقیناً تاخیر سندیسہ کا شکار ہوئی ہوں گی بہر حال ہم نے ہر ایک گام بہت مس کیا جہاں رہو خوش رہو۔ سب کو دلی خلوص پیش کرتے ہوئے اجازت۔

ثوبیہ ملک ــــــــــ کراچی

پیاری آپی! میری طرف سے آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔اللہ تعالیٰ آپ کو ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے۔کیونکہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جو اندھیرے میں دیا جلاتے ہیں۔اب آتے ہیں اپنے پیارے ردا کی طرف تو جناب مارچ کا مکمل شمارہ ہی زبردست تھا۔سلسلے وار ناول دونوں ہی زبردست ہیں۔افشاں علی اور نائیلہ طارق کو بھی میری جانب سے مبارک باد کیونکہ جو سفر انہوں نے ردا کے سنگ شروع کیا تھا وہ اب بڑھتا ہی جارہا ہے جس کا کریڈٹ آپی صالحہ کے سر جاتا ہے کیونکہ ان کی حوصلہ افزائی سے وہ آگے بڑھتی چلی گئیں۔خیر مکمل ناول اس بار زبردست تھے اور وہ بھی ایک ساتھ تین اور ناولٹ ثناء کنول زبردست ہمیشہ کی طرح۔افسانوں کی تو یہاں لائن لگی تھی جو شروع ہوئی روشنی فاطمہ سے اور عائشہ خان پر اس کا اختتام ہوا تو میں سب کے لیے ہی کہوں گی کہ سب نے اچھا لکھا۔اس کے علاوہ سب ہی سلسلے اچھے بلکہ بہت زیادہ اچھے تھے۔اب آخر میں سب قارئین کا شکریہ اور ردا کے لیے بے شمار دعائیں۔

افشاں علی ــــــــــ کراچی

محبتوں وخلوص کا نذرانہ لیے افشاں علی سندیسے

ہوتے ہیں۔ میں نے تو یہ دور ایسے گزارا کہ میری Students آج بھی میرے رابطے میں ہیں۔ افشاں میری ڈیٹ آف برتھ 28 جون ہے۔ کبھی وقت ملے تو پچھلے سال کے سارے رسالے چیک کیجیے گا ساری شاعری میں نے اپنی بھیجی ہے۔ بتایئے گا کہ شاعر بننے کے کچھ جراثیم ہیں مجھ میں۔ ضرور بتایئے گا میری محبت اور دعائیں آپ لوگوں کے نام۔

مہرین کنول ـــــ کراچی

السلام علیکم! ردا کی شان شفیق صالحہ آپی' نورین آپی، قارئین و رائٹرز مارچ کا ردا ہاتھوں میں ہے۔ ''گوشہ آگہی'' اور ''ردائے جنت'' صالحہ آپی کی خوب صورت تحریر سے مستفید ہوئے جن میں نصیحت اور اسلامی معلومات ہوتی ہیں۔ آگے سلسلے وار ناول ''تجھ سے مانگوں میں تجھ کو'' شازیہ آپی کو کامیاب ناول لکھنے پر مبارک باد۔ ''چل اڑ جا اب تیری باری'' عائشہ ذوالفقار جی اچھا لکھ رہی ہیں۔ اقراء چنا جی، نائیلہ طارق جی، ایقان علی جی اور ثناء کنول جی اپنے خوب صورت ناولوں کے ساتھ ردا پر چھا گئیں۔ روشنی فاطمہ، ام کلثوم، نظیر فاطمہ، عائشہ انصاری، امبرین ناز، مصباح، تبسم فیاض، درخشاں، سائرہ، قرۃ العین سکندر، حورینہ سعد، عائشہ خان آپ سب کے افسانے زبردست تھے۔ افشاں علی جی، صباء عبدالغنی جی، گیتی آرا جی، رابعہ افضال جی، شبانہ زبیر جی میری تحریر دل کو پسند کرنے کا شکریہ۔ صباء عبدالغنی جی مئی کا مہینہ آپ کے لیے اہم ہے میری دعا ہے آپ کی عمر اللہ تعالیٰ دراز کرے۔ خوشیوں کے ساتھ آمین۔

رابعہ افضال خان ـــــ کراچی

ردا سے جڑی تمام پیاری سی قارئین، سویٹ سی صالحہ اپیا، کیوٹ سی نورین ملک اور تمام ردا اسٹاف کو ڈھیروں دعاؤں اور محبت سے گندھا رابعہ افضال خان کا سلام محبت قبول ہو۔ سرورق پر موجود صائم انصار کی پیاری سی مسکان کے ساتھ مارچ کا شمارہ 14 مارچ کو ہمارے ہاتھوں کی زینت بنا فہرست دیکھی تو ردا کی محفل میں افسانوں کی بہار ہی بہار بکھری پڑی تھی۔ سب سے پہلے ''گوشہ آگہی'' میں بکھرے لفظوں سے مستفید ہوئے پھر ''ردائے جنت'' کا مطالعہ کرتے شازیہ مصطفیٰ کے ناول ''تجھ سے مانگوں میں تجھ کو'' آخری قسط پڑھ کر اچھا لگا۔ افسانوں کی محفل میں سب ہی کی انٹری بہت خوب صورت تھی۔ روشنی فاطمہ، ام کلثوم، نظیر فاطمہ، عائشہ انصاری، امبرین ناز، مصباح مسکان، تبسم فیاض، درخشاں ضیاء، سائرہ عبدالغفار، قرۃ العین سکندر، حورینہ سعد، عائشہ خان سب ہی نے بہت خوب لکھا۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے زور قلم میں مزید روانی و خوب صورتی عطا کرے۔ مکمل ناول میں نائیلہ طارق ''اک خواب کا نیلا پھول کھلے'' ہم تو نام پڑھ کر ہی فدا ہوگئے۔ بالکل اپنے نام کی طرح تھا آپ کا ناول۔ ''تنہائیوں کے شہر میں'' اقراء چنا آپ نے بھی خوب لکھا۔ ثناء کنول 'سر فصیل سکوت جاناں'' پڑھ کر مزہ آگیا۔ سلسلے وار ناول ''چل اڑ جا اب تیری باری'' عائشہ ذوالفقار آپ کا ناول بھی بڑی خوب صورتی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ ''ردا کی ڈائری'' میں اسماء جمشید کی ڈائری سے وصی شاہ کا کلام بہت خوب صورت تھا۔ ایم جے قریشی کی ڈائری سے محسن نقوی کا کلام بھی دل کو چھو گیا۔ ''اشعار'' سب ہی اچھے لگے۔ ''اس ماہ میں'' اقوال حضرت علیؓ بہت اچھے لگے۔ ''خوشبو'' میں موجود ہر لفظ خوشبو کی طرح مہکتا ہوا تھا۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں سب ہی کا کلام بہترین تھا۔ ''سندیسے'' کی محفل میں ماریہ یاسر، افشاں علی، صبا عبدالغنی نے خوب رونق لگائی۔ اپنے تفصیلی تبصرے کے ساتھ پیاری ماریہ یاسر میری تحریر کو پسند کرنے کے لیے بہت شکریہ۔ سویٹ افشاں علی آپ کو میری تحریر اچھی لگی اس کے لیے جزاک اللہ۔ ڈیئر صبا عبدالغنی میری تعریف اور میری تحریر کو پسند

کرنے کے لیے جزاک اللہ اور ہم آپ کو جوائن ضرور کریں گے ہم آپ کو انشاء اللہ بھر پور طریقے سے آپ کا برتھ ڈے وش کریں گے۔ پیاری فریدہ فرید خیریت تو ہے سندیسے کی محفل سے غیر حاضر ہیں؟ آپ کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے پلیز جلدی واپس آئیے۔ ''دوستوں کے نام پیغام'' میں سب ہی کے پیغام بہت اچھے لگے۔ سویٹ مون شاہ آپ نے ہمیں اپنے پیغام میں یاد رکھا اس کے لیے جزاک اللہ بہت خوشی ہوئی۔ ''کچن'' اور ''سنگھار'' بھی بہت اچھا تھا۔ آخر میں افشاں علی، صبا عبدالغنی، ماریہ یاسر، فریدہ فرید، مون شاہ آپ سب کا شکریہ جو مجھ ناچیز کو یاد رکھتی ہیں اور اپنی قیمتی رائے سے نوازتی ہیں۔ آپ کے ساتھ اور پیار کی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ اس کے ساتھ ہی اپنی دوست رابعہ افضال خان کو سندیسے کی محفل سے اجازت دیجیے۔ اللہ نگہبان۔

ریما نور رضوان ـــــ کراچی

دل کی تمام تر گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ منفرد ہوتے ہوئے منفرد لفظوں کے ساتھ تمام ردا ریڈرز، ردا رائٹرز، ردا فیملی ممبر سب کی ذہنی قلبی سکون کے دعا گو ہوتے ہوئے سب کے لیے پیار اور خلوص بھرا السلام علیکم۔ کیسے ہیں آپ؟ میں اس بزم میں چاہ کر بھی نہیں آپائی۔ جنوری، فروری، مارچ تینوں شماروں پر تبصرہ کروں گی۔ سب سے پہلے 2016ء سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ محبتوں اور چاہتوں سے سجایا گیا۔ سال نو نمبر Awsom میری موسٹ فیورٹ رائٹر سباس گل ''مجھے چاہت تمہاری ہے'' بہت اچھا لگا۔ ناولٹ دونوں زبردست رہے۔ سال نو نمبر افسانہ نمبر لگا۔ اچھا لگا بہت زیادہ۔ اتنی ساری پیاری لکھاریوں کی شمولیت نائیلہ طارق جی کامیاب ناول نگاری مبارک ہو۔ آپ کی تحریر نے یادگار نقوش چھوڑے ہیں دل و دماغ پر۔ جنوری کے شمارے پر تبصرہ تھا۔ اب فروری پر تبصرہ حاضر ہے۔ ماریہ رضوی خوب صورت انداز دلباس میں آنکھوں کو بھا گئیں۔ تمام مستقل سلسلے زبردست رہے۔ فاطمہ خان نیو رائٹر ہیں۔ ان کا افسانہ اچھا لگا۔ مزید لکھیے گا۔ ایس حبیب آپ کی تحریر ''عنادل تمہاری ہوئی دل سے'' داؤ امیزنگ مائنڈ بلوئنگ مزہ آگیا۔ قرۃ العین سکندر کا ناولٹ بہت اچھا لگا۔ عائشہ ذوالفقار کافی ٹائم بعد آئیں اور چھا گئیں۔ آپ کی تحریر بول رہی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ فروری کے شمارے میں تمام افسانے بہترین لگے۔ شہلا گل سحر بھی ردا ممبر میں اچھا اضافہ ہیں۔ ''سندیسے'' افشاں علی تو زبردست لکھتی ہی ہیں۔ اس بار تو صبا عبدالغنی کا سندیسہ بھی بہت اچھا لگا۔ اب آتی ہوں مارچ کے شمارے کی طرف۔ سوری افشاں علی کا مکمل ناول بہت زیادہ اچھا تھا۔ مارچ کا ٹائیٹل دلہن صائم انصار میری فضاء تو دیوانی ہے دلہنوں کی۔ ٹائیٹل ہی دیکھے جارہی ہے ڈائجسٹ چھپتی رہی۔ کافی دیر بعد ہاتھ آیا۔ فہرست دیکھ کر اچھا لگا۔ کافی اچھے رائٹرز شامل تھے۔ گوشہ آگہی مائی فیورٹ ہے۔ واقعی آپی ایسا لگتا ہے۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ کر بات کررہے ہیں۔ سلسلے وار ناول عائشہ ذوالفقار کا ردا کی جان بنا ہوا ہے۔ بہت خوب بہت اچھی طرح آگے بڑھا رہی ہیں کہانی۔ ناولٹ میں ثناء کنول جگمگا رہی تھیں۔ خوب لکھا کیپ اٹ اپ۔ افسانے تمام ہی اچھے لگے۔ روشنی فاطمہ، ام کلثوم زینب، نظیر فاطمہ، عائشہ انصاری، امبرین ناز، مصباح مسکان، تبسم فیاض، درخشاں ضیاء، سائرہ عبدالغفار، قرۃ العین سکندر، حورینہ سعد، عائشہ خان سبھی کی انداز تحریر پسند آیا۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں اس بار بھی نے کمال کا لکھا۔ ''ردا کی ڈائری'' ہمیشہ کی طرح سجی سجائی مبہوت کرگئی۔ کچن، سنگھار، خوشبو، اشعار تمام سلسلے بہت خوب صورت ہیں۔ اللہ حافظ۔ دعاؤں میں یاد رکھنا۔



کی محفل میں جلوہ افروز ہیں۔ سب ہی پیاری پیاری بہنوں کو آداب عرض۔ ماہ مارچ محبتوں کا موسم بے نام سی سردیوں کا اختتام اور یہ خوب صورت سا سرورق مزا دے گیا۔ بہت ہی خوب صورت ساجذب نظر سرورق سے نظر پھسلتی ہوئی ''گوشہ آگاہی'' کے در پہ پہنچی اور پھر آپی کی پیاری سی باتیں سنیں۔ ایک اور خوب صورت سے ناول کا اختتام ہوا۔ شازیہ آپی بلا آخر آپ نے لفظوں کے جادو سے محبت کو مانگ لیا۔ ''تجھ سے مانگوں تجھ کو'' اتنے پیارے سے ناول کے مکمل ہونے پر مبارک باد۔ اس بار شامل تینوں ناول بہت زبردست اضافہ ہوئے۔ پھر چاہے وہ تنہائیوں کے شہر میں رہتی، اپنوں کو ہتی رابیل ہو یا محبت کی پہلی نگاہ سے اسیر ہوتی میمونہ یا پھر برٹش موی کا تاثر دیتی ساشہ...... ! سب ہی کا کریکٹر پسند آیا۔ اقراء چنا! آپ نے بہت اچھا لکھا جب کہ ایقان علی ویل ڈن یار، بہت عمدگی سے آپ نے ناول لکھا۔ آپ کا انداز بیاں بہت اچھا ہے۔ آپ نے اسیر کر دیا۔ اب بچا اکلوتا سلسلے وار ناول! عائشہ ذوالفقار! بہت خوب صورتی سے Step by step آپ کا ناول آگے جا رہا ہے۔ پیاری ثناء کنول ناولٹ کا نام کافی اچھا لگا اور اسٹوری بھی۔ لڑکی بہت کمال لکھ رہی ہو۔ یوں ہی لکھتی رہنا۔ روشنی فیصل بہت وقت بعد آپ کا نام نظر سے گزرا لکھتی رہیے۔ ام کلثوم آپ کا مختصر اور سبق دیتا افسانہ اچھی شروعات ہے۔ نظیر فاطمہ آپ نے افسانے میں ٹھیک بتایا کہ کہہ دینا بہت آسان ہے مگر کہنے والے کو انہی باتوں کا احساس ہونا مشکل۔

پیاری سی عائشہ خان، سائرہ عبدالغفار، امبرین ناز، عائشہ انصاری، قرۃ العین سکندر اور تبسم فیاض آپ سب نے بھی بہت اچھا لکھا۔ جب کہ درخشاں ضیاء نے ایک مختلف موضوع کو بہت سادہ لفظوں میں Define کیا۔ Top of the afsana ''کہاں ہے بنت حوا'' مصباح مسکان، ویل ڈن۔ بہت اچھی تحریر تھی۔ باقی تمام سلسلے تو ہوتے ہی خوب ہیں۔ ''ذرا پھر سے کہنا'' میں سب ہی کی شاعری بہت پسند آئی۔ ''سندیسے'' میں عانیہ نیازی، ثناء کنول اور گیتی آراء کی کمی محسوس ہوئی۔ صباء عبدالغنی کا سندیسہ بہت پسند آیا۔ بہت بہت شکریہ میرے ناول کو پسند کرنے کے لیے۔ سیدہ فرزین حبیب ویل کم ڈیئر آپ کی آمد خوشی دے گئی۔ ڈیئر سندیسے سب ہی کے اچھے تھے۔ آخر میں ان سب کو سالگرہ مبارک جن کی ماہ اپریل میں سالگرہ ہے۔ محبتوں کے سنگ افشاں علی کو اجازت۔

گیتی آراء ـــــ کراچی

پیاری آپی السلام علیکم! سب سے پہلے تو آپی سمیت پیاری نورین اور ردا کے تمام قارئین کو گیتی کا پیار بھرا سلام۔ 8 مارچ کا ردا کیا ملا کہ مرجھائے چہرے پر بہار سی آگئی۔ آگے چل کر ''گوشہ آگہی'' کی خوب صورت لفظوں کی جادوگری دل میں بسائے آگے بڑھے تو ردا کے انمول موتی اور خزانے بٹورتے ہی چلے گئے۔ واہ سبحان اللہ! کیا بات ہے۔ اور اب باری تھی ثناء کنول کے ناولٹ ''سر فصیل سکوت جاناں'' جس کے خوب صورت نام ہی نے سب سے پہلے ہمارا دل اپنی طرف موہ لیا اور پھر ناولٹ کی کیا بات ہے۔ ''عکس در عکس'' روشنی فاطمہ کی یہ منفرد سی تحریر اپنا تاثر چھوڑے بنا نہ رہ سکی۔ ''کانچ کے رشتے'' بھی ایک اچھی کاوش تھی۔ نظیر فاطمہ کی ''احساس کا رشتہ'' بھی عورت کی بے بسی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ ''راہِ الفت'' ایک محب وطن خاتون کی داستان بھی اچھی رہی۔ ''محبت یا مذاق'' امبرین ناز کی منفرد سی تحریر کا منفرد سا اینڈ اچھا لگا اور اب باری تھی اس ماہ کے سب سے بہترین اور نمبر ون افسانے اور تحریر کی۔ مصباح مسکان روف کی کہانی ''کہاں ہے بنت حوا'' مصباح جی نے اپنی تحریر میں جس خوب صورتی سے موجودہ تہذیب اور فیشن کے علم برداروں اور مغربی تہذیب میں رنگی ہماری نئی جنریشن کے چہرے سے جو نقاب

اٹھایا ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔ویلڈن مصباح جی۔محبت کا جرم، خوش بخت، زندگی جہد مسلسل یا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، اتنی ہی بات بھی اچھی تحریریں تھیں اور آخر میں درخشاں ڈھیروں سسپنس لیے ہمیں اینڈ جاننے کو بے تاب کرتی چلی گئیں۔انداز بیان بھی خوب رہا۔''ردا کی ڈائری'' کے سبھی انتخاب اچھے تھے۔''اس ماہ میں''اقوال حضرت علیؓ، چھٹی کا دودھ، اس ماہ کا افسانچہ، یادیں، اس ماہ کی کرنیں، اس ماہ کے اقوال، اس ماہ کی اہم معلومات، اس ماہ کے بہترین کالم تھے۔''خوشبو'' ہمیشہ کی طرح بیسٹ رہا۔''ذرا پھر سے کہنا'' میں سبھی نے خوب لکھا۔صبا عبدالغنی کے سندیسے میں اپنی تعریف پڑھ کر خوشی بھی ہوئی صبا اور افشاں پسند کرنے کا بہت بہت شکریہ۔کچن میں بیف قیمہ ہری مرچیں زبردست رہا۔''سنگھار'' میں جلد کی ساخت کے مطابق میک اپ بے حد مفید معلوماتی رہا۔اب اجازت باقی ردا ابھی زیر مطالعہ ہے۔اب ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اجازت۔

☆ پیاری کیتی! پچھلے ماہ آپ کا سندیسہ لیٹ ملنے کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکا اور جس انٹرویو کا آپ ذکر کرتی ہیں وہ متعدد بار ردا میں لگ چکا ہے۔اپنا خیال رکھیے اور خوش رہیے۔

ماریہ یاسر ــــــــ کراچی

آداب عرض ہے امید ہے پیاری نورین اور اچھی صالحہ آپی آپ سب خیریت سے ہوں گے۔وعدے کے مطابق ردا 8 تاریخ کو ملا۔شکریہ صالحہ آپی اور نورین آپ دونوں کا۔تھوڑا سا خود پر فخر ہوتا ہے کہ اللہ کے کرم سے لکھنے والوں کی بھیڑ میں ہم بھی شامل ہو گئے ہیں، الحمدللہ۔اب آتے ہیں اس ماہ کے پرچے کی طرف سرورق پر سانولی سلونی سی ماڈل دلہن کے روپ میں اچھی لگی۔مکمل ناول سارے ہی اچھے ہیں۔سلسلے وار ناول میں مجھے عائشہ ذوالفقار کا ناول پسند ہے۔افسانے سب ہی اچھے تھے لیکن ''رکھنے والا'' سب سے بہترین تھا۔یہ افسانہ حقیقت سے بے انتہا قریب ہے۔حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ ہر انسان دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ناولٹ بھی اچھا تھا۔''سندیسے'' میں سب کی حاضری اچھی تھی لیکن کیتی آراء آپ کدھر غائب تھیں اس بار؟ دوستوں کے نام پیغام میں میرے علاوہ (آہم) مجھے سیدہ فرزین کا انتخاب اچھا لگا۔باقی سب کے بھی اچھے تھے۔باقی سارا رسالہ بھی بہترین تھا۔آئندہ ماہ پھر حاضری دوں گی تب تک کے لیے اللہ حافظ۔

شہلا گل سحر ــــ کوہاٹ کینٹ

سوئیٹ صالحہ آپی اینڈ نورین جی، سلام محبت خدا وند کریم آپ لوگوں کو صحت کاملہ، عمر دراز اور ڈھیروں دائمی خوشیاں عطا فرمائے، آمین ثمہ آمین۔ردا ہاتھ میں آتے آتے تبصرے کا وقت گزر جاتا ہے۔''دیکھو میری بے بسی'' نیوز ایجنسی اتنی کالنگ کرتی ہوں کہ اب آواز سن کے ہی ڈائریکٹ کہا جاتا ہے ''جی ردا ابھی تک نہیں آیا'' اور تو اور جس علاقے میں میری شادی ہوئی یہاں بھی ردا اب بہت مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔اپنی ہلکی پھلکی تحریروں اور انفرادیت کی وجہ سے شازیہ اور نائلہ طارق کے خوب صورت ناول بھی اچھے تھے۔فریدہ فرید کی تحریر بھی زبردست تھی۔رابعہ افضال کی تحریر تو ویسے بھی میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔کیتی آراء کے افسانے اور سندیسے دونوں ہی اچھے ہوتے ہیں۔پڑھ کے مزہ آتا ہے۔ثناء کنول کیسی ہو ڈیئر؟ دیکھو لڑکی دنیا میں اور بھی لوگ ہیں یاسین کے سوا۔ہاہاہا۔صبا لکھو ایک کہانی تمہارے سندیسے کی طرح تمہاری کہانی بھی پیاری ہوگی۔صالحہ آپی کے کیا کہنے منفرد ٹاپک کے ساتھ نمودار ہوتی ہیں اور ٹھاہ کر کے چھا جاتی ہیں۔ویسے بھی آپ میرے میاں جانی کی ہم نام ہیں تو اور بھی اچھی لگتی ہیں۔ہاں جی کس نے کہا کہ ٹیچر سخت مزاج

دوستوں کے نام پیغام

میرے پیارے ابو جان کے لیے

میرے پیارے ابو جی! آپ کو عمرے کی سعادت بہت بہت مبارک ہو۔ میں بہت بہت خوش ہوں کہ میرے پیارے سوہنے رب نے میرے محترم جان سے عزیز ابو جی کو یہ نیک سعادت بخشی۔ سوچ کر ہی اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ پاک سرزمین پر میرے پیارے ابو جی کعبہ شریف کی زیارت کریں گے۔ مدینہ منورہ میں قیام کریں گے۔ جن گلیوں میں کوچوں میں میرے پیارے نبی کریمؐ گزرا کرتے تھے۔ میرے ابو جی ان کی گلیوں میں آنا جانا کریں گے۔ میری طرف سے فضا کی طرف سے (رضوان جی)، گھر والوں کی طرف سے ردا کی طرف سے میرے پیارے ابو جی ڈھیر ساری نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ بخیر و عافیت جائیں اور آئیں، آمین ثم آمین۔

ریمانور رضوان۔ کراچی

ڈیئر ہسبینڈ جی کے نام

بہاروں اور پھولوں کی طرح مسکراتے رہو۔ جھرنوں و آبشار کی طرح کھلکھلاتے رہو۔ میرے پیارے ہمسفر جی (محمد رضوان جی) تمہیں تمہاری سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔ 21 اپریل۔ ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ میرے دل میں لاکھوں نہیں، کروڑوں نہیں، بے حد بے شمار، ان گنت دعائیں ہیں اللہ رب العزت ہر سال تمہیں یہ دن دیکھنا نصیب کرے اور بہت بہت ساری خوشیاں نصیب کرے، آمین۔

خوشی کا دن مبارک ہو
صبح جس دم میں جاگی ہوں
عجب منظر یہ دیکھا ہے
خوشی کا رقص ہے چار سو
ہواؤں میں بسی ہے خوشبو
درختوں کے ہرے پتے
خوشی سے لہلہاتے ہیں
تو یوں محسوس ہوتا ہے
یہ سب تالی بجاتے ہیں
پرندے چہچہاتے ہیں
یا شاید گنگناتے ہیں
کوئی تو بات ہے ایسی
ہر شے پر ہے یوں مستی
میرے دل میں ہوئی ہلچل
مجھے کچھ یاد آیا ہے
چند سال پہلے جب
اسی دن کے کسی لمحے
جو تم دنیا میں آئے تھے
یہ موسم اور یہ ہوائیں سب
درختوں کے بھی پتے

پرندے اور فضائیں
خوشی سے کہہ رہے ہیں
تمہیں یہ دن مبارک ہو
خوشی کا دن مبارک ہو
''رضوان جی سالگرہ مبارک ہو''

نامعلوم کس کی نظم ہے۔ شکریہ جی جس کی بھی ہے۔ میری طرف سے اور فضا ڈول کی طرف سے پاپا جانی کو ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔

ریما نور رضوان۔ کراچی

دوستوں کے نام

ناکام چاہت دشتِ غربت میں
مفلسوں کا لہو عام بکتا ہے
کسی کا جسم بکتا ہے تو کسی کا نام بکتا ہے
دنیا دے گی کیا تم کو اور تم لو گے کیا اس سے
آمیرا دامن تھام کہ میکدے میں جام بکتا ہے
حرص کے بازاروں میں حوا کی بیٹی کا آنچل
پہلے رات کو بکتا تھا اب سرعام بکتا ہے
امیرِ شہر کے محلات کی بات بھی خوب ہے
فقیرِ شہر کی گود میں آرام بکتا ہے

ایم ۔ جے قریشی۔ ڈی آئی خان

اپنے ہسبینڈ کے نام

میرے لیے اس دنیا میں میرے والدین کے بعد سب سے معتبر اور خوب صورت احساس اور ساتھ آپ ہیں۔ آپ کو آپ کی سالگرہ پر بہت بہت مبارک باد۔ احمد میری زندگی کے سب پل آپ کے نام اور خدا سے دعا ہے کہ خدا آپ کو لمبی عمر اور ایسی ہزاروں سالگرہ کے دن نصیب کرے، آمین۔

میرے ہمدم، میرے دلبر میرے جانم
ہو مبارک تمہیں جنم دن
میرے جذبوں کی پاکیزگی
نئی حیات و چاہت مبارک ہو تمہیں
میری دعا ہے
صدا مہکے تیری چاہت کا گلشن
کامیابی صدا چومے تیرے قدم
صدا تم مسرور رہنا
غموں سے دور بہت دور رہنا
بلندی کو چھو لیں تیری سب صدائیں
جو آئے کبھی تیری آنکھوں میں آنسو
تو سمیٹ لوں گی بڑھ کر دامن میں
میں اپنے
میرے محبوب ہو مبارک ہر گھڑی
کہ کرتی ہوں بس یہ دعا
تیری یہ خوشی یونہی برقرار رہے
زندہ ہمارے دلوں میں
سدا یہ محبت رہے

مسز احمد۔ کراچی

صوبیہ کے نام

مائی لولی ڈول صوبی جانی آپ کو اپنے پیپرز میں کامیابی پر بہت بہت مبارک ہو۔ خدا کرے کہ تم اپنی کامیابیوں کا یہ سلسلہ سدا یونہی جاری رکھو، آمین۔ تمہاری خالہ جانی، نانو، ماموں سب بہت خوش ہیں اپنی لٹل پرنسز کی اس شاندار کامیابی پر کہ تم نے نہ صرف اپنی کلاس میں بلکہ اپنے اسکول میں ٹاپ کیا ہے۔ آئی پراؤڈ آف یو مائی لٹل ڈول لو یو سو مچ۔

صبا سحر۔ ہارون آباد

ایک انا پرست کے نام

پھر یوں ہوا کہ راستے یکجا نہ ہو سکے

وہ بھی انا پرست تھا میں بھی انا پرست

دھنک ناز۔ کراچی

سعدیہ خالد کے نام

میری پیاری اور خوب صورت سی سعدو تم بہت جلد پیا دیس جا رہی ہو وہ بھی سات سمندر پار۔ یعنی یو کے۔ تو ہم سب دوستوں کی طرف سے تمہیں شادی کی ڈھیروں مبارک باد خدا کرے کہ تمہارا یہ نیا سفر خوشیوں اور پھولوں بھرا ہو جتنی پیاری تم ہو اتنا پیارا تمہارا نصیب بھی ہو قدم قدم پر کہکشاں بکھری ہو جن پر تمام زیست تم نزاکت سے چلتی رہو۔ خوش رہو۔ سدا میری پیاری دوست۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

ڈیئر سسٹر ماہ رخ کے نام

تمہاری برتھ ڈے آنے والی ہے سوچا اس بار کچھ اسپیشل طریقے سے تمہیں وش کروں۔ تمہیں 25 کو تمہاری 25 ویں برتھ ڈے بہت بہت مبارک ہو۔ میری دعا ہے یہ سال تمہاری زندگی میں بے شمار خوشیاں لے کر آئے۔ تمہارے دل کی ہر خواہش پوری ہو۔ سدا مسکراتی رہو۔ کوئی غم تمہارے پاس نہ بھٹکے۔ تمام عمر خوشیاں تمہاری منتظر ہوں۔ دائمی خوشیاں جو کبھی ختم نہ ہوں اور یہ نیا سال تمہارے لیے لکی ثابت ہو اور ہر وش پوری ہو، (آمین)۔ اینڈ میں پوری فیملی کو کو میرا سلام۔

عائشہ مری۔ کوئٹہ

بہن انعم خان اور پیاری پیاری دوستوں کے نام

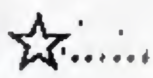
السلام علیکم کیسی ہو آپ سب۔ مجھ کو دیکھ کے حیران ہونے کی ضرورت نہیں دیکھو تم سب کی محبت میں، میں نے بھی آخر قلم تھام ہی لیا (ہا ہا ہا)۔ سب سے پہلے تو انعم یار تم بھی اب کچھ لکھ ہی لو آرام بہت ہو گیا۔ ہاں تو پیاری پیاری دوستوں قرۃ العین سکندر، اقراء سیف، افشاں علی، فاطمہ خان، زینب ندیم، سونیا چوہدری، ریمل آرزو تم سب کو ردا میں پڑھ کے بہت اچھا لگا۔ ایسے ہی لکھتی رہو۔ سب اور میں بھی (ہاہاہا)۔ سیدہ فرزانہ آپ کو شادی کی بہت بہت مبارک باد۔ گیتی آراء آپ کا نام بہت پیارا ہے۔ خوش رہیں۔ دھنک ناز آپ کا نام بھی بہت پیارا ہے۔ آخر میں شہزادی صاحبہ کے لیے بہت سارا پیار ہمیشہ ہنستی مسکراتی رہو۔ مہوش آپ سب کی دوست معصوم سی کڑی یعنی کے میں اب اجازت چاہتی ہوں۔ بائے بائے۔

کنول خان۔ ہری پور ہزارہ

شازیہ آپی اور نائیلہ آپی کے نام

پیاری سی شازیہ آپی آپ کے ناولز مجھے بہت پسند ہیں جن میں رشتوں کی خوب صورت نوک جھونک دل کو لبھاتی ہے وہیں کہیں پیار کی چاشنی محبت پر یقین بڑھاتی ہے۔ مجھے آپ کا انداز تحریر بہت پسند ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ نائیلہ آپی آپ کا پہلا ناول بہت کمال تھا شیث اور سارا مجھے آج تک یاد ہے اپنے خوب صورت مکالموں اور جذبات کی شدت کی وجہ سے۔ خرمن اور عارش بھی اچھے تھے مگر شیث اور سارا تو کمال تھے۔ آپی آپ کی تحریر کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جو ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ بہت سی دعائیں اور پیار آپ کے لیے۔ آپ کا قلمی سفر یونہی جاری و ساری رہے اور آپ ہمارے لیے یونہی لکھتی رہیں۔

صبا سحر۔ ہارون آباد





ریشمی بریانی

اجزاء

مرغی کا گوشت	: ڈیڑھ کلو
چاول (اُبلے ہوئے)	: ڈھائی پیالی
پسا ہوا لہسن ادرک	: ایک کھانے کا چمچہ
دہی	: ایک پیالی
ہری مرچیں (کچل لیں)	: آٹھ عدد
کٹی ہوئی کالی مرچ	: ایک چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	: چار کھانے کے چمچے
تازہ کریم	: آدھا کلو
پیاز (باریک کٹی ہوئی)	: تین عدد
تازہ دودھ	: ایک پیالی
زردے کا رنگ	: ایک چٹکی
پودینہ	: آدھی گڈی (سجانے کے لیے)
نمک	: حسب ذائقہ
تیل	: ایک پیالی
مکھن	: ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب: دیگچی میں مرغی کا گوشت، لہسن، ادرک، پودینہ، ہری مرچیں، دہی اور نمک ملا کر مرغی کا پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ اس میں کالی مرچ اور لیموں کا رس ملا کر چولہا بند کردیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں اور پیاز تل کر نکالیں۔ اسے کاغذ پر پھیلا کر خستہ کرلیں، پھر ہاتھ سے چورہ کرلیں۔ گرم تیل کو مرغی پر ڈال دیں، تیل ٹھنڈا ہو جائے تو کریم ملالیں۔ ایک کھلے منہ کی دیگچی میں آدھا کلو چاول، مرغی آدھا کلو، پیاز اور باقی چاول کی تہہ لگا دیں دودھ میں زردے کا رنگ ملا کر چاولوں پر ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔ مزیدار بریانی باقی پیاز اور پودینے سے سجا کر پیش کریں۔

سبزی اور لہسن والی مرغی

اجزاء

مرغی کی بوٹیاں (بغیر ہڈی)	: تین سو گرام
شملہ مرچ	: ایک عدد
گاجر	: ایک عدد
ہری پیاز	: دو عدد
پانی	: ایک پیالی
بند گوبھی	: تھوڑی سی
ہری مرچیں	: چار عدد
ہرا دھنیا	: پون گڈی
لہسن	: بارہ جوے
کٹی ہوئی کالی مرچ	: ایک کھانے کا چمچہ
وارچسٹر شائر ساس	: دو کھانے کے چمچے
کارن فلور (پانی میں گھلا ہوا)	: دو کھانے کے چمچے
چلی گارلک ساس	: چار کھانے کے چمچے

نمک : حسب ذائقہ

تیل : چار کھانے کے چمچے

ترکیب: مرغی، شملہ مرچ، گاجر، ہری پیاز، گوبھی، ہری مرچوں، ہرے دھنیے اور لہسن کو چھوٹا، چھوٹا کاٹ لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے لہسن سنہری کریں۔ اس میں مرغی ملا کر پانچ منٹ تک پکا کر تمام سبزیاں شامل کر دیں۔ مزید پانچ منٹ پکانے کے بعد کالی مرچ، وارچسٹر شائر ساس، چلی گارلک ساس، پانی اور نمک ملا لیں۔ پانی ابلنے لگے تو چمچہ چلاتے ہوئے کارن فلور ملائیں اور آنچ تیز کر کے اسے پانچ منٹ تک بھونیں اور ڈش میں نکال لیں۔

مچھلی کے اچاری تکے

اجزاء

راہو مچھلی کے ٹکڑے (دھلے ہوئے) : آدھا کلو

لیموں : چار عدد

پسی ہوئی ہلدی : ایک چائے کا چمچہ

بھنا اور پسا ہوا سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچہ

کٹی ہوئی لال مرچ : ایک کھانے کا چمچہ

تکہ مصالحہ (پیکٹ والا) : دو کھانے کے چمچے

سفید سرکہ : دو کھانے کے چمچے

نمک : حسب ذائقہ

تیل : تلنے کے لیے

لیموں کے قتلے، ہرا دھنیا : سجانے کے لیے

ترکیب: مچھلی میں مصالحہ ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ گرل پین یا فرائنگ پین میں تھوڑا سا تیل گرم کر کے مچھلی کے ٹکڑے اس پر دونوں جانب سے سنہری سینک لیں اور درمیان میں تھوڑا تھوڑا تیل لگاتے جائیں۔ انہیں سرونگ ڈش میں نکال لیں، اسے دھنیے اور لیموں کے قتلوں سے سجا کر پیش کریں۔

دم والے کباب

اجزاء

گائے کا قیمہ : آدھا کلو

پیسا ہوا لہسن ادرک : دو کھانے کے چمچے

کٹی ہوئی لال مرچ : ایک چائے کا چمچہ

پیسا ہوا گرم مصالحہ : ایک چائے کا چمچہ

کچری پاؤڈر : دو چائے کے چمچے

کٹا ہوا سفید زیرہ : ایک چائے کا چمچہ

انڈہ : ایک عدد

پیاز (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد

پیاز (لچھے کٹے ہوئے) : ایک عدد

ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی) : چھ عدد

ہرا دھنیا : پون گڈی (چھڑکنے کے لیے

سوکھی لمبی لال مرچیں (بیچ سے کٹی ہوئی) : چھ عدد

نمک : حسب ذائقہ

تیل : دو کھانے کے چمچے

ترکیب: چوپر میں قیمہ، لہسن ادرک، لال مرچ، گرم مصالحہ، کچری، زیرہ، انڈہ، باریک کٹی پیاز، ہری مرچیں، ہرا دھنیا اور نمک ملا کر یکجان کر لیں۔ اس آمیزے کے لمبوترے یا گول کباب بنا لیں۔ دیگچی میں ایک پیالی پانی ابال لیں، اس میں کباب رکھیں اور ہلکی آنچ پر ڈھکن ڈھانک کر پکائیں۔ ساس پین میں تیل گرم کریں، اس میں لچھے دار پیاز اور لال مرچیں ڈھک کر تلیں۔ اس پر

کباب رکھیں اور ڈھکن ڈھک کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار کبابوں پر ہرا دھنیا چھڑکیں اور گرما گرم پیش کریں۔

ترئی چنے کی دال

اجزاء

ترئی : آدھا کلو
چنے کی دال (ابلی ہوئی) : ایک پیالی
پیاز (باریک کٹی ہوئی) : دو عدد
سونف : ایک چائے کا چمچہ
کلونجی : ایک چائے کا چمچہ
پسی ہوئی ہلدی : ایک چائے کا چمچہ
سوکھی گول لال مرچیں : آٹھ عدد
سوکھی ہوئی کھٹائی : چار عدد
ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا) : آدھی گڈی
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی) : چار عدد
نمک : حسب ذائقہ
تیل : آدھی پیالی

ترکیب: ترئی چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کریں اور پیاز تل کر نکال لیں۔ اسی دیگچی میں ترئی، ہلدی اور نمک ملا کر بھونیں۔ اس میں دال، لال مرچیں، سونف، کلونجی اور کھٹائی ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ مزیدار ترئی میں ہرا دھنیا، ہری مرچیں اور تلی ہوئی پیاز ملا کر پیش کریں۔

کباب بریانی

اجزاء

گائے کا قیمہ : آدھا کلو
پسا ہوا گرم مصالحہ سفید زیرہ : ایک، ایک چائے کا چمچہ
پسا ہوا لہسن ادرک : ایک کھانے کا چمچہ
پیاز (پسی ہوئی) : ایک عدد
پیاز (تلی ہوئی) : دو کھانے کے چمچے
خشخاش، بھنے ہوئے چنے : دو دو چائے کے چمچے
پسی ہوئی لال مرچ، نمک : ایک، ایک چائے کا چمچہ
چاول (ابلے ہوئے) : آدھا کلو

مصالحے کے اجزاء:

پسا ہوا لہسن ادرک : ایک کھانے کا چمچہ
پسی ہوئی لال مرچ، سفید زیرہ : ڈیڑھ ڈیڑھ چائے کا چمچ
دہی، پیاز (تلی ہوئی) : ایک، ایک پیالی
ناریل کا دودھ، ہرا دھنیا : دو کھانے کے چمچے
جاوتری، جائفل، چھوٹی الائچی (پسی ہوئی) : پون پون چائے کا چمچ
زردے کا رنگ : ایک چٹکی
ہری مرچیں (باریک کٹی ہوئی) : چار عدد
نمک : ایک چائے کا چمچہ
تیل : آدھی پیالی

ترکیب: چوپر میں قیمہ، کچی اور تلی ہوئی پیاز، لہسن ادرک، گرم مصالحہ، زیرہ، خشخاش، چنے، لال مرچ اور نمک ملا کر یکجان کر لیں۔ اس آمیزے کے چھوٹے چھوٹے کباب بنا لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کریں، اس میں پیاز، لہسن ادرک اور تھوڑا سا پانی ملا کر بھونیں۔ مسلسل چمچہ چلاتے ہوئے لال مرچ، دہی، جائفل جاوتری، الائچی، پیاز، دھنیا، ناریل کا دودھ اور نمک ملائیں۔ ابال آنے لگے کباب تہہ کی طرح سے رکھ دیں۔ ایک دیگچی میں پون پیالی پانی، پون پیالی تیل، آدھا کلو چاول، کباب کا مصالحہ، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، باقی چاول، زردے کا رنگ اور کیوڑے کی تہہ لگائیں اور دم پر رکھ دیں۔ اسے احتیاط سے ڈش میں نکالیں اور گرما گرم پیش کریں۔



سنگھار

وزن گھٹایئے خوب صورت نظر آیئے

کس کا دل نہیں چاہتا کہ وہ خوب صورت نظر آئے، لوگوں میں سراہا اور چاہا جائے! یقیناً یہ ایک فطری جذبہ ہے، ہر انسان کی انفرادیت اپنی جگہ مگر بے ڈول اور بھدا جسم کسی کو نہیں بھاتا، نہ بھانا یا ناپسند ہونا بھی اپنی جگہ مگر موٹاپا ہونا تمام بیماریوں اور جسمانی عوارض کی جڑ بھی ہو سکتا ہے تو ایسے لوگ جن کو یہ موضوع بیکار لگے وہ اس کی تفصیلات بس ایک مرتبہ دھیان اور توجہ سے پڑھ لیں، اس میں صرف خوب صورتی کے لیے ہی وزن کم رکھنے کی تاکید اور تراکیب نہیں ہیں بلکہ اپنے آپ کو موذی اور جان لیوا عوارض سے بچنے کی بھی کئی ہدایت نظر آئیں گی۔

20 ایسے سادہ طریقے بتائے ہیں کہ جن سے آپ باآسانی وزن کو کم اور کنٹرول میں لا سکتے ہیں، تو بڑی مستقل مزاجی سے آپ کو اس پر عمل پیرا ہونا پڑے گا تب ہی آپ کامیابی کی بلندیوں کو چھو پائیں گے، ہم میں سے کئی لوگ چاہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ تندرست، صحت مند، چست و توانا رہیں، وہ اس کے لیے بھرپور لگن اور انتھک محنت بھی کرتے ہیں۔ اور اس طرح وہ بہتر زندگی بھی گزارتے ہیں۔ وزن کم کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے یہ ایک سونے کی کان کی مانند ہے، اس میں سے سونا وہی ڈھونڈ پائے گا جس نے اپنی محنت اور قوی توجہ اور جدوجہد سے اس میں مہارت حاصل کی ہوگی۔ آپ جب تک ذہنی طور پر اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے آمادہ نہ ہوں گے جب تک یہ کام آپ کو خوفزدہ اور پریشان کرے گا۔ ایک دفعہ پکے ارادے اور مضبوط عمل سے پابندی سے اس پر کمر کس لی تو یقیناً آپ بھی وزن کم کرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں گے۔ مگر پہلا قدم شرط ہے۔

وزن گھٹانے کے کئی طریقے ہیں۔ آپ پہلے تمام چیزوں اور طریقوں کو صحیح طور سے جانچیں اپنے ڈاکٹر وغیرہ سے رجوع کریں اور پھر اپنے ڈائٹ پلان کے مطابق عمل کرنا شروع کریں۔ سب سے اہم غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے کہ عام سوچ کے مطابق کھانا چھوڑنے سے وزن کم ہونا شروع ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ بالکل غلط ہے کھانا چھوڑنے سے جسم میں کئی طرح کی پیچیدگیاں جنم لے سکتی ہیں، گھی، تیل، مکھن، مارجرین وغیرہ سے بالکل خوفزدہ نہ ہوں، استعمال کریں مگر اعتدال اور توازن کے ساتھ۔ اور قدرتی نعمتوں سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے وزن گھٹائیں اور خوب صورت، تندرست و توانا نظر آئیں۔

☆ کم چکنائی اور کم کیلوری والی غذائیں اپنائیں۔

☆ روٹی اور پاستا کم کر دیں۔

☆ مٹھائی کو ہفتہ میں ایک دفعہ استعمال کریں۔

☆ سوفٹ ڈرنکس کو الوداع کہہ دیں۔

☆ پھل اور سبزی وغیرہ اپنائیں۔

☆ سلاد اور قدرتی اجزاء کی عادت اپنائیں۔

☆ پروٹین سے بھرپور چیزیں استعمال کریں جیسے کہ مچھلی اور مرغی۔

☆ جم وغیرہ جانے کے بجائے ایسی ورزش کا انتخاب کریں جو آپ خود گھر پر اچھے طریقے سے کر پائیں، انہیں اپنی عادات کا حصہ بنالیں۔

سادگی اپنائیں:

آپ کے کھانے جس قدر سادہ اور غذائیت سے بھرپور ہوں گے اتنی ہی جلدی آپ وزن گھٹا سکیں گے۔ اس سے نہ صرف آپ کا قیمتی وقت بچے گا بلکہ آپ مزید چاق و چوبند بھی رہ سکیں گے۔ مثال کے طور پر ہلکے تیل یا بھاپ میں بنی مچھلی، سلاد اور ہلکے پھلکے براؤن رائس کے ساتھ یقیناً ایک صحت بخش غذا ہے۔ دالیں، مکئی، ابلے چاول، مچھلی، مرغی، نوڈلز یقیناً اچھا انتخاب ہو سکتے ہیں، بھنے ہوئے کھانے اور مصالحے کئی بیماریوں کی جڑ ہیں۔ ہمارے دین نے بھی سادگی کا حکم اور تعلیم دی ہے۔

اپنے کھانے پر اپنی بھرپور نظر اور توجہ رکھیں:

آپ کو اپنے اور اپنے کھانے کے لیے ایک مقررہ وقت، مقرر مقدار اور مثبت رویہ اپنانا ہو گا۔ آرام، اطمینان اور توجہ سے کھانا کھانے سے آپ کو شعوری اطمینان اور سکون حاصل ہو گا اور اس طرح وزن کم کرنے میں مدد حاصل ہو گی۔

کھانا چھوڑنے سے گریز کریں:

کبھی یہ غلطی نہ کریں کہ کھانا چھوڑنے سے آپ وزن کم کرنے لگیں۔ یہ سراسر غلط رویہ ہو گا کیونکہ اس طرح آپ زیادہ بھوک لگنے پر زیادہ کھانے لگیں گے۔ اس طرح کرنے سے بہت سے لوگ کم شوگر لیول تک پہنچ کر خطرناک حد تک بیمار ہوتے نظر آئے ہیں۔ اس طرح سے ہم مزید بیمار ہو کر چڑچڑے پن، بدمزاجی اور اکھڑے مزاج کے مریض بن سکتے ہیں۔ لہٰذا اعتدال اور میانہ روی کے ساتھ کھائیں اور خوش باش صحت مند رہیں۔

پانی اور غذائیت سے بھرپور کھانے:

ایسے سوپ اور کھانے جن میں پانی اور شوربہ زیادہ ہوں وہ آپ کو شکم سیری کا بھرپور احساس دیں گے۔ ایسے کھانے جن میں ٹماٹر، یخنی اور کم چکنائی والی مچھلی اور مرغی بھی شامل ہیں۔ یہ کم خرچ اور بالانشین کے مقاصد آپ کو کم کھانے میں بہتر اور مناسب کیلوریز فراہم کرتے ہیں۔ اور بھوک کا احساس ختم کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اپنی پلیٹ کو سبزی اور فروٹ سلاد سے بھرپور بنائیں ان میں زیادہ مقدار میں پانی اور فائبر پایا جاتا ہے جو کہ آپ کو تندرستی بخشتے ہیں۔

جلد کے لیے:

(1)۔ مسور کی دال پیس کر دہی میں ملالیں، اچھی طرح پھینٹ کر چہرے پر لگالیں، سوکھنے پر اتار دیں، جلد چمکدار ہو جائے گی۔

(2)۔ زیتون کا تیل، شہد، ہلدی اور صندل میں ملا کر چہرے پر لگائیں پندرہ منٹ بعد دھولیں یہ عمل خشک اور مرجھائی ہوئی جلد کو تازہ کرتا ہے۔ ☆